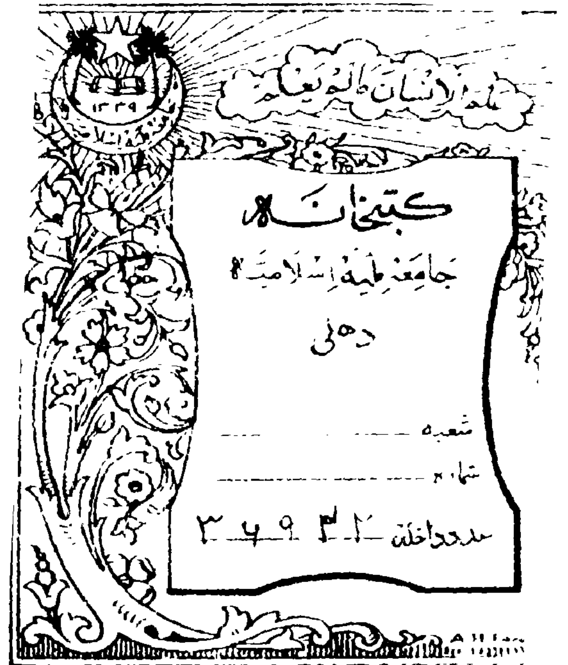
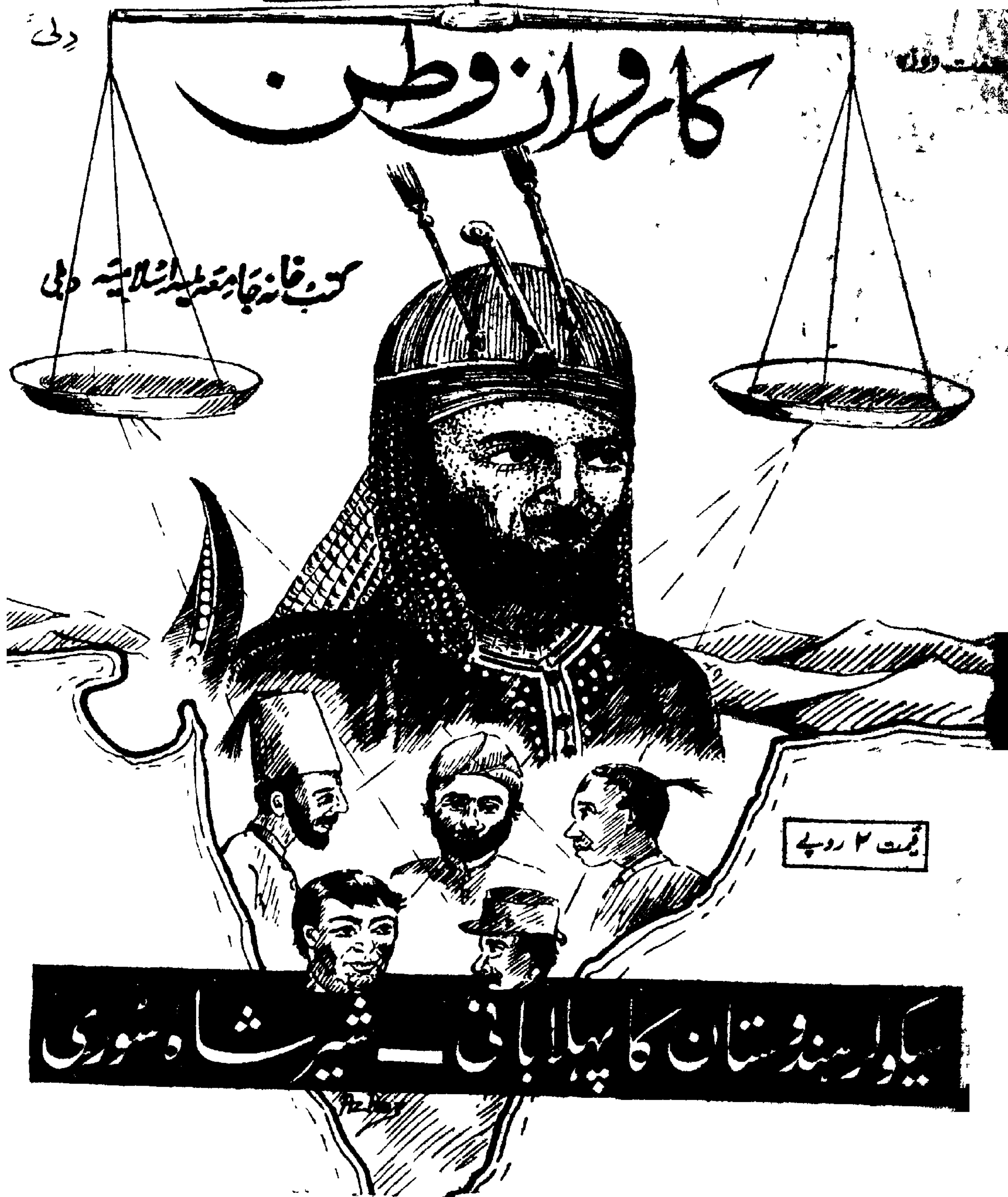

علم الانسان ما لم یعلم
کتب خانہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
شعبہ
شمار
عدد داخلہ ٣٦٩٣١

سالنامہ جمہوریت نمبر





۱۹۵۵ء میں سمرقند
کی
ایک یادگار تصویر
پنڈت جواہر لال نہرو
اور
مسز اندرا گاندھی تیمور
لنگ کے مزار پر۔

بیادِ تاشقند

روشن صدیقی

جناب روشن صدیقی نے بظاہر نور و نکہت کا لباس اختیار کیا ہو۔ لیکن کاش سانحات برصغیر اس نظم کی شانِ نزول نہیں، روشن صدیقی اگرچہ آج خاموش ہیں ان کی خاموشی ایک جہانِ معنی ہے روشن نے "بیادِ تاشقند" میں نئی روشنی قائم کی ہے۔ (کاروانِ وطن)

ایک ہی سال ہوا، وقت کی تاریکی میں
ایک تابندہ و درخشندہ کرن چمکی تھی
یہ وہی دن تھا کہ جب عشق کے ویرانوں میں
شہرِ محبوب سے خوشبوئے بہار آئی تھی

وہ کرن، روشنیٔ مہر و محبت کی امین
جس کو جانِ رگِ خورشیدِ درخشاں کہیے
اور وہ بوئے دل آویز تمنا جس کو
آبروئے نفسِ صبحِ گلستاں کہیے

خونِ دل صرف ہوا جس میں وہ خوشبوئے بہار
سوزِ دل جس میں ضیا بار وہ سرمایۂ نور
لوحِ مشرق پہ ابھرتا ہوا اک نقشِ جمیل
جس کا ہر رنگ ہے آئینِ وفا کا منشور

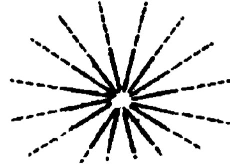
تاشقند! آج بھی شاہد ہے کہ وہ عہدِ وفا
اُنس و اخلاص کا پیغام سناتا ہی رہا
وہ دمکتا ہوا خواب اور مہکتا سا خیال
نور و نکہت کے خزانوں کو لٹاتا ہی رہا!

یہ محبت کے اُجالوں سے ضیا بار کرن
نہ کہیں وحشتِ محالات میں گم ہو جائے
یہ نہ ہو کاش! کہ یہ قافلۂ صبحِ بہار
اپنی راہوں سے بھٹک جائے کہیں کھو جائے

رہ نوردانِ محبت یہ تمہیں یاد رہے
ایک پاکیزہ امانت ہے یہ نور و نکہت
یہ نہ مٹ جائے کہ ہے اس کی بقا سے منسوب
ہند اور پاک کا اک رشتۂ مہر و الفت

دوستو! ظلمتِ اوہام کے طوفانوں میں
عزم و ایقان کی یہ شمع جلائے رکھنا
اپنے ہر سانس کو اے دردشناسانِ حیات
مہر و اخلاص کی خوشبو سے بسائے رکھنا

ڈاکٹر اجمل اجملی



خود فریبی

یوم جمہوریہ کے موقع پر

آج کا دن تو مسرت میں گذر جانے دے
کل سے پھر گردشِ دوراں تری رفتار سہی
آج تو نغمۂ شادی مرے لب پر بکھرے
کل سے پھر ماتمِ تقدیر گراں بار سہی!
آج ہی بس کسی یوسف کو نہ بکنے کا ڈر
کل سے پھر میرا وطن مصر کا بازار سہی
آج ہی بس تری زلفوں میں ذرا دم لے لوں
کل سے ہاں پھر وہی راہِ رسن و دار سہی
آج تو محتسبو! شوق سے پی لینے دو!
کل سے پھر بادہ کشی ننگ سہی عار سہی
رقص اک پل، کسی پائل کی صدا پر کر لوں
کل سے ہاں پھر وہی زنجیر کی جھنکار سہی
آج کے دن تو ذرا مجھ کو بہک لینے دو
رسمِ دیرینہ پہ یارو! تمہیں اصرار سہی

تلخیٔ زیست سے کہدو! مری جانب نہ بڑھے
آج میں خلدِ تخیل میں چلا آیا ہوں!
مجھ پہ لپکیں نہ سلاسل، مرے دیرینہ رفیق
آج میں سایۂ سنبل میں چلا آیا ہوں
دل کا آتش کدہ کچھ دیر ذرا سرد رہے
آج میں انجمنِ گل میں چلا آیا ہوں!

فاقہ تو روز کا معمول ہے غربت کی قسم
ہاں بہ تقریبِ سخن آج یہ دعوت بھی سہی
میری تقدیر تو وابستۂ غم ہے، لیکن!
آج اک بزمِ طرب زار میں شرکت بھی سہی

آنسوؤ! تم مری پلکوں پہ نہ آنا ہرگز!
بزم میں ہنسنے کا دستور ہے معلوم نہیں!
مندمل زخمو! میں ہنستا ہوں ذرا تم بھی ہنسو
یومِ آزادیٔ جمہور ہے معلوم نہیں!

آج کا دن ہی مسرت میں گذر جائے اگر
میں سمجھوں گا کہ "بیمار کا حال اچھا ہے"
اس مسرت کی حقیقت مجھے معلوم مگر
"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"

غم و آلام کے مارے ہوئے انسانوں کو
ایک لمحہ بھی مسرت کا جو مل جائے بہت
باغبانوں کی خزاں بستہ نحوست کے تلے
ایک غنچہ بھی اگر جھوم کے کھل جائے بہت

سینکڑوں چاک گریباں میں ہیں لیکن یارو!
ایک ہی چاک گریباں کا جو سل جائے بہت

عوامی فرمانروا شیر شاہ سوری



شیر شاہ سوری کے والد محترم سور افغانستان سے ہندوستان آئے۔ فرید خان (شیر شاہ) ۱۴۷۲ء میں ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ "عظیم نامہ" میں جو شیر شاہ سوری کی سوانح عمری ہے، لکھا ہے کہ

ہندوستان آنے کی غرض یہ تھی، کہ لودھی فرمانرواؤں کو فوج اور امور مملکت کے بارے میں صحیح مشورے دیئے جائیں۔ حسن خان سور کو ایک سیاح نے جس کا نام حشمت خان تھا، صلاح دی تھی کہ ہندوستان جاؤ جہاں سلطنت دلی کو مشیروں کی ضرورت ہے۔ حشمت خاں نے دلی میں دیکھا تھا کہ لودھی خاندان کے فرمانروا گمراہ ہو رہے ہیں۔"

علاقہ سور کی خصوصیات عظیم نامہ میں یہ لکھی ہیں کہ "اس علاقہ نے سپاہی، دانشور اور درویش پیدا کئے۔ خود حسن خاں سور کے آباؤ اجداد قندھار، ہرات اور کابل کے مقتدر خاندانوں کے پیر و مرشد اور فوجوں کے سردار تھے۔"

شیر شاہ کو ان کے والد نے علوم و فنون کی تعلیم دی۔ اس زمانہ کے سپہ سالار، فنون سپہ گری میں ان کی مہارت دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ حسن خاں سور اور فرید خاں نے جونپور، اور سہسرام کو اپنا مسکن یوں قرار دیا کہ جنگ پانی پت میں شکست کے بعد پٹھانوں نے جونپور اور سہسرام کی پہاڑیوں میں پناہ لی تھی۔ ان کی جاگیریں بھی ان ہی علاقوں میں تھیں جو انہیں افغان سلاطین نے دی تھیں۔

شیر شاہ اور ہمایوں کی جنگ کے بارے میں مورخین نے بے تکی قیاس آرائیاں کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شہنشاہ بابر کو اگر یہ حق حاصل تھا کہ وہ ابراہیم لودھی پر حملہ کرتا اور اسے شکست دیتا، تو شیر شاہ کو بھی پورا حق حاصل تھا کہ وہ ہمایوں سے بادشاہت چھینتا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس دور میں مغلوں اور پٹھانوں میں جو کشمکش ہوئی اس پر مفصل گفتگو کی جائے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پٹھانوں کو مغلوں نے جس بری طرح مغلوب کیا اور ستایا، اس کا ردعمل یہ تھا کہ شیر شاہ سوری نے ہمایوں کا مقابلہ کیا اور شکست دی۔ آج اگر امریکہ، ویت نام میں جنگ کر سکتا ہے تو ہمایوں اور شیر شاہ کی جنگ پر بے مزہ ہونے کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔

'عظیم نامہ' میں شیر شاہ اور ہمایوں کی کشمکش پر صرف چند فقرے ملتے ہیں۔ فرماتے ہیں،

"بابر اگر سلطنت قائم کر سکتا تھا، تو شیر شاہ کیوں سلطنت قائم نہ کرتے، وہ زیادہ قابل اور ممتاز شخص تھے۔ عادل تھے، اور لہو و لعب سے ان کا کچھ واسطہ نہ تھا۔"

جس سرزمین نے زمانہ قدیم میں بھی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی نالندہ کا تصور دیا۔ جہاں اشوک اعظم کو پاٹلی پتر نام کا دارالسلطنت ملا۔ جو مہاتما بدھ کا جنم استھان ہے جہاں مہاویر جین پیدا ہوئے اور جو سیتا جی کا میکہ ہے جس کی خاک نے بودھ گیا اور راج گیر کو تقدس دیا۔ جہاں حضرت مخدوم بہاری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت یحییٰ منیری اور شہباز نہدی ایسے اولیاء اللہ نے معرفت حق کا درس دیا، اسی سرزمین نے ہندوستان کو ایک عوامی شہنشاہ شیر شاہ سوری نام کا ایک سپاہی دیا۔

شیر شاہ سوری نے عوامی فرمانروائی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اس دور میں جب شہنشاہیت ہی کا ایک تصور باقی رہ گیا تھا۔ جب سلطنت کے ذرائع و وسائل شاہی تزک و احتشام اور شان و شوکت کے لئے مخصوص سمجھے جاتے تھے اور جہاں عوامی فلاح اور خوش حالی کا بہت کم سوال اٹھتا تھا۔

ایک عظیم سوشل اور عوامی ریاست کے قیام کا اگرچہ دست قدرت نے شیر شاہ کو پورا موقع نہیں دیا۔ پھر بھی شہنشاہیت کے اس دور میں بھی اس عظیم عوامی فرمانروا کے ہاتھوں ایک فلاحی اسٹیٹ کے طرز کی حکومت کی داغ بیل پڑی۔ شیر شاہ کالنجر میں اسلحہ خانہ کے حادثہ کے شکار نہ ہوئے ہوتے تو ایک عوامی سوشل ریاست ان کے زمانہ میں پروان چڑھتی اور برطانوی سیاستدانوں کو اس فخر کا موقع نہ ملتا کہ عوامی مفاد کی بنیاد پر قائم ہونے والی ریاست کا تصور دینے والے صرف برطانوی مفکرین ہیں۔ نہ سوشلزم کے علمبردار ہی یہ کہہ سکتے تھے کہ عوامی سوشل اسٹیٹ کا تصور صرف کمیونزم کا عطیہ ہے۔

شیر شاہ نے اگرچہ ہندوستان کی قومی فرمانروائی کی تاریخ میں صرف ۵ سال کی مدت میں حکومت کی۔ پھر بھی اس تھوڑی مدت میں انہوں نے

ایک مثالی سلطنت کی داغ بیل ڈالی اور عوامی فرمانروائی تاریخ میں پہل کی۔

شاہی محلوں، قلعوں، شیش محل، حمام خانوں کی تعمیر کی جگہ اس فرمانروا نے عوامی مفاد کے لئے خلیج بنگال سے سرحد تک دو ہزار میل لمبی وسیع و عریض قومی شاہراہ کی تعمیر کرائی جو آج بھی مواصلات اور نقل و حرکت کے لئے ایک مثالی رابطہ کا کام دے رہی ہے جسے ہم آج گرینڈ ٹرنک روڈ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ قومی شاہراہوں کی تعمیر کی تاریخ میں یہ پہلی مثالی شاہراہ کہی جاسکتی ہے جو مشرق سے مغرب تک سب سے لمبی ہوئے عوام کے لئے تعمیر کرائی گئی ہے۔

شیرشاہ نے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی عظیم سیکولر ریاست کی ابتدا کی اور بلا امتیاز مذہب و ملت عوام کے مفاد میں اپنی چھوڑی ہوئی یادگار جی ٹی روڈ پر مسجد، مندر، سرائے، مسافر خانے، لنگر خانے، تالاب بنوائے اور جگہ جگہ کنوئیں کھدوائے۔ شاہراہ کے دونوں جانب سایہ دار درختوں کی قطاریں شیر شاہ کی یاد آج بھی تازہ کرتی ہیں۔ مورخین کو حیرت ہے کہ تھوڑی مدت میں ہر دو میل کے فاصلہ پر سرائیں، ٹھہرنے اور کھانے پینے کا انتظام کیسے ممکن ہوا جبکہ شیر شاہ کو شہنشاہ ہمایوں کا دو بار سامنا بھی کرنا پڑا۔

لعل و زمرد، یشب و عقیق، لولوا و مرجان کی خواب گاہیں اور محلسرا بنانے کے بجائے شیر شاہ نے ملک کا تاریخی سروے کرایا جو اکبر کے زمانہ میں بھی قائم رہا اور لگان اور محصولات کا انتظام کیا کہ عوام کا بوجھ ہلکا ہو، اور شاہی ظالم مخلوق خدا کا خون نہ چوسیں۔ آراضی کا تاریخی سروے ایک بے مثال ریکارڈ ہے جو شیر شاہ نے قائم کیا۔

سیاسی فرمانروائی کی تاریخ نے شاید ہی کسی فرمانروا کو معاف کیا ہو لیکن شیر شاہ کے رول پر بڑے سے بڑا نقاد حرف نہ لا سکا۔ یہی نہیں بلکہ صدیاں گذر جانے کے بعد آج بھی یہ فرمانروا، یونیورسٹیوں، مورخوں اور سیاستدانوں کے لئے ایک غیر معمولی فرمانروا ہے۔ شیر شاہ سوری نے ہندوستان کو جو ایڈمنسٹریشن یا نظام حکومت دیا اس کی مثالیں تاریخ ہند میں کم ہی ملتی ہیں۔

سیکولرازم کا تصور شیر شاہ کے یہاں اتنا نکھرا ہوا ہے کہ آج بھی نہیں نکھرا۔ ایک شاہی فرمان میں کہتے ہیں :-

"میں فرید خان مسلمان ہوں، لیکن میں شیر شاہ ہر مذہب والے کا حاکم اور خادم ہوں۔ میری رعایا میں سے کسی سے مذہب کے سبب بے انصافی ہوئی، تو میں ظالم پر بجلی بن کر گروں گا، اور ظالم کو مٹا دوں گا، یا خود مٹ جاؤں گا یا اپنی سلطنت کو مٹا دوں گا۔"

ایک مندر کی زمین کسی قاضی نے دبا لی تھی، اسے برطرف کر دیا۔ اس کی جائیداد ضبط کر لی، اور قید با مشقت کی سزا دی۔

شیر شاہ سوری نے سماجی فلاح کے لئے جو بڑی یادگار چھوڑی وہ ہے انسداد جرائم۔ جرائم کشی کے معاملہ میں شیر شاہ تیغ برہنہ سمجھے جاتے ہیں۔ مجرموں کو سخت سے سخت سزائیں دینا ان کا کام تھا۔ مشہور ہے کہ کسی سرکاری افسر نے کھیت سے غلہ کاٹ لیا۔ شیر شاہ کو خبر ہوئی، افسر بلایا گیا اس کی ناک چھیدی گئی اور اس میں غلہ لٹکایا گیا اور تمام لشکر میں گشت کرایا گیا۔ شیر شاہ نے افسر و رعایا کے درمیان بہتر تعلقات قائم کرنے پر پورا زور دیا۔ افسروں کو رعایا کا خیال رکھنا تھا لیکن ان پر خود اتنا کنٹرول رکھا کہ وہ رعایا پر ظلم نہ کریں۔

یہی نگرانی اور کنٹرول تھا کہ شیر شاہ کے عہد کا ہندوستان امن و خوشحالی کا ہندوستان کہا جاتا ہے اور عوام حکومت سے مطمئن نظر آتے ہیں۔

شیر شاہ سوری کو ہر عہد میں اہمیت دی گئی۔ آج کے آزاد ہندوستان میں بھی وہ اپنا مقام رکھتے ہیں۔ حکومت اور عوام میں رابطہ کس ڈھنگ کا ہونا چاہیئے۔ افسروں کی طاقت کتنی ہونی چاہیئے۔ خوش حالی اور آسودہ حالی کس طرح لائی جاسکتی ہے، عدل و انصاف کے ترازو میں توازن کس طرح قائم کیا جاتا ہے، کوئی شیر شاہ سے اس دور میں بھی سیکھے جو ترقی کا دور کہلاتا ہے۔

شیر شاہ عربی اور فارسی کے اسکالر بھی تھے۔ انہوں نے اپنی جاگیر کا بہت اچھا انتظام کیا۔ جو ہر اعتبار سے کامیاب تھا....

شیر شاہ نے ہندوستان کے لئے جہاں دو ہزار لمبی قومی شاہ راہ چھوڑی وہاں پرانے قلعہ (دلّی) میں ایک یادگار مسجد روہتاس گڑھ میں قلعہ اور رکلات) میں قیام گاہ بھی چھوڑی۔ ہندوستان کے کئی حصوں میں مسجدیں اور مندر آج بھی شیر شاہ کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ شیر شاہی کنوئیں تالاب اور سرائیں گرچہ انقلابات زمانہ کے ہاتھوں مٹ چکے لیکن ان کے آثار اب بھی شیر شاہی دور پر روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ عوامی فرمانروا سہسرام کے مقبرہ میں مدفون ہے جو ایک وسیع مربع تالاب کے بیچ واقع ہے۔ اور اپنے طرز کی واحد تعمیر ہے۔

اس عوامی فرمانروا نے تاریخ ہند میں پہلی بار جمہور کی اصطلاحوں میں سوچا، ہندوستان کو ایسے نظام حکومت دیا جو پندرہویں اور سولہویں صدی تک بے مثال تھا، اور آج بیسویں صدی بھی قابل تقلید ہے، اس نے ہندو مسلم کی تمیز مٹائی، ایک سیکولر اسٹیٹ قائم کیا، اور ایک طرف اگر اپنی اولاد اور خاندان والوں کو عبرتناک سزائیں اور عدل و انصاف کا حق ادا کیا، تو دوسری طرف باغیوں اور شرپسندوں کا بھی بلا امتیاز مذہب و ملت کا حقہ، استیصال کیا۔

نسلی خصوصیات سے اس دور میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں کمانڈر نبی بخش خاں سوری نے جو رول ادا کیا، اسے حکومت بھول جائے تو بھول جائے، تاریخ رہتی دنیا تک نہیں بھول سکتی، ۱۹۲۰ء کے بعد آزادی وطن کے لئے جو جنگ عظیم ہوئی، اس میں بھی سوریوں کا حصہ ہے اگرچہ وہ گمنام ہیں۔

مختصر یہ کہ شیر شاہ سوری اگر عوامی فرمانروا تھے، تو ان کی نسل آج بھی جمہوری ہندوستان کے لئے کچھ نہ کچھ کر رہی ہے ؎

کس بانکپن سے آج بھی وہ تیز گام ہیں





جمہوریت نمبر

"یومِ جمہوریت" پر ہمیں فخر ہے۔ اس لئے کہ وہ اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے کہ ہم ہندوستانی جمہور کو ایک جمہوری آئین دے سکتے ہیں اور عوام کی اصلاح میں سوچ سکتے ہیں نئے زمانہ کے جمہوری نظام میں سینکڑوں خامیاں ہوں، لیکن ہماری سمجھ نہیں آتا کہ ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر جمہوری نظام سے بہتر نظام کیا ہو سکتا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ کسی ملک میں ڈکٹیٹر شپ یا نیم ڈکٹیٹر شپ قائم ہو یا فوجی حکومت قائم ہو پھر بھی وہ مجبور ہے کہ عوام کے لئے سوچے، عوام کے لئے کام کرے اور عوام کے لئے ہو۔ زمانہ آج مطلق العنان شہنشاہوں یا ملوکیتوں کا نہیں رہا، بلکہ عوام کا ہے، جن میں شعور زندگی ہے۔ جو اپنے نفع و نقصان کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور شاہوں اور شاہنشاہوں کو من مانی کارروائیاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے

اس لئے جمہوریت مثالی طرزِ حکومت ہو یا نہ ہو، وہ بہ حالاتِ موجودہ عملاً بہترین طرزِ حکومت ہے۔ ہمارا جمہوری نظام پارلیمنٹری جمہوری نظام ہے۔ اور اس نظام میں سیاسی پارٹیوں کو اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے عملی طور پر بہت بڑا سوال یہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں انتخاباتِ عامہ میں جن امیدواروں کو نامزد کرتی ہیں، وہ کس حد تک عوام کی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں موثر نمائندگی کر سکتے ہیں۔ پچھلے بیس برس میں سیاسی پارٹیوں نے جن امیدواروں کو ٹکٹ دیئے، وہ عموماً بُرے نہیں تھے، مگر انہوں نے یہ سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ وہ اقلیتوں کے بھی نمائندے ہیں۔ اور اقلیتوں کا حال بُرا ہے، انتخابات چونکہ مشترک اور مخلوط ہیں، اور چونکہ بحالاتِ موجودہ ملے جلے یا مخلوط طریقِ انتخاب کو بدلنے کا کوئی امکان نہیں ہے، اس لئے وقت کا بنیادی سوال یہ ہے، کہ سیاسی پارٹیاں جب امیدواروں کو ٹکٹ دیں تو اقلیتیں اپنا نقطۂ نظر کیسے منوائیں اور ایسے امیدواروں کو ٹکٹ دلوانے کا کیا انتظام کریں، جو فرقہ پرست، مفاد پرست، اور صرف ہاں میں ہاں ملانے والے نہ ہوں۔

ہند پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں سے متعلق کئی لابیاں ہیں، امریکہ کی لابی ہے، برطانیہ اور روس کی لابیاں ہیں، سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی لابیاں ہیں، لیکن مسلم لابی کوئی نہیں ہے۔ ان لابیوں کا مقصد یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے ممبروں اور وزیروں سے تبادلۂ خیالات کیا جائے اور انہیں ہم آواز اور ہم خیال بنایا جائے۔

مسلم یونیورسٹی کا معاملہ جب پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تو کوئی مسلم لابی نہیں تھی۔

اس لئے فوراً ضرورت ہے کہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں مسلم لابیاں پیدا کی جائیں۔

بات یہ ہے کہ بحث جمہوریت کے خیر و شر پر نہیں ہونی چاہئے، بلکہ کوشش کرنی چاہئے کہ جمہوریت کا نفاذ اور تعمیل صحیح ہو۔ جمہوریت کے معایب و محاسن پر بحث کر کے ہمیں کچھ نہیں مل سکتا۔ سخت گرفت ان موقعوں پر ہونی چاہئے جہاں جمہوریت کا نفاذ اور تعمیل غلط ہو۔ مثلاً فرقہ دار فسادات ہوتے ہیں، مسلمانوں کو سرکاری نوکریوں میں نظر انداز کیا جاتا ہے، پرسنل لا کے بارے میں غلط نظریات پیش کئے جاتے ہیں، کاروباری اور صنعتی زندگی کے بارے میں مسلمانوں کو اُن کے جائز حقوق سے محروم کیا جاتا ہے، جمہوریت کا نفاذ کرنے والا مقامی، ایڈمنسٹریشن گمراہ یا مجرم ہے، تو مسلمانوں کو پوری قوت سے میدانِ عمل میں آجانا چاہئے، اور بے تامل کہنا چاہئے کہ جمہوریت یا جمہوری نظام تو اصولاً صحیح ہے۔ لیکن اس کا نفاذ اور تعمیل بالکل غیر جمہوری، بالکل جانبدارانہ، بالکل مجرمانہ اور بالکل ناقص ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہے، بلکہ جمہوری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

ہندوستان کے حالات آج ایسے ہیں کہ کسی سیاسی پارٹی سے جو برسرِ اقتدار ہو یا اپوزیشن میں ہو، یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ جمہوریت کے نفاذ اور تعمیل سو فیصدی یا پانچ فیصدی بھی کامیاب ہو سکتی ہے۔ باتیں تو سب ہی پارٹیاں کرتی ہیں۔ لیکن ان کا عمل نہایت ناقص ہے بلکہ سیاست پر سب ہی گفتگو فرماتی ہیں، سب ہی مسلمانوں کی اقتصادی ترقی سے دلچسپی لیتی ہیں۔ لیکن کسی نے آج تک عمل سے ثابت نہیں کیا کہ مسلمانوں کے کلچر، سیاسی، ملی حقوق زبان، اقتصاد معیشت پر جو پیہم ضربیں پڑ رہی ہیں۔ ان کا توڑ کیا ہوگا۔

مسلمانوں کو فیصلہ کن انداز میں کہنا چاہئے کہ جمہوریت ہی نے انہیں حق بخشا ہے کہ وہ اپنی بقا اور نشو و نما کا اہتمام کریں۔ اس مقصد کے لئے مثبت

رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ مایوس ہو کر گھروں میں بیٹھ رہنا، اور محاذِ عمل سے راہِ فرار اختیار کرنا، کوئی طریقِ کار نہیں ہے، بلکہ بزدلی ہے۔ مثبت رویّہ یہ ہے کہ ہم ہندوستانی ہیں۔ ہم فرقہ پرست عناصر کے علی الرغم مسلمان ہیں، مسلمان رہیں گے، جمہوری آئین نے مسلمانوں کی حیثیت سے ہمارے وجود کی نفی نہیں کی بلکہ تصدیق و توثیق کی۔ اس لئے ہم ہندوستانی اور مسلمان کی حیثیت سے اپنی انفرادی وجود کی توانائی کے لئے منظم جدوجہد کریں گے۔

اس لئے یوم جمہوریت اور جمہوریت سے ہماری وابستگی مسلمان کی حیثیت سے ہے۔ ہم جمہوری عزائم کا مخلصانہ خیر مقدم کرتے ہیں اور جب تک جمہوری نظام کا نفاذ ناقص اور جانبدارانہ ہے، ہم اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا عہد باندھتے ہیں ے

زندگی سعیٔ مسلسل سے سنور جاتی ہے۔

خاص نمبر

ہم مغرور نہیں، مسرور ہیں کہ ایک کام ہوا، اور سالنامہ اور جمہوریت نمبر ہم پیش کر سکے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان، مسلمانوں اور قومی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو خاص نمبر میں اختصار کے ساتھ پیش کیا جائے، تاکہ ماضی اور حال کے نقوش ابھر سکیں۔ یہ فیصلہ کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے ہم ناکام ہیں یا کامیاب۔ تاریخ لکھنا آسان ہے، تاریخ کی صحیح تعبیر کرنا مشکل ہے۔ ہم نے اپنے بُرے بھلے مشاہدات کی روشنی میں تاریخ، ادب، آرٹ، فن، قومی زندگی کی صحیح تعبیر اپنے زاویوں سے کی ہے۔ مسئلہ صرف تعبیر کا ہے اس لئے ہماری تنقیص یا تحسین اس اعتبار سے ہونی چاہئے کہ قومی زندگی کی تعبیر میں ہم سے کچھ ہو سکا یا نہ ہو سکا۔ خاص نمبر نکال لینا کوئی بہت بڑا کمال نہیں ہے۔ بلکہ کمال یہ ہے کہ کوئی مقصد، کوئی زاویۂ فکر پیش کیا گیا یا نہیں کیا گیا۔ اور کس انداز سے پیش کیا گیا۔

ہمیں یہ بات محسوس ہو رہی ہے، کہ ہندوستان میں صرف فرقہ وار فسادات نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ تاریخ کے خانوں سے مسلمانوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ خارج کیا جا رہا ہے۔ قومی تاریخ کا جو باب مسلمانوں کے لئے وقف ہونا چاہئے، اس میں وہ کہیں نہیں ملتے۔ کانگریس کی تاریخ لکھی جائے، یا علم و ادب کے تذکرے کئے جائیں، مسلمانوں کے لئے دو چار سطریں ہی لکھی جاتی ہیں۔ حالاں کہ سینہ چاہئے اس تجربے کر اس کے لئے۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی، آزادیٔ کامل کے پہلے علمبردار مولانا حسرت موہانی، کانگریس کی بولائی ہوئی نیا کے کھویا، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، قومی زندگی کے مسیحا حکیم اجمل خاں، یہاں تک کہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور مجاہدِ اعظم حضرت مولانا حسین احمد مدنی کو بالکل فراموش کیا جا رہا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ اُن کے لئے ایک آدھ سطر لکھی جاتی ہے۔

"کاروانِ وطن" کا سالنامہ، اور جمہوریت نمبر اس احسان ناشناسی، اس قدر ناشناسی یا سکوت قدر ناشناس کے خلاف احتجاج ہے۔ اور اس احتجاج پر ہم نادم نہیں ہیں۔ ہمیں اس موضوع پر بہت لکھنا چاہئے تھا، اور کچھ نہ لکھ سکے۔ لیکن اگر ہمارے تجربوں اور مشاہدوں کے کوئی معنی ہیں، تو ہماری حیاتِ مستعار کے جو لمحے باقی رہ گئے ہیں، اس مقصد کے لئے وقف ہوں گے کہ حق دار کو حق ملے، اور مسلمانوں کے عظیم رول کے باب میں انکار اور تردید کا جو مشغلہ جاری ہے ختم ہو۔

ہمیں اعتراف ہے کہ کاروانِ وطن کے سالنامے اور جمہوریت نمبر میں کمیاں ہیں، لیکن ہم سے جو ہو سکا، ہمیں امید ہے کہ اس کی داد ہمیں ضرور ملے گی۔ ے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی

ہم خود بیں اور بر خود غلط نہیں ہیں، لیکن ہمیں اطمینان ہے، کہ ہم سے جو ہو سکتا ہے بے دریغ کرتے ہیں۔ تاج محل شہنشاہ شاہ جہاں ہی بنا سکے۔ ہم تو تنکے بین بین کر آشیانہ بناتے ہیں، اور یہی ایک بے مایہ اور بے بس انسان کا تاج محل ہے۔

قلمی معاونین کا مخلصانہ شکریہ کہ انہوں نے ہماری بروقت مدد فرمائی۔ آمن صاحب، سعید انصاری صاحب، مولانا عثمان فارقلیط، عتیق صدیقی صاحب، مہدی نظمی صاحب، عبداللطیف اعظمی صاحب، عبدالحق اصلاحی صاحب، اور صالحہ عابد حسین صاحبہ کے ہم احسان مند ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر توجہ فرمائی۔

جو دوست ہمارے لئے کچھ نہ کر سکے، اُن کا بھی شکریہ۔ صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین ہمیں دو سطروں سے بھی نواز نہ سکے، ان کا بھی شکریہ۔ "کاروانِ وطن" سب کا نیازمند ہے، اور جو اس کی نیازمندی کو خاطر میں نہیں لاتا، اس سے بھی شکوہ کرنا، ہماری وضع داری کے خلاف ہے۔

نیاز و ناز کے نکتے کبھی تو حل ہوں گے۔

شیخ عبداللہ کا رول

ہندوستان و پاکستان میں دوستی پیدا کرنے کے لئے شیخ عبداللہ ثالث بالخیر کا جو منصب ادا کرنا چاہتے ہیں، وہ برصغیر کی ایک اہم اور مفید خدمت ہے، لیکن ان سے یہ گذارش بے محل نہ ہوگی کہ امریکہ اور روس دونوں اب ہندوستان و پاکستان میں سمجھوتہ کرانے سے زیادہ پاکستان کو چین سے صرف محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے شیخ صاحب امریکہ اور روس کی سیاست سے بے نیاز ہو کر ہندوستان و پاکستان میں کشمیر کے سوال پر مفاہمت کرا سکیں،

یا دونوں ملکوں میں دوستی کے رشتے استوار کرسکیں، تو بہت بڑا کام ہوگا۔

پھر بھی شیخ صاحب کو اپنی تحریروں اور بیانوں میں نہایت محتاط ہونا چاہیئے۔ انہوں نے مثلاً پاکستان اور صدر ایوب کا شکریہ ادا کیا ہے کہ اُن کی رہائی سے انہوں نے دلچسپی لی لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ شیخ صاحب کی رہائی کے لیے صدر ایوب یا پاکستان نے کیا کیا۔ شکریہ ادا کرنا ایک رسمی بات ہے، پھر بھی واقعات کا جہاں تک تعلق ہے، شیخ عبداللہ کی رہائی صدر ایوب کی وجہ سے عمل میں نہیں آئی۔

شیخ صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے، کہ کشمیر ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ اور پاکستان تنازعہ کا ایک فریق ہے۔ اصولاً صورت واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان نے پاکستان کو ایک فریق نہیں سمجھا، مگر عملاً اس سے معاملات ایسے کرتا ہے کہ اس کی پوزیشن ایک فریق کی ہو جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان نزاعی مسائل کو چھیڑنا، تنازعہ کا ذکر کرنا، پاکستان کو ایک فریق کہنا شیخ صاحب کی ثالثی کے لیے مناسب نہیں ہو سکتا یا سازگار فضا پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر شیخ صاحب نے ان مسئلوں پر اصرار فرمایا تو ہندوستان میں ان لوگوں کے ہاتھ کمزور ہوں گے، جو شیخ صاحب کو ہندوستان و پاکستان میں مفاہمت کرانے کے لئے پوری آزادی دینا چاہتے ہیں۔ شیخ صاحب نے اب تک، جو باتیں کہی ہیں، اُن سے پاکستان کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ اور بیچ کے ایک آدمی کے لئے، جو مفاہمت کرانا چاہتا ہو، یہ پوزیشن صحیح نہیں ہے۔ شیخ صاحب نے جو باتیں کہی ہیں ان پر انہیں یقین بھی ہو، یا وہ اُن کا سیاسی عقیدہ بھی ہوں تو اُن کے اعلان میں ابھی محتاط رہنا چاہیئے، اس لیے کہ ہندوستان و پاکستان میں انہیں سمجھوتہ کرانا ہے، اور سمجھوتہ کرانے والے یا ثالث کو بیچ کا آدمی ہونا چاہیئے۔

شیخ صاحب کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان سے مایوس ہونے لگے ہیں، حالاں کہ انہیں پر امید ہونا چاہیئے اور ہندوستان کو اپنا ہمنوا اور ہم خیال بنانا چاہیئے۔

ہندوستان میں اُن کا بہت بڑا کام یہ ہے کہ وہ مختلف سیاسی پارٹیوں کو اپنا نقطۂ نظر سمجھائیں۔ شاید وزیراعظم مسز اندرا گاندھی، اکثر معاملات میں اُن کی تائید کریں گی، لیکن شیخ صاحب کو یہ کام بھی کرنا چاہیئے، کہ کانگرس، کمیونسٹ پارٹیاں، سوشلسٹ پارٹیاں، یہاں تک کہ جن سنگھ پارٹی اُن کے نظریات کی معقولیت کسی حد تک تو تسلیم کرلیں۔ شری راجگوپال آچاریہ اور شری جے پرکاش نارائن اُن کے قدردان ہوں گے۔ لیکن اُن میں بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہے کہ پاکستان مسئلہ کشمیر کا ایک فریق ہے یا کشمیر کے سوال کا کوئی ایسا حل نکل سکتا ہے جو ہندوستانی آئین کی حدود میں نہ ہو۔

ہم اس بات سے پریشان نہیں ہیں کہ شیخ عبداللہ استصواب رائے عامہ یا حق خود ارادیت کا نام کیوں لیتے ہیں۔ عقل سلیم باور کرسکتی ہے کہ شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ اپنے محبوب نظریات سے اتنی جلدی باز نہیں آسکتے۔ علاوہ بریں ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ استصواب رائے عامہ کے کئی بدل ذمہ دار حلقوں میں زیر غور ہیں۔ حق خود ارادیت کا معاملہ بھی کوئی پریشان کن معاملہ نہیں ہے، آخر یہ حق خود ارادیت ہی تھا جس نے شیخ عبداللہ کو ہندوستان سے الحاق پر آمادہ کیا، اور یہ بھی حق خود ارادیت ہی ہے کہ کوئی ریاست یا کوئی صوبہ صوبجاتی خود مختاری پر قانع ہو جائے۔ فیڈرل نظام یا وفاقی نظام کی یہ اساس ہے کہ ہر یونٹ یا تمام اجزاء وفاق، حق خود ارادیت کی بنا پر فیڈریشن سے رضاکارانہ الحاق کرتے ہیں۔

لیکن جو بات ہمیں پریشان کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ شیخ صاحب علانیہ ایسی پوزیشن اختیار کریں جو پاکستان یا ہندوستان کے موقف کو مضبوط کرتی ہو کم سے کم ہندوستان و پاکستان میں سمجھوتہ کرانے کے لئے یہ رخ سیدھا نہیں ہو سکتا۔

مقامات نازک ہیں۔
راہ میں لاکھوں کانٹے ہیں۔
دیدۂ بینا دیکھ کے چل۔

پنڈت سندر لال کی تحقیق

انگریزی زبان کے ہفتہ وار اخبار "ریڈینس" (مورخہ ۱۴ جنوری) میں پنڈت سندر لال کا ایک مضمون چھپا ہے۔ پنڈت جی نے فرمایا ہے کہ:

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا انگریزوں نے جب انتقام لینا چاہا، تو عظیم الشان جامع مسجد (دلی) کو ایک ہندو کے ہاتھوں ڈھائی سو روپئے میں نیلام کر دیا جب ہلچل ختم ہوئی تو نیلام لینے والے ہندو نے مسجد مسلمانوں کے حوالہ کر دی اور اُن سے کچھ نہ لیا۔" پہلی بات تو یہ ہے کہ اس عظیم ہندو کا جس نے ڈھائی سو روپے میں جامع مسجد خریدی، ہمیں نام معلوم ہونا چاہیئے تاکہ سیکولر ہندوستان میں اس کی ایک عظیم یادگار قائم کی جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پنڈت سندر لال کو مفصل واقعات پیش کرنے چاہئیں تاکہ عوام کو معلوم ہو کہ جامع مسجد ڈھائی سو روپے میں نیلام کی گئی، ایک ہندو نے مسجد خریدی، پھر مسلمانوں کو مفت واپس کر دی۔

تاریخی واقعات اتنی سادگی سے بیان نہیں کیے جاتے، ہفتہ وار ریڈینس کے ذمہ داروں کو بھی پنڈت سندر لال سے معلوم کرنا چاہیئے تھا کہ واقعہ کی

حکومت پر بھی عائد ہوتا ہے۔ ۱۰ رمعاصر غالباً الزام نہیں دینا چاہتا لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو میں اچھی کتابیں نہیں چھپیں۔ ساہتیہ اکیڈمی، نیشنل بک ٹرسٹ، انجمن ترقی اردو نے ایک سے ایک اعلیٰ کتاب اردو میں شائع کی جنہیں کسی زبان کی معیاری کتابوں کے مقابلے پہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ انفرادی طور پر اردو زبان کے کئی مصنفین مترجمین ایسے ہیں جن کی ادبی وعلمی تخلیقات کے اونچے معیار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ناولوں کی لمبی فہرست تو کیا پیش کی جائے۔ لیکن ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر یوسف حسین، جناب عتیق صدیقی کی تصنیفات کے بارے میں معاصر کی کیا رائے ہے۔ ان مصنفین کو غالباً معاصر جانتا ہے۔ ان کی تصنیفات کے عنوان تک کے بارے میں معاصر کی رائے کچھ ہو ان کے معیاری ہونے سے کسی کو انکار نہیں کیا ہے۔ تحقیق کے بغیر مضمون چھاپ دینا صحیح نہیں ہے۔ پنڈت سندر لال کی ہم قدر کرتے ہیں، ان کے مضمون کا جو جذبہ محرک ہے، اس کی بھی کھلے دل سے ستائش کرتے ہیں، پھر بھی تاریخ کے لئے مستند واقعات کی ضرورت ہوتی ہے۔

اُردو کی کتابیں

دلّی کے ایک ہفتہ وار معاصر نے جس کی وطن پرستی صلہ وستائش سے بالکل بے نیاز ہے، فرمایا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو زبان میں اچھی کتابیں نہیں چھپیں۔ اگر یہ واقعہ ہے بھی تو اس کا الزام سیکولر نظام اور سیکولر نہیں ہو سکتا۔



عسکری شہناز۔ (رامپور)

ایک ہم ہیں کہ جو راضی برضا ہیں کتنے
ورنہ یاں تیری خدائی میں خدا ہیں کتنے

راہ پُرخار ہے بچ بچ کے گذرنے والو
مڑ کے دیکھو تو ادھر آبلہ پا ہیں کتنے

احتیاطاً ہی سرِ راہ بچا لی تھی نظر
اتنی سی بات پہ وہ مجھ سے خفا ہیں کتنے

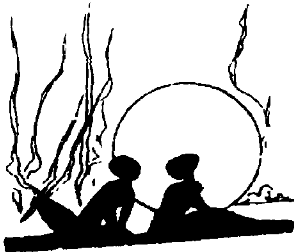
ہم نشیں لذتِ احساس کے ماروں سے پوچھ
اور بھی غم، غمِ دنیا کے سوا ہیں کتنے

تیری یکتائی کا رکھیں گے سرِ دار بھرم
ہم زباں پر بھی نہ لائیں گے خفا ہیں کتنے

بچ کے منجدھار کے طوفان سے آنے والو
موجِ ساحل میں بھی گردابِ بلا ہیں کتنے

کیسے اظہار کروں عظمتِ وحدت کی قسم
ذہن کے آئینہ خانوں میں خدا ہیں کتنے

ہم تو ہر حال میں پابندِ وفا ہیں شہناز
دیکھنا یہ ہے وہ مائل بہ جفا ہیں کتنے



معمارانِ وطن


ہمایوں


بابر


جلال الدین اکبر


جہانگیر


شاہجہاں


حیدر علی

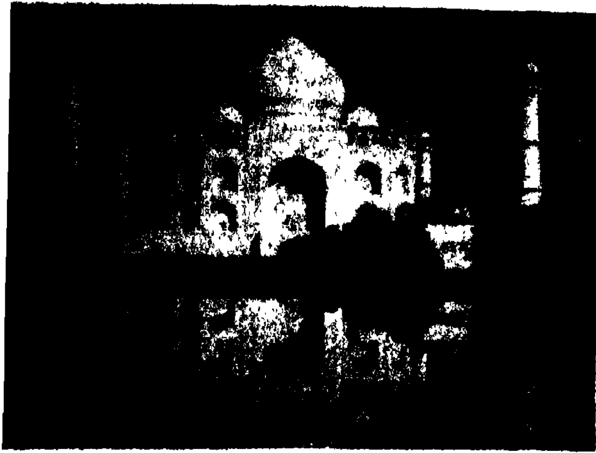

اورنگ زیب


بہادر شاہ


سلطان ٹیپو

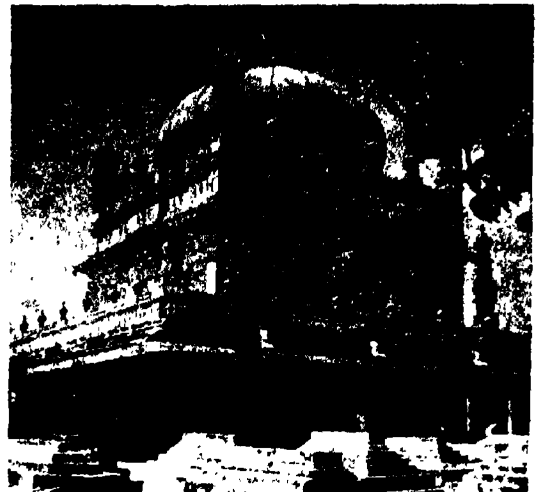


شاہی مسجد جامع مسجد دلی کا دل کش منظر

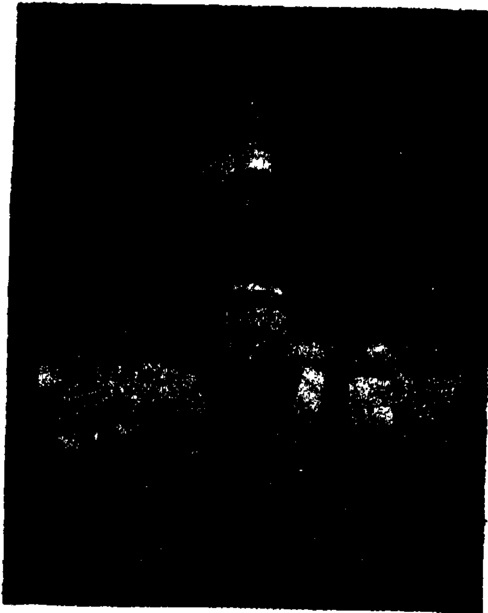


شاہجہاں کا عظیم تعمیر تاج محل

سلطان ٹیپو کی آخری آرام گاہ ـــ سری رنگا پٹم



ہندوستان کا بہترین فن تعمیر کا نمونہ ۔ قطب مینار



ہندوستانی اور اسلامی فن تعمیر کا اختلاط

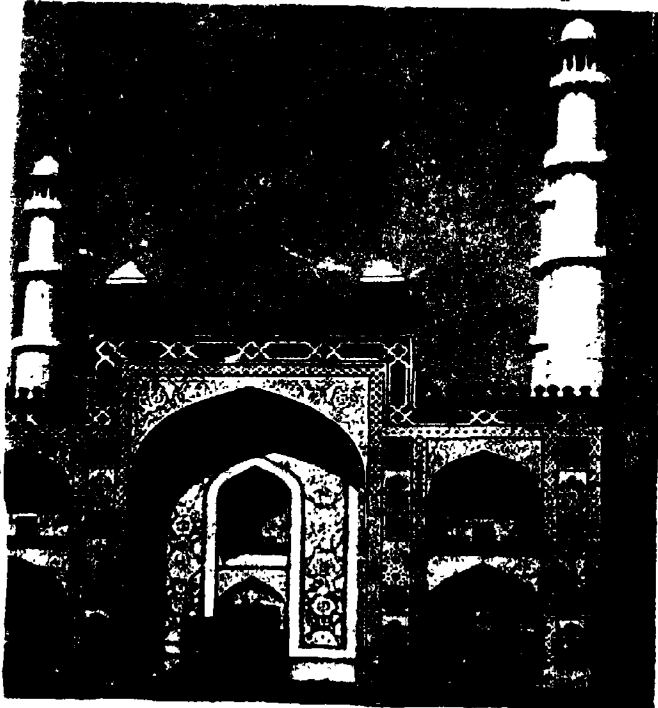
مہدی نظمی

ہندوستان سے عربوں کے تعلقات کا کوئی زمانہ متعین کرنا سہل نہیں ہے، ظہور اسلام سے بہت پہلے سے عرب ہندوستان آتے تھے اور تجارتی مقاصد کے تحت یہاں کے مختلف النوع سماجوں سے اپنا تعلق جوڑتے تھے اس وقت تک ان کی جو بھی تہذیب اور اخلاقی قدریں تھیں اس کا ہندوستانی تہذیب اور اخلاقی قدروں پر کیا اثر پڑا یا انھوں نے ہندوستانی تہذیب اور اخلاقی قدروں سے کیا کچھ سیکھا اس بارہ میں اگرچہ کوئی واضح بات نہیں کہی جاسکتی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تہذیب میں اخلاقی قدروں کا لین دین جاری رہا ہوگا۔

ظہور اسلام کے بعد جب عربوں کے تجارتی قافلے ہندوستان آئے تو وہ اپنے ساتھ ایک ایسا ضابطہ حیات لے کر آئے جو انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہندوستان ورن درستھا میں آئی ہوئی اخلاقی گراوٹوں، ذات پات کی شدت اور چھوت چھات کے مارے ہوئے کروڑوں انسانوں کی ایک ایسی بستی بن چکا تھا جس میں اسلام کی تعلیمات مساوات و اخوت کے لئے بڑی کشش تھی۔ چنانچہ اس دور میں عربوں نے ہندوستان کے لوگوں کو جو تہذیبی قدریں دیں وہ اس حد تک اثر آفریں تھیں کہ جنوبی ہند کا ایک راجہ تک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدا ہو کر آنحضرت کی زیارت کے لئے مدینہ جانے کو تیار ہو گیا اور اس نے سفر بھی کیا لیکن جہاز ڈوب جانے کی بنا پر وہ مدینہ نہیں پہنچ سکا، اس زمانہ میں بہرحال عرب تاجروں نے مالابار میں ایک مسجد بھی تعمیر کی جس کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا، کیونکہ اس وقت تک کعبہ کی سمت سجدہ فرض نہیں ہوا تھا اور بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ تھا، یہ پہلی اسلامی تعمیر تھی جو ہندوستان کی سرزمین پر ہوئی۔

۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کی قیادت میں مسلمانوں کے لشکر نے سندھ کی جانب حملہ کیا اور ان کا یہ حملہ اتنا تیز اور ہمہ گیر تھا کہ ان کے اقتدار کا پرچم کراچی سے لے کر کشمیر کی گھاٹیوں تک لہرانے لگا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنا جو تہذیبی اثر چھوڑا وہ سندھی زبان کے رسم الخط میں آج تک نمایاں ہے، یہ اثر آفرینی بہر طور ہندوستان کے انسانی تمدن اور اس کے ہر شعبہ میں جاری رہی اور کسی زمانہ میں بھی اس کی کارفرمائی ختم نہیں ہوئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے، ایک نئے دور تمدن کا آغاز ہوتا ہے اور پرانے دور کا خاتمہ ہو جاتا ہے، ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا دائرہ اثر جس طرح اور جس تیزی سے وسیع ہوا، شاید دنیا کے کسی ملک میں اس طرح اور اس تیزی سے وسیع نہیں ہوا، مسلمان جب ہندوستان آئے اور انھوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں اس وقت وہ دنیا کے ایک تہائی حصہ کے حکمراں تھے اور انھیں دنیا کی ان سب ہی تہذیبوں کو دیکھنے اور ان کے فنون سے استفادہ کا موقع ملا تھا جو اس وقت انتہائی ممتاز تہذیبیں تھیں، مسلمان ہندوستان آئے تو وہ ایک مخلوط تہذیب اپنے ساتھ لائے ان کے پاس علوم و فنون کا ذخیرہ



تھا اس لئے ہندوستان نے اس کا یہ اثر نہ صرف مذہبی اعتبار سے بلکہ تمدنی و تہذیبی اعتبار سے بھی بہت جلد قبول کیا اور وہ جس مخلوط تہذیب و تمدن کو اپنے ساتھ لائے تھے اس نے ہندوستان کی قدیم تہذیب و تمدن کے اندر اپنا گھر بنا لیا اور اس کے علوم و فنون، ہندوستان کے علوم و فنون سے مل کر یا ہندوستان کے علوم و فنون ان کے علوم و فنون سے ملکر اور زیادہ نکھر گئے

مسلمانوں کے ان اثرات کو، خوبی کے ساتھ عمارتیں ظاہر کرتی ہیں جو مسلمانوں کے عہد میں خود مسلمانوں نے تعمیر کیں یا ہندو راجاؤں نے بنوائیں اس خوبی کے ساتھ کوئی دوسری چیز ظاہر نہیں کرتی۔ ہندو روایتی اعتبار سے تخیل پسند تھے اور مسلمان حقیقت پسند، ان دونوں کے ذہن مختلف تھے فکریت مختلف تھیں عادات و اطوار مختلف تھے۔ لیکن جب یہ دونوں ایک دوسرے سے ملے تو ہندوؤں کی تخیل پسندی اور مسلمانوں کی حقیقت پسندی کے درمیان مفاہمت کی ایک بنیاد نکل ہی آئی دلآویز سمجھوتہ ہوا، یہ دلآویز سمجھوتہ مسلمانوں کی آمد کے بعد بننے والی ہر عمارت میں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی مسجد اپنی تعمیر کے اعتبار سے بالکل سادی سی چیز ہے جبکہ ہندو مندروں میں چونکہ مورتی پوجا ہوا کرتی تھی اس لئے تصویر کشی کے ذریعہ مندروں کے دیوار و در کی آرائش کی جاتی تھی ہندوستان میں جب مسلمان آئے اور انھوں نے اپنی مسجدوں کی تعمیر کی تو مندروں کی تصویر کشی نے ان کے ذہن کو متاثر کیا اور انھوں نے اپنی مسجدوں کی زینت و آرائش مختلف رنگ کے ٹائلوں سے کی اور پلاسٹر میں پھول پتیاں بنانے کا رواج شروع ہوا۔ تصویر کشی چونکہ مسجدوں میں ممکن نہ تھی اس لئے مسلمانوں نے اپنی مساجد کی آرائش قرآن پاک کی آیات سے کی اور قرآن مجید کی آیات، در و دیوار پر اس خوبصورتی سے کندہ کرائی گئیں کہ اس سے مسجدوں کا حسن دوبالا ہوگیا۔ مسجدوں کے علاوہ مسلمان بادشاہوں نے اپنی رہائش کے لئے جو عمارتیں بنوائیں یا قلعے تعمیر کئے ان میں بھی نقاشی اور گلکاری کی گئی، یہ نقاشی و گلکاری دوسرے ملکوں میں بھی مسلمانوں کی تعمیرات میں ملتی ہے لیکن ٹیپو سلطان کے قلعہ اور اس کے محل کے دیوار و در کی مصوری دیکھ کر یہ اندازہ بہت آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ ہندوؤں کے قدیم مندروں کی تصویر کشی ہندوستان کے مسلم حکمرانوں اور ان کی عمارتوں کے معماروں کے ذہن پر اپنا اثر رکھتی تھی اس کے علاوہ "عمارت سازی" کسی فرد کا کام نہیں ہے بلکہ یہ اجتماعی محنت کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں جو عمارتیں مسلمانوں کے عہد میں بنیں ان کے مزدور، معمار اور مہندس صرف مسلمان ہی نہیں تھے بلکہ ان میں ہندو معمار اور مہندس بھی شریک تھے اسی طرح مسلمانوں کے عہد اقتدار میں جو عمارتیں ہندوؤں نے بنوائیں ان میں مسلمان معمار اور مہندس بھی شامل تھے اس لئے ایک مخلوط فن تعمیر نے جنم لیا اور اس طرح دو قوموں کی ذہنی و فکری صلاحیتیں فن تعمیر میں مخلوط ہوئیں اور ان کے اختلاط نے انسانیت کے دو ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک



کردیا۔ اس لئے اس زمانہ کی آفاقی اپیل قدرتی ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کے معمار اور مہندس پتھروں کی عمارتیں بنانے کے عادی تھے وہ پتھر تراش کر عمارتیں بناتے تھے انھیں کسی دوسری چیز سے عمارت بنانے کا نہ تو طریقہ ہی معلوم تھا نہ انھوں نے عمارت سازی کے فن میں کوئی جدت پیدا کی تھی۔ مسلمان آئے تو انھوں نے ہندوستانی معماروں کو پلاسٹر، اور تعمیرات کی دوسری اشیا سے روشناس کرایا اس طرح دو قوموں کے اختلاط سے ہندوستان کے فن تعمیر میں ترقی کا دور شروع ہوا۔

یہ بات تسلیم کی جائے گی کہ ہندو فن تعمیر، محراب اور گنبد سے واقف نہیں تھا۔ مسلمان فن تعمیر میں ان دونوں چیزوں کی خصوصیت تھی ہندو فن تعمیر میں ستون اور مینار خاصی اہمیت رکھتے تھے جب یہ دونوں فن ملے تو محراب و گنبد کے ساتھ ستون اور مینار مل گئے اور ہندوستان کا مخلوط فن تعمیر مکمل ہوگیا۔ مسلمانوں نے محراب سازی، رومیوں کے فن تعمیر سے سیکھی تھی اور اس کی افادیت کو انھوں نے بخوبی سمجھ لیا تھا۔ ہندو فن تعمیر میں پتھر پر پتھر رکھا جاتا تھا اور اس طرح عمارت کو بلند کیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سارا وزن بنیاد پر پڑتا تھا، لیکن مسلمانوں نے محراب کا طریقہ سیکھ کر وزن کو نہ صرف یہ کہ بنیاد پر عبوری طور پر ڈالا بلکہ اسے دوسری طرف بھی منقسم کرایا اس سے عمارت کی مضبوطی میں اضافہ بھی ہوا اور یہ کہ زلزلے وغیرہ کے اثر سے عمارت پر جو اثر پڑ سکتا تھا وہ بھی کم ہوگیا، ہندو فن تعمیر میں عمارتیں آسمان کی طرف سیدھی اٹھتی ہوئی چلی جاتی تھیں لیکن مسلمان فن تعمیر میں یہ عمارتیں پھیلاؤ میں بننے لگیں اور ان کی ظاہری دکھاوٹ اور زیادہ خوبصورت ہوگئی۔

اس اختلاط کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں جو عمارتیں



تعمیر ہوئیں ان میں سے بعض عمارتیں ساری دنیا میں اپنی مخصوص شہرت رکھتی ہیں اس سے دونوں فنون تعمیرات کے اختلاط کی اہمیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی مزدور، معمار اور مہندس بڑے ذہین تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے فن تعمیر کو نہ صرف یہ کہ مقامی فن تعمیر میں خوبصورتی کے ساتھ ہضم کرایا بلکہ مقامی فن تعمیر اور مسلمانوں کے لائے ہوئے مخلوط فن تعمیر سے مل جل کر ایک ایسا فن تعمیر پیدا ہوگیا جو اپنی الگ شان رکھتا ہے۔ قاہرہ، بغداد اور مراکش کی جو عظیم مساجد ہیں وہ تاریخی اعتبار سے خواہ کتنی ہی اہمیت رکھتی ہوں لیکن فن تعمیر کے اعتبار سے دہلی کی جامع مسجد جو شاہجہاں کے عہد میں تعمیر ہوئی، اپنی جگہ ایک نادر روزگار عمارت ہے۔ مسلمانوں نے جو مخلوط فن تعمیر دیا تھا اس میں ہندوستانی معماروں نے جو پتھر تراشنے کی خصوصی مہارت رکھتے تھے اپنے فن تعمیر سے چار چاند لگا دیئے اور تاج محل جیسی عظیم عمارت معرض وجود میں آئی۔ اگر دوسرے ملکوں کی مسلم عہد اقتدار کی عمارتوں سے ان عمارتوں کا موازنہ کیا جائے جو مسلمانوں کے عہد اقتدار میں ہندوستان میں تعمیر ہوئیں تو ہندوستانی معماروں کی ذہانت الگ سے دکھائی دینے لگتی ہے۔

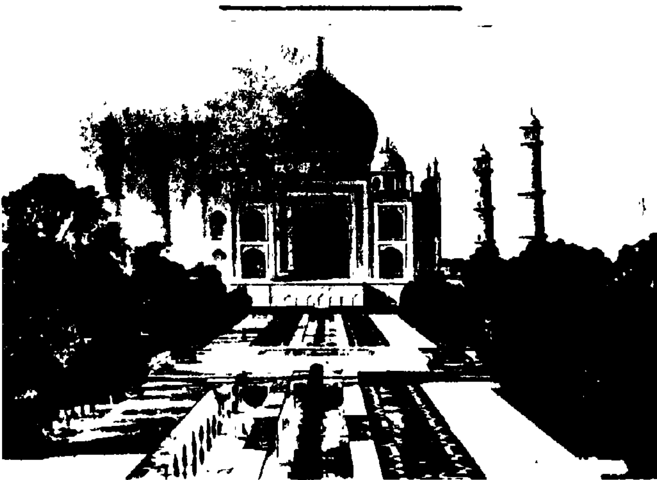
مسلمانوں کے عہد اقتدار میں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں انھیں ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک مذہبی دوسرے غیر مذہبی، مذہبی عمارتوں میں صرف مساجد اور مقابر ہیں لیکن غیر مذہبی عمارتوں میں مختلف النوع اور مختلف المقاصد عمارتیں ہیں۔ مثلاً رہائشی مکانات، باغات اور انکی عمارتیں نیز ان کے گیٹ، قلعے اور پورے پورے شہر۔

مذہبی عمارتوں میں مسجد خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اپنی تمام تر سادگی کے باوجود، مسلمانوں کے عہد اقتدار میں جو مساجد تعمیر ہوئیں وہ اپنے فن تعمیر کے لئے کلیدی اہمیت کی حامل ہیں۔ مسجد کا جو نقشہ مذہباً تھا ظاہر ہے کہ اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا تھا لیکن ہندوستان میں جو مسجدیں تعمیر ہوئیں ان میں پرجوش مسلم حکمرانوں نے گلیریوں دروازوں محرابوں، گنبدوں اور میناروں کے ذریعہ فن تعمیر کے عروج کا مظاہرہ کیا اس جوش و جذبہ کو جو مسلمانوں کے دلوں میں مساجد کی تعمیر کے سلسلے میں قدرتی طور پر موجود تھا دہلی میں قوت اسلام کی ناتمام مسجد کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے جس کا ایک مینار قطب آج تک ساری دنیا کے لوگوں اور فن تعمیر سے دلچسپی رکھنے والے فنکاروں کے لئے باعث کشش ہے۔ اسی طرح اجمیر شریف میں "اڑھائی دن کا جھونپڑا" ہے جو اس جذبہ کی عکاسی کرتا ہے

مقابر کی عمارتیں بھی مقامی اور مسلمانوں کے مخلوط فن تعمیر کی آئینہ دار ہیں۔ مقبرہ ہمایوں کے گنبد نے درحقیقت اسی طرز کے گنبد کا تصور پیدا کیا جو ترقی یافتہ صورت میں تاج محل دکھائی دیتا ہے۔

ہندوستان میں مقامی فن تعمیر سے مسلمانوں کے مخلوط فن تعمیر کے

اختلاط کے درحقیقت تین دور ہیں پہلے دو دور اتنے اہمیت نہیں رکھتے کیونکہ ان دونوں ادوار میں مسلمان ہندوستان کی سرزمین پر اپنے قدم جما رہے تھے اور ان کی سلطنت کی بنیاد مضبوط نہیں ہوئی تھی لیکن تیسرا دور جبکہ مغلیہ سلطنت مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگئی اور مغل شہنشاہوں کو تعمیرات کے لئے موقع ملا تو اپنی نادر روزگار عمارتوں کی بنا پر اس ملک کی تاریخ میں نادر اہمیت حاصل کر گیا۔ شمال میں مغلوں نے اور جنوب میں بیجاپور گولکنڈہ، بنگال میں سہروردیوں اور ملک کے مختلف حصوں میں دوسرے مسلمان حکمرانوں نے اپنے اپنے دور میں اور اپنے اپنے مقام پر شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں اور فن تعمیر نے ترقی پائی۔



ماضی کی تاریخ میں ممتاز خواتین



ممتاز محل



رضیہ سلطانہ



نورجہاں

زینت محل



مسلم لیگ اور مسٹر جناح

اکثریت اور اقلیت یا بالفاظ صحیح تر مذہبی اکثریت اور مذہبی اقلیت کا مسئلہ ہر ملک میں ٹیڑھا ہے۔ خاص طور پر ہندوستان میں بہت زیادہ ٹیڑھا ہے۔ اس لئے کہ اکثریت کو اپنے ماضی اور حال کی اہمیت کا شدید احساس ہے اور مسلم اقلیت بھی یہاں کبھی برسرِ اقتدار تھی، عددی طور پر بھی اس کی اہمیت تھی اس کی ایک عظیم تاریخ تھی اور ہے، اس کی انفرادیت تھی، اس کا ایک مخصوص کلچر تھا۔ افغانوں اور مغلوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو مطابقت کی تھی، وہ انگریزی دور میں قائم نہ رہ سکی، صوبہ بہار کے ایک ضلع میں ۱۹۱۷ء میں ہندو مسلم فساد ہوا، جو تاریخ ہند کا اس وقت تک پہلا ہندو مسلم فساد تھا۔

مسلمان اقلیت میں ضرور تھے، لیکن وہ ایسے خستہ حال تھے اور زیر دست بھی نہیں تھے کہ کسی مشترک سیاسی جماعت یا آل انڈیا نیشنل کانگرس سے اپنی اہمیت نہ منوا سکے۔

لیکن اس اعتراف حقیقت کے باوجود کہ اقلیت کو حفاظتی دیواروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مسلم لیگ قائم نہ ہوتی تو مسلمانوں کا کوئی بہت بڑا نقصان نہ ہوتا۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں سوال لائق افراد کا تھا، اور مسلمانوں میں ان افراد کی کمی نہ تھی۔ جو مسلم مسائل کے لئے کسی مشترک سیاسی جماعت میں جگہ پیدا نہ کر سکے۔ اگر بدرالدین طیب جی اور مسٹر حسن امام کانگرس کی صدارت کر سکتے تھے تو سر آغا خان بھی کانگرس کی صدارت کر سکتے تھے اور کانگرس کو آمادہ کر سکتے تھے کہ مسلمانوں سے پورا پورا انصاف کرے۔ ہمارا خیال ہے کہ مسلم لیگ کے قیام کے تین اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں کا انگریزی داں طبقہ اظہار ذات کے لئے ایک الگ پلیٹ فارم چاہتا تھا، اور کانگرس پر بنگالیوں اور مرہٹوں کا غلبہ تھا، جو دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ضمناً یہ بات بھی تھی کہ ۱۸۵۷ کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو نظر انداز کیا، اس لئے اس زمانے کے بعض مسلم رہنماؤں نے سوچا کہ انگریزی اقتدار کے قریب آنے کا ایک موقع یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی الگ جماعت قائم کی جائے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی رہنمائی جن مسلمانوں نے کی تھی، انگریزوں نے یا تو انہیں مٹا دیا تھا یا ان کا عدم وجود دونوں برابر تھا، اور اب نام تھا ان لوگوں کا جو انگریز نما ہندوستانی تھے اور انگریزی زبان بول سکتے تھے، تیسرا سبب یہ تھا کہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی شکست کے بعد اکثر انگریزی دانوں کا ذہن میں ہندو اور مسلمانوں دونوں تھے، یہ خیال تھا کہ انگریز قیامت تک ہندوستان کا آقا رہے گا، وہ ناقابل تسخیر ہے، اس لئے اس کی سیاست سے قدم ملا کر چلو کانگرس کا حال بھی یہی تھا کہ وہ انگریزی سیاست کا چربہ تھی اور مسلمانوں نے بھی ۱۸۵۷ میں جو علم بغاوت بلند کیا تھا، اس کی تلافی یوں ہو سکتی تھی کہ انگریزوں کو ہموار کیا جائے اور ان کا مزاج نہ بگاڑا جائے۔ علی گڑھ میں جو تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا یا مسلم لیگ کی جو بنا ڈالی گئی، ان کے مقاصد نیک سہی، لیکن ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمان بغاوت کی راہ اختیار نہیں کریں گے اور انگریزی سیاست کے حریف یا رقیب کبھی نہیں بنیں گے۔

انگریزی سیاست یا ہندوستانی سیاست سے زیادہ حالات و واقعات کا شکرگذار ہونا چاہئے کہ مسلم لیگ نے ہندو مسلم سوالوں کو بہت زیادہ عریاں نہیں کیا۔ یا مسلمانوں کی ایک جماعت کی حیثیت سے وہ انتہا پسند نہیں بنی۔ اور یہ اس کے باوجود ہوا کہ کانگرس اگرچہ انیسوی صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندو مہا سبھا نہیں تھی، پھر بھی وہ ہندوؤں کے اعلےٰ طبقہ کی ترجمان تھی آئینی اصلاحات کی جو قسطیں حکومت برطانیہ نے دیں، ان پر مسلم لیگ نے اپنا نقطۂ نظر واضح تو کیا، "مگر کڑ پن" سے بچی۔ اس زمانہ کی کانگرس سے ہمیں شکایت ہے کہ اگر انتخاب جداگانہ اس کے نزدیک غلط تھا تو اس غلطی کی اصلاح کی اس نے برائے نام بھی کوشش نہیں کی۔ بہرحال زمانہ ہندو مسلم اعتدال پسندوں کا تھا، اس لئے مسلم لیگ کی گاڑی بھی دھیرے دھیرے چلتی رہی۔

یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء میں لکھنو پیکٹ ہوا، کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کا اس پیکٹ میں مساوی حصہ تھا۔ زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا رہا، مسلم لیگ قومی زندگی سے دور جانے کے بجائے قریب آتی رہی تلک آنجہانی کا انتقال ہوا اور گاندھی جی کی انتہا پسندانہ قیادت کا ظہور ہوا۔ پھر بھی کانگرس اور مسلم لیگ بڑی حد تک قدم سے قدم ملا کے چلتی رہیں۔ بڑے بڑے مسلم احرار وطن مسلم لیگ کے لیڈر رہتے، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں کا مسلم لیگ میں اونچا مقام تھا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کانگرس کے سالانہ اجلاس کے ساتھ ایک ہی مقام پر ہوا۔

مسٹر محمد علی جناح نیشنلسٹ تھے، ان کی نیشنلزم کا اعتراف اس طور پر کیا گیا کہ ممبئی میں جناح ہال کی تعمیر ہوئی۔ ابتداً میں وہ آئین پسند تھے، انھیں گاندھی جی کی قانون شکن تحریکیں پسند نہ تھیں، کھدر چرخے اور جیل یاترا سے انھیں قطعاً دلچسپی نہ تھی، مسٹر گوکھلے کے نظریات سے وہ مانوس سے

ہندوستانیوں کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ وہ برطانیہ کے آلہ کار تھے ہم سمجھتے ہیں کہ خود بینی اور خودداری کی مقدار ان کی ذات میں اتنی وافر تھی کہ وہ کسی کے آلۂ کار نہیں بن سکتے تھے۔

وہ بڑے سے بڑے انگریز پر اپنے آپ کو بھاری سمجھتے تھے، ابھی انگر

بولتے تھے، نفیس سوٹ زیب تن فرماتے تھے اور اول درجے کے بیرسٹر تھے
ان کی زندگی "برٹش لارڈ" کی زندگی تھی۔

انہوں نے حصول آزادی سے بہت پہلے "فورٹین پوائنٹس" (چودہ نکات)
پیش کئے۔ ان نکات پر بحث بھی بہت ہوئی لیکن انجام کار الہ آباد کی
اتحاد کانفرنس نے جو کئی سیاسی جماعتوں کی نمائندہ جماعت تھی۔ اور
وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے انھیں بڑی حد تک تسلیم کیا۔ آل پارٹیز
مسلم کانفرنس (لکھنو) نے بھی جو ۱۹۲۵ء میں منعقد ہوئی تھی، مسٹر جناح کے
چودہ نکات کو اسی حد تک تسلیم کیا۔ اگرچہ "نہ رد نہ قبول" کا فارمولا بھی وضع کیا۔

قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کو سمجھنے کے لئے کچھ باتیں سمجھنا ضروری ہیں
ایک نفسیاتی ہے، دوسری واقعاتی ہے۔ نفسیاتی یہ ہے کہ جناح صاحب کو
ایک فرد کی حیثیت سے اپنی اہمیت کا شدید احساس تھا۔ تحریک ترک موالات
نے جن اعتدال پسندوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا، ان میں مسٹر جناح سر
تیج بہادر سپرو، سر سوامی آئر، سر سوبرامنیم، ڈاکٹر ہردے ناتھ کنزرو غیرہ کے
اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، تحریک ترک موالات نہ شروع ہوتی
یا انگریزوں کے مقابلے میں پرامن جنگ نہ کی جاتی، تو جناح صاحب کا مقام
انگریزی حکومت کے نزدیک بہت اونچا ہوتا۔ گاندھی نے مسلمانوں میں جو
رفقاء کار منتخب کئے، ان میں مسٹر محمد علی جناح کا کہیں نام نہ تھا۔ انہوں نے
یہ صبر آزما صورت حال برسوں گوارہ کی۔ اور ایک زمانہ تک کوئی اقدام ایسا نہیں
کیا جو قومی تحریک کے تقاضوں کے منافی ہو۔ وہ مرکزی اسمبلی (اس زمانہ میں پارلیمنٹ
نہیں تھی، مرکزی اسمبلی تھی) میں انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر تھے، جو کوئی مسلم
پارٹی نہیں تھی، انہوں نے اکثر کانگرس پارٹی کی اسمبلی میں تائید کی۔ پھر بھی
قومی لیڈر شپ انہیں نہ سمجھ سکی۔ گاندھی جی کے مسلم رفقاء کار سے ان کی بیزاری
اس حد تک بڑھی کہ انھوں نے جل کر مولانا ابوالکلام آزاد کو "شو بوائے" کہہ دیا
مسلم لیگ کی "واحد نمائندگی" پر ان کا اصرار بھی یوں تھا کہ کانگرس کے مسلم حلیفوں
کو سیاست کے خانوں سے خارج کر دیا جائے۔

جناح صاحب نے ۱۹۲۷ء کے بعد آہستہ آہستہ اندازہ لگایا کہ کانگرس کے
خلاف مسلمانوں کا محاذ قائم کیا جا سکتا ہے۔ نہرو رپورٹ کے خلاف جب مسلم کانفرنس
سر آغا خان، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی رہنمائی میں قائم ہوئی، تو
مسٹر جناح نے اندازہ کر لیا کہ مسلمانوں کی وہ رہنمائی کر سکتے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا
کہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی زندہ ہوتے تو کیا کرتے، لیکن ان کی مرعوب کن شخصیت
کی موت کے بعد مسٹر محمد علی جناح کے لئے راہ کی ایک بہت بڑی مشکل دور ہو چکی
تھی، مولانا ابوالکلام آزاد بہت بڑے لیڈر تھے، مگر ان کے نظریات، معتقدات
اور مزاج کا یہ عالم تھا کہ وہ گلیوں، کوچوں اور میدانوں میں مسٹر جناح کے حریف
نہیں ہو سکتے تھے۔ مسلمانوں سے مسٹر جناح ہی کہہ سکتے تھے کہ انتہائی اقدامات
کرنے چاہئیں، مولانا آزاد نہیں کہہ سکتے تھے

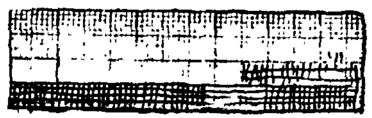
مسئلہ کا واقعاتی پہلو یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد صوبائی خود مختاری کے
دور میں جب عوامی وزارتیں کئی صوبوں میں بنیں، تو صوبہ کی اسمبلیوں کے
مسلم لیگی ممبروں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ نواب محمد اسمٰعیل اور چودھری خلیق الزماں
کے معاملہ میں خود مولانا ابوالکلام آزاد نے "ہندوستان نے بازی جیت لی"
اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ اس امر کے پیش نظر کہ ۱۹۳۶ کے انتخابات عامہ
میں مسلم لیگ سے کانگرس اور جمعیۃ علماء کا ایک بے قاعدہ یا باقاعدہ سمجھوتہ ہو گیا
تھا، یہ عجیب بات تھی کہ مسلم لیگی وزارتوں میں نہ لئے جا سکے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے ہندوستان اور اس کی اقلیتوں پر عظیم احسانات
ہیں۔ یہ جراٗت انہی کو ملی تھی کہ وہ ہندو مسلم فساد کرانے والوں کو علانیہ غدار کہہ سکتے
تھے، لیکن ان کی یہی بیباکی اور حق گوئی کبھی کبھی پریشان کن بھی ہو جاتی تھی۔ انہوں
نے ایک بار چیلنج کے انداز میں اعلان کیا کہ ہندوستان میں دو ہی پارٹیاں ہیں،
ایک سامراج ہے، دوسری کانگرس ہے۔ مسٹر جناح نے اس کا مطلب یہ سمجھا
کہ پنڈت نہرو انھیں اور مسلمانوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کو
نظر انداز کرنے کا بالکل سوال نہیں تھا۔

مسٹر جناح نے بلاشبہ دو قومی نظریہ اور پاکستان پر نہ صرف اصرار کیا بلکہ
ضد کی۔ لیکن تقسیم ملک سے کچھ پہلے وہ مطالبہ پاکستان سے بھی بڑی حد تک دستکش
ہو گئے تھے اور پورے ہندوستان کے ایک متحدہ مرکز کو تسلیم کرنے لگے تھے۔
لیکن اے، بی۔ سی یونٹوں کی جو نئی تشکیل کی گئی تھی، اس کے خلاف آسام کے
وزیر اعلیٰ مسٹر باردولائی نے جو رویہ اختیار کیا اور پنڈت نہرو نے سمجھوتے کے
خلاف جو اعلان کیا۔ اس نے ہندوستان کو متحد رکھنے کی آرزوئیں خاک میں ملا دیں
مسٹر جناح نے قدم واپس لئے اور مطالبہ پاکستان سے ایک بار پھر رجوع کیا۔ نتیجہ
ظاہر تھا کہ ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔

قیام پاکستان کے سلسلہ میں یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ صرف مسلم لیگ اور مسٹر
محمد علی جناح نے پاکستان بنوا ڈالا۔ اس کے پیچھے بڑی بڑی سازشیں تھیں،
ان سازشوں کا تانا بانا لارڈ اٹیلی، برطانوی استعمار اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے
بنا تھا۔ اور کانگرس، گاندھی جی اور پنڈت نہرو سازش کا توڑ کرنے میں کامیاب
نہ ہو سکے۔

صرف مولانا ابوالکلام آزاد لارڈ ویول کے ذریعہ سے اس سازش کا کامیاب
جواب دینا چاہا تھا، مگر ان کی بساط سیاست کے مہرے خانوں میں ٹھیک
نہ بیٹھ سکے۔ قومی زندگی کا یہ دلچسپ منظر تھا کہ دو مسلمان، تقسیم ہند اور
متحدہ ہندوستان کے دو عظیم کردار تھے، ایک کا نام ابوالکلام دوسرے کا
نام محمد علی جناح تھا۔





تحریک ترکِ موالات

تحریک خلافت، جمعیۃ العلما کی تحریک اور تحریک ترکِ موالات قومی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ سوال یہ تھا کہ گھنٹی کون بجائے؟ اس وقت کے اعتدال پسندوں اور انگریز پرستوں میں گھنٹی بجانے کی ہمت نہ تھی۔ گاندھی جی نے اور ان کے ساتھیوں نے گھنٹی بجائی۔ اور قومی زندگی کی گاڑی آگے بڑھنے لگی۔ کانگریس کا سالانہ اجلاس ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں ہوا۔ صدر اجلاس ایک ایسے بزرگ تھے جن کا اسم گرامی کم و بیش ایک سطر میں لکھا جاتا تھا، اور نام کے لاحقوں اور سابقوں کو نظر انداز بھی کر دیجئے تو مختصر نام تھا وجے درگھو راگ وجے چاریہ۔ ان بزرگ نے تحریک ترک موالات کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ترک موالات ناقابل عمل، غیر منطقی، غیر مدلل اور نامعقول ہے اور اسے کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے نصیحت فرمائی تھی کہ ہمیں آئین کی حدود میں رہنا چاہیے۔ تاہم اس بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔

تحریک ترک موالات کے معنی یہ تھے کہ انگریز حکومت کا اکثر معاملات میں بائیکاٹ کیا جائے۔ مثلاً اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل نہ کی جائے سرکاری خطابات واپس کر دیے جائیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال مورخہ ۔ اگست ۱۹۱۴ء میں یہ تجویز ذرا بدل کر پیش کی تھی۔ مولانا کی تجویز انہی کے الفاظ میں یہ تھی۔

(۱) انگریزی فوج میں ملازمت حرام قرار دی جائے۔
(۲) اعلیٰ و ادنیٰ سرکاری ملازمین ترک کر دی جائیں۔
(۳) لگان اور ٹیکس ادا نہ کئے جائیں
(۴) سرکاری درسگاہوں کا مقاطعہ کیا جائے
(۵) سرکاری خطابات کو قومی و ملی توہین سمجھا جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی کی ملاقات دس فروری ۱۹۲۰ کو مسٹر سی۔ آر۔ داس کے کی قیام گاہ پہ کلکتہ میں ہوئی، اور ترک موالات کے مسئلہ پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس کا ایک بیان امرت بازار پتر لیکا (مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۲۱ء) میں چھپا، الفاظ یہ ہیں۔

میری تجویز پر مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ملاقات میرے مکان پر ہوئی، اور تجویز ترک موالات کی تفصیلات پر ایک گھنٹہ بیس منٹ بات چیت ہوتی رہی۔ مولانا آزاد نے اپنی تجاویز پیش کیں اور اصرار کیا کہ انگریزی فوج کی ملازمت قطعاً ممنوع قرار دی جائے۔ گاندھی جی نے کہا کہ ہمیں ابھی وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔ مولانا نے آخر اتفاق کر لیا۔ اور طے پایا کہ سر دست سرکاری درس گاہوں کی تعلیم، اور عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ مجھے اس وقت دونوں سے اتفاق نہیں تھا۔

۱۹۲۱ میں کلکتہ میں کانگرس کا اجلاس خصوصی ہوا۔ بنگالی لیڈروں کو معلوم تھا کہ مولانا محمد علی اجلاس خصوصی میں گاندھی جی کی تائید کریں گے روزنامہ اسٹیٹسمین (کلکتہ) کے نامہ نگار خصوصی نے اجلاس سے پہلے رائے زنی



کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"مسٹر گاندھی کے معصوم چیلے حکومت برطانیہ کا مقابلہ کریں گے۔ اور ان چیلوں میں مسٹر یا مولانا محمد علی بھی ہیں۔ اجلاس خصوصی میں ان کی تقریر بھی ہوگی۔ اور غالباً لمبی تقریر ہوگی۔ بنگالی خطیب تنہا اپنی خطابت پرناز رہے، مولانا صاحب کی خطابت کا جواب دینے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ فٹ بال کا یہ میچ دلچسپ ہوگا۔"

واقعی یہ میچ دلچسپ ہی نہیں ہنگامہ خیز تھا۔ گاندھی نے کھلے اجلاس میں تجویز ترک موالات پیش کی۔ ان کی تقریر بہت مختصر تھی۔ پندرہ منٹ میں انہوں نے کاغذ پر لکھی تجویز پیش کی اور اس پر تقریر بھی کی ان کی تقریر کا مفہوم تھا کہ حکومت برطانیہ نے ہندوستان سے وعدہ خلافی کی ہے اور ہندوستان کو سوراج نہیں دیا، اس لئے ہم اقدام پر مجبور ہیں، اور احتجاج کرتے ہیں۔

مسٹر سی، آر۔ داس نے گاندھی جی کی تجویز سے پرزور اختلاف کیا، اور کہا کہ حکومت برطانیہ اور اس کے نمائندوں سے ہم نے حجت تمام نہیں کی ہے تحریک شروع کرنے سے پہلے وسیع پیمانے پر تیاریوں کی ضرورت ہے قانون کی خلاف ورزی مناسب نہیں ہے۔ عدالتوں کا بائیکاٹ ممکن نہیں ہے۔ سرکاری درسگاہوں کا بائیکاٹ کیا جائے گا تو طلبا کہاں پڑھیں گے وغیرہ وغیرہ۔

اب رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی باری تھی۔ مولانا نے مسلسل تین گھنٹے تقریر کی۔ دو بجے دن کو تقریر شروع ہوئی اور پانچ بجے شام تک جاری رہی، مولانا نے فلسفہ، تاریخ عالم، تاریخ اسلام، ادب، شاعری پر مفصل گفتگو کی۔ تاریخ اسلام پر فرمایا۔

"تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں اگر تیاریوں پر سارا زور خرچ کیا جاتا تو اسلام، دنیا کی سب سے بڑی طاقت نہ بنتا۔ تیاریوں کی اہمیت سے مجھے انکار نہیں ہے، لیکن جب ارادے صحیح ہوں تو تیاریاں خود بخود ہو جاتی ہیں۔"

غالب کا یہ شعر بھی مولانا نے سنایا کہ۔

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

"اسٹیٹمین" کے نامہ نگار خصوصی نے جو مولانا پر پہلے طنز فرما چکا تھا لکھا کہ"

مسٹر محمد علی کی تقریر کی رفتار اتنی تیز تھی کہ حکومت ہند، حکومت بنگال اور اخباروں کے اسٹاف میں ایک شارٹ ہینڈ ایسا نہیں تھا، جو ان کی تقریر کو ضبط تحریر میں لا سکتا۔

مولانا کی تقریر کا حیرت انگیز اثر یہ تھا کہ مسٹر سی، آر، داس نے بھرے اجلاس میں انھیں چپٹا لیا اور کہا کہ میں آپ کے دست حق پرست پہ ایمان لایا اس کے بعد مسٹر سی آر داس کی زندگی ہی بدل گئی، انہوں نے وکالت ترک کی، کھدر پہنا اور جیل گئے۔

تحریک ترک موالات طول و عرض ملک پر چھا گئی۔ وکیلوں اور بیرسٹروں نے عدالتوں کا بائیکاٹ کیا، طلبا نے اسکول اور یونیورسٹیاں چھوڑ دیں اور سروں، خان بہادروں اور رائے بہادروں نے خطابات واپس کئے۔

مسرت کی بات یہ ہے کہ خطابات واپس کرنے والوں میں پہلا نام ایک مسلمان خان بہادر کا تھا، جن طلبا نے سرکاری درسگاہیں چھوڑیں ان میں چالیس فیصدی مسلمان طلبا تھے، اور عدالتوں کا بائیکاٹ کرنے والے وکیلوں اور بیرسٹروں میں ۵۰ فی صدی مسلمان تھے۔

تحریک ترک موالات سے کچھ ہی پہلے ہجرت کی تحریک شروع ہوئی تھی ۱۲ ہزار مسلم نوجوان اس تحریک کے سلسلے میں افغانستان پہنچے، ان کی ہجرت کا مقصد یہ تھا کہ افغانستان سے ہتھیار حاصل کریں اور انگریزی حکومت سے لڑیں۔ جب انھیں افغانستان میں ہتھیار نہ مل سکے تو وہ روس چلے گئے اور وہاں انھوں نے سامراجی پٹھوؤں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی۔ ان مہاجرین میں ایسے بھی تھے جو بعد کو ہندوستان واپس آئے۔

تحریک ترک موالات ہی کا ایک بچہ تحریک خلافت بھی تھی۔ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے اس تحریک میں جان ڈالی، گاندھی جی نے تحریک خلافت کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک تحریک کہا، اور اس کے لئے بہت کچھ کیا۔ ان کی اخلاقی مدد نے تحریک کو کہاں سے کہاں پہنچایا۔ اور انگریز ڈر گئے کہ ہندو اور مسلمانوں کا اتحاد انگریزی حکومت کے وجود کو ایک زبردست چیلنج ہے۔ بات یہ ہے کہ گاندھی جی ہندوستانیوں کا مزاج پہچانتے تھے، جو اصلاً

مذہبی آزادی کا مطالبہ تھا اور ہے۔ انہوں نے رام راج کا نام لیا تاکہ ہندو عوام قومی تحریک کے مقاصد کو سمجھ سکیں۔ انہوں نے مسئلہ خلافت سے دلچسپی لی، اور خلافت راشدہ کو مثالی حکومت کہا تاکہ قومی زندگی کے مزاج میں توازن قائم رہے۔

تحریک خلافت جب شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ دوسری تحریکیں اس میں گویا ضم ہو گئیں۔ شاید ہی کوئی قابل ذکر ہندوستانی مسلمان ہو گا جو تحریک خلافت سے وابستہ نہ ہو، مولانا ابوالکلام آزاد، مسیح الملک حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، پنجاب کے مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالقادر قصوری، بہار کے مولانا مظہر الحق، اور ڈاکٹر سید محمود بمبئی کے سیٹھ چھوٹانی، سب ہی تو تحریک خلافت کے علمبردار تھے۔

تحریک خلافت کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء ہند نے بھی قومی زندگی کو متاثر کیا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، مولانا محمد علی مونگیری، علامہ مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید نے اور پانچ سو علماء کے فتاویٰ نے تحریک ترک موالات کو سب سے بڑی سامراج دشمن تحریک بنا دیا۔

گاندھی جی کی ستیہ گرہ، تحریک ترک موالات کی ایک ارتقائی شکل تھی۔ تحریک ترک موالات تحریک تھی اور ستیہ گرہ ایک طریق جنگ تھی۔ گاندھی جی نے اہنسا پر زور دیا۔ اس تحریک کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ طبعاً اہنساوادی تھے لیکن دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا انجام وہ دیکھ چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے منظم اور پرامن جنگ کی، ضبط و نظم پر زور دیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر مسلح جنگ کی تو انگریزی حکومت اسے فوراً شکست دے گی۔ اہنسا گاندھی جی کا ایمان ضرور تھی لیکن کانگریس وادا سے تسلیم کرے یا نہ کرے، وہ ایک طریق کار بھی تھی، اور حالات و واقعات کی مجبوریوں کے پیش نظر اہنسا کے سوا راہ عمل بھی کیا تھی بعض ذمہ دار مسلمان اہنسا یا عدم تشدد سے مطمئن نہ تھے۔ لیکن اس مسئلہ



پر وہ قومی تحریک میں اختلاف بھی پیدا کرنا نہیں چاہتے تھا۔ ہندوستان کو ایک عظیم لیڈر ملا تھا۔ اس لئے اگر وہ دس یا بیس باتیں مسلمانوں کی مان لیتے تھے، تو ان کی ایک بات مان لینا کوئی خاص نقصان نہیں تھا۔

تحریک خلافت کے سلسلہ میں آل انڈیا مجلس خلافت بھی قائم کی گئی جس کی سربراہی مولانا شوکت علی کے حصہ میں آئی، ۱۹۲۰ء سے لاہور کانگریس تک چھوٹے بھائی مولانا محمد علی کا قومی تحریک پر بہت زیادہ اثر تھا، لیکن جہاں تک مجلس خلافت یا خلافت کمیٹی کا تعلق تھا۔ مولانا شوکت علی اس کے جسم و جان تھے۔ ان کی قد و قامت اور جسامت ہی کے ہم وزن مرکزی خلافت کمیٹی میں ان کا حصہ تھا۔ خلافت فنڈ میں سیٹھ چھوٹانی کی وجہ سے جب کمی ہوئی تو خلافت والوں کی ساکھ بگڑنے لگی، پنجابی ٹولی نے جو پنجاب کے بڑے بڑے لیڈروں کی ایک ٹولی تھی، مرکزی خلافت کمیٹی کے لیڈروں سے اختلاف کیا، اور ترکی میں خلافت اور خلیفہ کے خاتمہ کے بعد، تحریک خلافت اور اس کی تنظیم ٹھنڈی پڑ گئی۔ وقتی طور پر سوال پیدا ہوا کہ جب خلافت ہی نہیں رہی تو ہندوستان میں تحریک خلافت کے کیا معنی ہیں۔ علی برادران کا انتقال بھی ہو گیا۔ اس لئے رفتہ رفتہ خلافت کمیٹی کا نام ہی باقی رہ گیا۔ روزنامہ خلافت بمبئی اور مولانا شوکت علی کے بڑے صاحبزادے مولانا زاہد علی نے کسی طرح خلافت کمیٹی کا نام باقی رکھا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد خلافت کمیٹی کے کئی ستون پاکستان منتقل ہو گئے اس لئے محفل میں جو رہی سہی گرمی تھی سردی اور ٹھنڈک سے بدل گئی

بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تحریک خلافت نے ایک زمانہ میں قومی تحریک میں جان ڈالی، بڑے بڑے لیڈر اور کارکن پیدا کئے اور گاندھی جی نے ملک کو یہ درس دیا کہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے اکثریت کو کیا کرنا چاہیئے۔



تحریک احرار

۱۹۲۰ء کی تحریک ترکِ موالات کے بعد لفظ "احرار" تو تقریروں اور تحریروں میں استعمال ہونے لگا تھا۔ اس سے پہلے بھی ملا جامی کے پیر و مرشد خواجہ عبیداللہ احرار سے کچھ لوگ اپنے ناموں کو نسبت دینے لگے تھے۔ مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر بھی عبدالعلیم احراری کہلاتے تھے،

لیکن احرار کی تنظیم پہلی بار ۱۹۳۱ء میں کی گئی اور تنظیم کا نام مجلس احرار اسلام پڑا۔ اور اس کا صدر دفتر لاہور میں تھا۔ ابتدا میں یہ تنظیم پنجاب تک محدود تھی۔ پھر آل انڈیا تنظیم بن گئی۔

مجلس احرار کے زعما پہلے کانگرس و مجلس خلافت میں تھے۔ اور جمعیۃ علماء ہند بھی شریک تھے، مجلس مرکزیہ خلافت کی سیاست میں انہیں پنجابی ٹولی کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ پنجابی ٹولی میں خاص طور پر قابل ذکر مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، غازی عبدالرحمٰن، شیخ حسام الدین اور مولانا داؤد غزنوی تھے۔

پنجابی ٹولی میں بھی کچھ نفسیاتی اختلافات تھے۔ ۱۹۲۰ء کی کراچی کانگرس میں ڈاکٹر شیخ محمد عالم کانگرس کی مجلس ... کے ممبر نامزد کئے گئے۔ اس نامزدگی سے پنجاب کے اکثر مسلم لیڈروں کو اختلاف تھا۔ آگے چل کر اس اختلاف نے مجلس احرار کی شکل اختیار کی۔ مولانا عبدالقادر قصوری جنہیں پنجاب میں بابائے کانگرس کہتے تھے، مجلس احرار سے بے تعلق رہے۔ اور مولانا ظفر علی خاں اگرچہ احراری زعما کے معنوی لیڈر تھے، لیکن ان کا بھی مجلس احرار سے باقاعدہ تعلق نہ تھا۔ مجلس احرار نے اپنی پہلی کانفرنس میں انتخاب جداگانہ اور انتخاب مخلوط کے تعلق سے اپنی پوزیشن واضح کی، اور انتخاب جداگانہ سے اپنی بے زاری ختم کردی۔ بات یہ تھی کہ نہرو رپورٹ نے انتخاب مخلوط کی سفارش کی تھی اور طریق انتخاب کے سلسلہ میں پنجاب میں اس زمانہ میں جو صف آرائیاں ہوئیں، اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ نہرو رپورٹ جب لاہور کانگرس میں زائد المیعاد قرار دے دی گئی، تو سیاسی طور پر کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ مجلس احرار خواہ مخواہ طریق انتخاب کے سوال پر محاذ آرائی کرتی۔ مسلم عوام کے ایک بہت بڑے طبقہ میں طریق انتخاب کے سوال پر بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں، جو لوگ نہرو رپورٹ کے حامی تھے، انہیں "نہروانی" اور ہندو کا درم خریدہ غلام کہتے تھے، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک کے روزنامہ "انقلاب" لاہور نے زعمائے احرار وطن کی نہایت بھیانک تصویریں بنائی تھیں، اس لئے فضا کو ہموار کرنے کے لئے مجلس احرار نے طریق انتخاب کے بارے میں اپنی پوزیشن صاف کی۔

احرار اسلام نے دو مسئلوں سے غیر معمولی دلچسپی لی۔ ایک مسئلہ تو کشمیر کا تھا، جہاں اس نے ذمہ دار حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا، دوسرا مسئلہ رد قادیانیت کا تھا۔ تحریک کشمیر کے سلسلہ میں اس نے ۵۰ ہزار مسلمانوں کو جیلوں میں بھیجدیا، الٰہی بخش شہید ہوئے، کئی رضاکار زخمی ہوئے، پوری حکومت ہند، پوری حکومت پنجاب اور پوری حکومت کشمیر نے تحریک کشمیر کی جم کر مخالفت کی، پنجاب کے بعض ممتاز افراد حکومت ہند کی عمارت کے ستون تھے، ان میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر سر فضل حسین، سر ظفراللہ خاں، سر شفیع، سر ملک فیروز خاں نون تھے۔ انہوں نے تحریک کشمیر کو ختم کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا خود کشمیر میں تحریک احرار کے مخالفین پیدا ہو گئے۔ اس لئے حکومت ہند، اس کے وفاداران ازلی اور کشمیریوں کے ایک ذمہ دار طبقہ کے اختلاف کی بنا پر تحریک احرار کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مہاراجہ کشمیر نے اپنے غیر محدود اختیارات میں جو کمی کی، اور گلینسی کمیشن جس طرح مقرر کیا گیا اس میں تحریک احرار کو بہت زیادہ دخل تھا۔

قادیانیت کی تحریک اگرچہ مذہبی تحریک تھی، مگر بنیادی طور پر ایک زبردست سیاسی تحریک تھی۔ صورت یہ تھی کہ قادیانیت، برطانوی استعمار سے بہت قریب آچکی تھی، بڑے بڑے قادیانی انگریزی حکومت کے حلیف تھے، اور انگریزی حکومت نے سمجھ لیا تھا کہ اس نے ایک گروہ پیدا کر لیا ہے، جو مذہباً و شرعاً انگریزوں کو "اولی الامر" سمجھتا ہے۔ انگریز سیاست دانوں کی ایک زمانہ سے آرزو تھی کہ ہندوستان میں ایسے گروہ پیدا کئے جائیں جو مذہبی طور پر ان کی حکومت کے لئے وجہ جواز پیدا کریں۔ قادیانیت بڑی حد تک اس خواب کی تعبیر تھی۔

اس لئے تحریک احرار کو مذہبی تحریک یا فرقہ پرورانہ تحریک

ہی کیوں نہ کہا جائے، اصلاً وہ "سامراج دشمن تحریک تھی، اور برٹش امپریلزم کو اس نے جو زبردست چیلنج دیا، اس کی مثال صرف ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ۱۹۲۰ء کی تحریک ترکِ موالات اور عوامی سول نافرمانیوں میں ملتی ہے، یہی نہیں بلکہ جنگجویانہ انداز میں کانگرس کی تحریکیں بھی تحریکِ احرار کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

مجلسِ احرارِ اسلام کا مقابلہ کرنے کے لئے انگریزی حکومت اور اس کے نیاز مندانِ ازلی نے اپنے تمام وسائل و ذرائع خرچ کئے، ایک مثیر کمیٹی بھی بنا ڈالی، جس کے روحِ رواں خلیفہ قادیان جناب بشیر الدین محمود اور سر چودھری ظفر اللہ خاں تھے، اور عجیب بات یہ ہے کہ اس زمانے میں کشمیر کے لیڈر شیخ عبداللہ نے بھی اُن سے تعاون کیا۔ صوبہ سرحد میں اگرچہ خان عبدالغفار خاں اور اُن کے ساتھی ابتدا میں مولانا ظفر علی خاں اور روزنامہ زمیندار لاہور سے متاثر تھے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ تحریکِ احرار نے انہیں مضبوط کیا اور توانائی بخشی۔

۱۹۳۰ء کے بعد قومی تحریک میں شاید ہی کوئی موقع ایسا آیا ہو کہ مجلسِ احرار نے تعاون نہ کیا ہو۔ انگریز آثار دیکھ رہا تھا کہ صوبہ سرحد منحرف ہو رہا تھا، اور صاحبزادہ سر عبدالقیوم کی سیاست پٹ رہی تھی۔ وہ پنجاب کو اپنا مضبوط حلقہ سمجھتا تھا، جہاں فوجی بھرتی کے نام پر اُس نے ممتاز خاندانوں کو دودھ پلا پلا کر پالا تھا۔ اس لئے مجلسِ احرار جب معرضِ عمل میں آئی، تو سامراج کی بنیادیں ہلنے لگیں، اور اس نے پوری طاقت سے تحریکِ احرار کو شکست دینے کا اہتمام کیا اور آگے چل کر وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔

ان سطروں کے لکھنے والے نے تحریکِ احرار اور زعمائے احرار سے کبھی کبھی اختلاف بھی کیا، لیکن وہ اس مخلصانہ اعتراف پر مجبور ہے کہ ہندی مسلمانوں کی پچھلی ۲۰۰ سالہ تاریخ میں مسلمانوں میں کوئی جماعت ایسی پیدا نہیں ہوئی، جو اس قدر ایثار پیشہ، اس قدر جنگجو، اور اس قدر دھن کی پکی تھی جس قدر مجلسِ احرار تھی۔ احرار لیڈروں میں سب ہی قلندر تھے، جا، کے لئے آج جیب میں پیسے نہیں ہیں، دفتر کے لئے ٹکٹ اور کاغذ نہیں ہیں، اخبار نکالنے کے لئے سرمایہ نہیں ہے، لیکن اللہ کے یہ بے مایہ بندے لڑتے ہی رہے۔ اور انہیں انعام کیا ملا؟ تقسیمِ ملک کے بعد ان کا رہا سہا نشان بھی مٹ گیا۔

کانگرس نے اگر اوّل درجہ کے لیڈروں کا ایک گروہ پیدا کیا جن میں قابلِ ذکر گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مسٹر سی۔ آر۔ داس، مولانا محمد علی، پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ تو مجلسِ احرار نے بھی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، چودھری افضل حق کو آسمانِ قیادت کا آفتاب و ماہتاب بنا ڈالا۔ اُن میں چودھری افضل حق اوّل درجہ کے "پینترا باز" تھے، مولانا



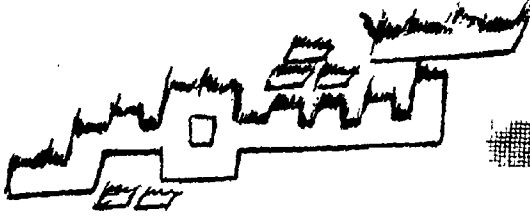
عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت تو پورے ہندوستان میں مسلم تھی ہی، لیکن ان کا کردار اتنا پیارا تھا کہ دشمن بھی ان کا کلمہ پڑھنے لگتا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی معاملہ فہمی اور تدبّر کا جواب نہیں تھا، انہیں فقط مولوی نہ سمجھا جاتا، تو وہ دُنیا کے کسی صدرِ جمہوریہ کے بہترین مشیر ہو سکتے تھے۔ بے انصافی ہوگی اگر مولانا مظہر علی اظہر کی بے غرضی، ایثار پیشگی اور اخلاص کا ذکر نہ کیا جائے۔ مذہباً اُن کا تعلق شیعیانِ علیؓ سے ہے، لیکن احرار کی پوری تحریک میں اُن کے مذہبی معتقدات نے ادائے فرض سے انہیں کبھی باز نہیں رکھا۔ کیسی قیامت ہے کہ جس مظہر علی اظہر کو آج صدرِ جمہوریہ ہونا چاہئے تھا، وہ لاہور میں فقط ایک وکیل ہے اور بے بسی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

اور اس سلسلہ میں ہمیں کیوں نہ یاد آئیں عزیزِ گرامی جناب شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان لاہور، جن کا بچپن حضرت علی کرم اللہ کے بچپن سے ملتا جلتا، جو خطابت میں بیک وقت مولانا ظفر علی خان اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری تھے، جو صحافت میں مولانا ظفر علی خاں اور مولانا مہر تھے، اور جن کی حریت پسندی اور مقصد پسندی نے آج تک تقسیمِ ملک کے باوجود بہت سے ہندو جوانوں کو بھی (جو اب بوڑھے ہو رہے ہیں) اُن کا نیازمند بنا رکھا ہے۔ شورش کاشمیری واقعی چٹان ہیں، لیکن اُن کے "چٹان" سے زیادہ ہم اس چٹان، اس طوفان، طوفان کی اس شورش، سمندروں کے اس جوش و خروش کو جانتے ہیں، جو ۱۹۴۷ء سے پہلے ایک مجسم بغاوت ایک چلتا پھرتا انقلاب تھا۔

جستجو: ہزاروں سال

سیاسی تاریخ کا یہ المناک واقعہ ہے کہ مجلسِ احرار اس کے مجاہد زعما، اس کے فدائی رضاکاروں کو ہندوستان کی قومی لیڈرشپ نے بسا اوقات نظر انداز کیا، اور ان سے وہ کام نہ لیا جو اُن کے کرنے کا تھا، انہیں شاید ضرورت سے زیادہ جوشیلا اور جذبیلا سمجھا گیا، لیکن سوال یہ ہے کہ سرحد کے جن خدائی خدمت گاروں کو قابلِ اعتنا سمجھا گیا۔ اُن سے بھی آخر کار کیا سلوک روا رکھا گیا۔ ملک کی تقسیم گوارا کر لی گئی، اور پوچھا تک نہیں گیا کہ کیا بیت رہی ہے۔ ظالم زمانہ !!

تحریک



جموں وکشمیر میں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہے، لیکن اس کی اقلیت بھی اہم ہے، جو تعلیم یافتہ، آسودہ حال، ذہین اور سرمایہ دار ہے۔ جموں وکشمیر کی اکثریت کو مہاراجوں نے شاید ہی کبھی قابلِ لحاظ سمجھا ہو۔ اس میں مذہبی جانبداری سے زیادہ شخصی حکومت کی مصلحتوں کو دخل تھا۔ ویسے کشمیر کے بعض مسلم خاندانوں کو مہاراجہ نے نوازا اور فوج میں انھیں نوکریاں بھی دیں۔ کشمیر میں کچھ مسلم خاندان بھی آسودہ حال تھے، لیکن اُن کی آسودہ حالی، مہاراجہ کا عطیہ تھی، اُن کی محنت، جفاکشی، ہنرمندی، کا نتیجہ زیادہ تھی۔

کشمیر عموماً ہندوستان کے لئے اور خاص طور پر پنجاب کے رئیسوں کے لئے ایک رومانس تھا، کشمیر جنت نظیر تھا، فارسی کا ایک شعر پڑھا، اور فسانۂ کشمیر ختم ہوا۔ انگریزوں نے بھی کشمیر کو ایک رومانس ہی سمجھا۔ فوجی اور سیاسی اعتبار سے کشمیر کی جو اہمیت تھی، اسے انگریزوں نے تو سمجھا، مگر مہاراجہ کشمیر نے بہت کم سمجھا۔ کشمیری عوام، عموماً چرند پرند یا جنّت کی مخلوقات سمجھے گئے، عیسائی مشنریوں نے بہت توجہ فرمائی تو ایک دو اسکول قائم کر دیئے۔ کشمیری مسلمان یا تو مانجھی سمجھا جاتا تھا یا بوجھ اُٹھانے والا مزدور جسے ہاتو، کہتے تھے یا وہ انگریزی زبان بول لیتا تھا، تاکہ انگریز سیاحوں سے باتیں کر سکے۔

"ہوم رول" کی جو تحریک ہندوستان میں کم و بیش چالیس سال تک چلی، کشمیر کو برائے نام ہی متاثر کر سکی۔ کشمیری اقلیتوں کو کیا مصیبت پڑی تھی کہ وہ ہوم رول، کی تحریک سے دلچسپی لیں، اس لئے کہ شخصی حکومت اُن کے مفادات کی نگراں تھی، اور کشمیر کی اکثریت میں کم ہی افراد ایسے تھے جو ہوم رول، کی اہمیت سمجھنے کی زحمت گوارا کرتے۔ شخصی حکومت مسلمانوں، غیر مسلمانوں دونوں کے لئے صبر آزما تھی۔ اگر صبر آزما نہ ہوتی تو کوئی سبب نہ تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے کئی خاندان ترکِ وطن کر کے، لاہور، امرتسر، الہ آباد وغیرہ میں سکونت اختیار کرتے

ہوم رول، کی تحریک کی رفتار جب تک سست اور محدود رہی، کشمیر اس سے دلچسپی کیوں لیتا۔ اس سے دلچسپی کشمیر ہی نے نہیں لی، بلکہ پنجاب اور سرحد نے بھی نہیں لی۔ لیکن ۱۹۲۰ کے بعد جب قومی زندگی کا ایک نیا دور آیا اور آزادی اور سوراج کا نام لیا گیا، تو جموں وکشمیر نے بھی کروٹ لی۔ جموں اور کشمیر کے دو طلبا ہمیں جامعہ ملیہ میں ملے، جو تحریک ترکِ موالات کا نتیجہ تھی ایک کا نام رشید اطہر تھا (جو اب پاکستان کے کسی کالج میں پروفیسر ہیں) دوسرے کا نام رضا جموی تھا، جو طالب علمی کے زمانہ میں اچھے شاعر اور آج کل اللہ والے ہیں۔ بعد کو ان کے دو بھائی بھی جامعہ میں آ گئے تھے، جن میں سے ایک وادی کشمیر کے کسی جیل کے آج غالباً جیلر ہیں۔

اگ بھگ یہی زمانہ ہے کہ شیخ عبداللہ، مرزا افضل بیگ، اور خواجہ غلام محمد صادق یکے بعد دیگرے وادیٔ کشمیر سے مسلم یونی ورسٹی علیگڑھ میں تعلیم حاصل کرنے آئے۔ ایک مدت کے بعد میر قاسم صاحب، رنیز وصاحب وغیرہ نے بھی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔

صادق صاحب کا تعلق تو سرینگر کے ایک آسودہ حال گھرانے سے ہے، لیکن شیخ عبداللہ کا گاؤں اور اُن کا کچا گھر وادیٔ کشمیر میں دیکھئے، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ علی گڑھ میں انھوں نے تعلیم کیوں کر حاصل کی۔ وہ غریب کشمیری عوام کے صحیح نمائندہ ہیں، جن کے لئے افلاس ایک دردِ دل بن گیا مسلم یونی ورسٹی میں قیام نے شیخ عبداللہ کو یہ سمجھنے کا موقع دیا کہ آزادی اور سوراج کے کیا معنی ہیں اور ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔

جناب بخشی غلام محمد کا تعلق بھی ایک بے مایہ خاندان سے تھا وہ علی گڑھ تو نہیں گئے، لیکن انہوں نے سرینگر ہی میں تعلیم حاصل کی، جدو جہد کی، کھیل کھیلا، اور ہندوستان کی قومی تحریک میں کھدر کو جو اہمیت حاصل ہے اُسے محسوس کیا۔

جموں کو شخصی حکومت کی زد میں جموں و کشمیر کی اکثریت تھی، اس لیے شیخ عبداللہ کا پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ مسلم کانفرنس قائم کی جائے۔ مسلم کانفرنس قائم ہوئی اور یہ نہ صرف تعلیم یافتہ کشمیری مسلمانوں کا دھڑکتا ہوا دل بن گئی بلکہ مسلم عوام کی بھی نمائندہ اور ترجمان بن گئی۔ مسلم کانفرنس کے لیڈروں اور کارکنوں کی ابتدائی تقریریں و تحریریں پڑھئے تو یہ کسی ڈھنگ سے "ہندو دشمن" یا "پنڈت دشمن" یا "ڈوگرہ دشمن" نہیں معلوم ہوتیں۔ جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کی پہلی تجویز کا ہم نے نیشنل کانفرنس کے محفوظ ریکارڈوں میں مطالعہ کیا تو ذیل کے فقرے ملے:

"جموں و کشمیر مسلم کانفرنس ہز ہائی نس مہاراجہ کشمیر کی ریاست میں ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ مطالبہ صرف جموں و کشمیر کے مسلمانوں کا نہیں ہے بلکہ بلا امتیاز مذہب و ملت جموں کشمیر کے عوام کا ہے۔ ہم فیصلہ کرتے ہیں کہ ذمہ دار حکومت کے قیام کے لیے آئینی جدوجہد کریں گے۔"

تجویز کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ مسلم کانفرنس کے پیشِ نظر ایک فرقہ کے بجائے بلا تفریق مذہب و ملت عوام کا مفاد تھا۔

ذمہ دار حکومت کے مطالبہ پر حکومت برطانیہ کا رویہ دلچسپ تھا۔ ایک طرف تو وہ گلگت پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتی تھی، اس لیے مہاراجہ کشمیر پر دباؤ دیتی تھی، تاکہ وہ اُس کے مفادات کی تکمیل میں مانع نہ ہوں، اس لیے وہ ایک طرف تو ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کی مخالف نہیں تھی، دوسری طرف وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ذمہ دار حکومت کا مطالبہ ہندوستانیوں کے مطالبہ آزادی سے ہم رشتہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو آزادی کی تحریک جموں و کشمیر تک پہنچ جاتی اور اس کا اثر اُن صوبوں پر بھی پڑتا جو جموں و کشمیر سے متصل تھے، جہاں مسلم اکثریت تھی۔ اور یہ بات حکومت برطانیہ کی پالیسی سے کھلم کھلا

> **ہندوستان کے وفاقی آئین نے ایک مضبوط مرکز ضرور قائم کیا ہے، لیکن مرکز کو صوبوں کا یا اجزاءِ وفاق کا ڈکٹیٹر نہیں بنایا۔ پچھلے چند برسوں میں مرکز کی یہ ڈکٹیٹرانہ فرقہ پرستوں کا کلمۂ ایمان بنی اور اس سے برسرِ اقتدار پارٹی بھی مرعوب یا متاثر ہوئی۔ مرکز کی وزارتِ داخلہ یا امورِ کشمیر کی وزارت، کشمیر کی مرکزی وزارت جب تک اپنے نظریات اور عمل میں لوچ پیدا نہیں کرے گی نہ صرف کشمیر کا مسئلہ بلکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں یا ریاستوں کا مسئلہ بھی الجھا ہی رہے گا۔**

ٹکراتی تھی۔

حکومت برطانیہ کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے اِن مسلم لیڈروں کو، جو انگریزی حکومت کے دوست یا اس سے کسی وجہ سے وابستہ تھے، کشمیر کے معاملے سے براہِ راست دلچسپی لینے پر آمادہ کیا۔ حالات ایسے تھے کہ شیخ عبداللہ بھی اِن غیر کشمیری مسلم لیڈروں کی بات سننے پر آمادہ کر دیئے گئے۔ اُن کا رابطہ ہندوستان کی عوامی لیڈرشپ سے برائے نام ہی تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، اور پنڈت نہرو کشمیر کی عوامی زندگی سے کافی دُور تھے۔

مہاراجہ کشمیر دُور اندیش ہوتے تو شیخ عبداللہ اور اُن کے ساتھیوں سے اچھے تعلقات قائم کر کے، حکومتِ برطانیہ کے دباؤ کو رد کر سکتے تھے لیکن وہ سمجھے کہ حکومتِ برطانیہ کی سنگینوں کا مقابلہ کشمیریوں کی عوامی رائے نہیں کر سکتی، وہ ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کو اپنے شخصی اختیارات کے لیے بہت بڑا چیلنج سمجھنے لگے۔

شیخ عبداللہ اور اُن کے ساتھیوں کے لیے ایک مشکل اور تھی۔ سرینگر کے ایک حصہ میں مسلمانوں کے ایک طبقے نے جن کے لیڈر میر واعظ یوسف تھے، مہاراجہ کشمیر کی ہمنوائی شروع کر دی۔ میر واعظ ایک مذہبی آدمی تھے اور اپنی مذہبی پوزیشن کو انھوں نے استعمال کیا۔

یہ اندرونی و بیرونی دباؤ تھا کہ شیخ عبداللہ مجلسِ احرار کی تحریک کا فیاضی سے خیر مقدم نہ کر سکے۔ معاملات کی کچھ حدیں تھیں جن کی پابندی شیخ صاحب نے ضروری سمجھی۔ انھیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ مجلس احرار کشمیر کے معاملات میں دخیل ہو گئی تو خود کشمیر کی لیڈرشپ کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی، اور نئی دہلی میں جو مسلمان مقتدر تھے، وہ اُن کی راہ میں حائل ہوں گے۔

نہ صرف انگریزی حکومت بلکہ مہاراجہ کشمیر کے لیے بھی وہ بہت پُرادبِ

تھا جب ہندوستان رہا۔ ریاستوں کے عوام کی تحریک شروع ہوئی۔ اور اس سے پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے قومی لیڈر دلچسپی لینے لگے شیخ عبداللہ بھی اس تحریک کے لیڈر تسلیم کئے گئے۔ اس طور پر کشمیر اور ہندوستان کی عوامی تحریک میں یکسانیت پیدا ہوئی مسلم کانفرنس کا نام جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس رکھا گیا، پنڈت شام لال صراف اور شری گردھاری لال ڈوگرہ کا نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں میں شمار ہونے لگا۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی حکومت کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ اور مہاراجہ کشمیر میں جو اختلافات شروع ہوئے تھے، گلگت میں انگریزی حکومت کا مفاد پورا ہو چکا تھا، اس لئے نیشنل کانفرنس کے ظہور کو انگریزی حکومت اور مہاراجہ کشمیر دونوں اپنے وجود کے لئے بہت بڑا خطرہ سمجھنے لگے

تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان آزاد ہوا۔ ملک کی تقسیم ہوئی، اور کشمیر کا باقاعدہ الحاق، ہندوستان سے ہوا۔ اور شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کے اصرار سے دستاویز الحاق پر دستخط ہوئے

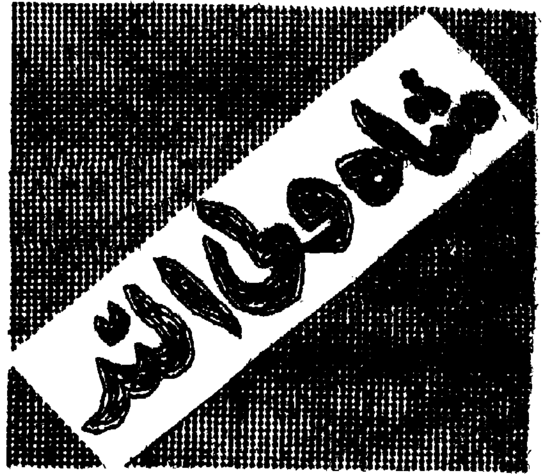
الحاق کے بعد کچھ باتیں ہمارے نزدیک قابلِ غور ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ شیخ عبداللہ کی وزارتِ عظمیٰ سے لے کر آج تک یعنی کم و بیش بیس سال کی مدت میں کشمیری عوام سے گہرے رابطہ قائم نہیں کئے گئے۔ جمہوریت اور سیکولرازم سے جموں و کشمیر کے عوام آشنا نہ ہو سکے۔ شیخ عبداللہ بھی کم و بیش پانچ سال تک برسرِ اقتدار رہے، لیکن انہوں نے بھی ہندوستان کے ترقی پسندوں کی یہ امید پوری نہ کی کہ اسلام اور مسلمانوں کی ہمہ جہتی نشو و نما میں جمہوریت اور سیکولرازم کو معاون ثابت کیا جاتا۔ مزاحم ثابت نہ کیا جاتا۔ وزارتِ عظمیٰ سے شیخ عبداللہ کی برطرفی کے بعد تو ان کے جانشینوں کا کام لے دے کر یہ رہ گیا کہ گاڑی کسی طرح چلتی رہے۔ عوام کو سیکولرازم اور جمہوریت کی سچی تصویریں دکھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔

دوسری بات یہ ہوئی کہ ہندوستان میں فرقہ پرست فسطائیت کا زور بڑھتا رہا۔ سیکولرازم کی صورت جب ہندوستان ہی میں بگڑ رہی تھی، تو جموں و کشمیر میں اس کی صورت کون دیکھتا اور کیسے دیکھتا۔ خود شیخ عبداللہ اور مرکزی حکومت میں جو اختلافات پیدا ہونے لگے۔ وہ اس لئے ختم نہ ہو سکے۔ کہ ہندوستان میں فرقہ پرستوں کا زور تھا، اور اس سے برسرِ اقتدار پارٹی بھی مرعوب تھی، ورنہ آخر کیا بات تھی کہ ۱۹۵۲ء میں جو معاہدہ ہوا تھا، اور اس سلسلے میں شیخ عبداللہ کو جو شکایتیں پیدا ہوئی تھیں، وہ دور نہ کی جا سکیں۔ شیخ عبداللہ اس حد تک تو غلط نہیں کہتے کہ وہ کشمیر کی آزادی و خود مختاری کی خاطر ہندوستان سے ملے تھے اور جب خود مختاری ۱۹۵۲ء کے معاہدے کے باوجود مجروح ہونے لگی تو ان کے لئے راہِ عمل کیا باقی رہ گئی تھی۔

مرکز اور ریاستوں میں آج جو کشمکش ہے، اس میں فرقہ وارانہ ذہنیت کو بہت زیادہ دخل ہے، لیکن آج بھی کیا غور نہیں کیا جا سکتا کہ شیخ عبداللہ کو جو شکایتیں پیدا ہوئیں، ان کی کچھ بنیاد تھی۔ یہ بنیاد بہت زیادہ مضبوط یوں بھی تھی کہ جمہوری آئین نے کشمیر کا امتیازی درجہ تسلیم کیا تھا۔ اور ۱۹۵۲ء میں ایک معاہدہ بھی ہو چکا تھا، جو تین معاملوں کے سوا کشمیر کی پوری خود مختاری تسلیم کر چکا تھا۔

ہندوستان کے وفاقی آئین نے ایک
مضبوط مرکز ضرور قائم کیا ہے۔
لیکن مرکز کو صوبوں کا یا اجزاء
وفاق کا ڈکٹیٹر نہیں بنایا۔ پھر چند
برسوں میں مرکز کے یہ ڈکٹیٹر، فرقہ
پرستوں کا کلمہ ایمان بنی اور اس
سے برسرِ اقتدار پارٹی بھی مرعوب
یا متاثر ہوئی۔ مرکز کی وزارت داخلہ
یا امورِ کشمیر کی وزارت کشمیر کی
مرکزی وزارت جب تک اپنے نظریات
اور عمل میں لوچ پیدا نہیں کرے گی
نہ صرف کشمیر کا مسئلہ بلکہ ہندوستان
کے مختلف صوبوں یا ریاستوں کا
مسئلہ بھی الجھا ہی رہے گا۔

ان حالات و واقعات سے جو بہت بڑی خرابی پیدا ہوئی، وہ یہ تھی کہ جموں و کشمیر میں جہاں مسلم وطن پروروں کا طبعی زور تھا، آج نہیں ہے، اور مختلف عناصر میدانوں میں صف آرائیاں کر رہے ہیں۔ اس صبر آزما حقیقت سے راہِ فرار اختیار نہیں کی جا سکتی۔



محدث دہلوی

بحیثیت مصنف

سید عبدالحق اصلاحی

یوں تو سرزمین ہند نے بیشمار علماء، فضلاء، شعراء، و فنکار ماہرین علم نجوم و فلکیات، ریاضی و فلسفہ، ہیئت و اشکال حرب و سیاست کو وجود بخشا لیکن اگر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بحیثیت مصنف اس سرزمین پر تشریف نہ لائے ہوتے تو ایک بڑی کمی رہ جاتی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایک انقلابی مصنف کی حیثیت سے ہندوستان میں ابھرے اور فن تصوف و فلسفہ، علم کلام، اصول حدیث، اقتصادیات و مذاہب پر نادر تصنیفات چھوڑیں۔ گرچہ شاہ ولی اللہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انکے افکار پر ابن تیمیہ، ابن قیم اور عبدالوہاب نجدی کا گہرا اثر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تصوف و شریعت کا جو جوڑ یہاں ہمیں ملتا ہے کہیں اور نہیں ملتا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے عہد کا تصوف شریعت سے کٹ چکا تھا اور اسکے طریقے قطعاً مختلف تھے لیکن شاہ صاحب موصوف اسے شریعت سے قریب لائے اور تصوف کو قرآن و حدیث کا پابند بنایا۔ اسکی یہ وجہ نہ تھی کہ شاہ صاحب نقشبندی سلسلہ سے منسلک تھے بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ قرآن و حدیث سے بڑھکر وہ کسی تصوف کے قائل نہ تھے۔ مذاہب کے بارے میں آپ نے جس اعتدال پسندی کو اپنی تصنیفات میں باقی رکھا وہ ابن رشد کے بعد آپ کے ہاں ملتی ہے۔ عرب ہو یا عجم سب ہی مذاہب اربعہ کے مختلف مکاتیب فکر میں بٹ چکے تھے اور اسکا سوال باقی نہ رہا تھا کہ فقہ کو اعلیٰ درجہ کا اجتہاد سمجھا جائے اور اسکے دائرہ کو آنے والے زمانوں کے تقاضوں کیلئے وسیع کیا جائے۔

عالم ارواح، ملاء اعلیٰ وغیرہ کی جو باتیں ہمیں شاہ صاحب کی تصنیفات میں ملتی ہیں انہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شریعت سے ہمارا رشتہ کہیں نہیں کٹتا، شاہ صاحب ملاء اعلیٰ اسکے فیصلوں اسکے اثرات کو تسلیم کرتے ہیں اور ارواح کی غیر معمولی کارفرمائی کے قائل ہیں۔ اس سے عمل کی نفی نہیں ہوتی۔ اسلئے کہ دعاؤں کے ذریعہ سے فیصلے بدلتے ہیں اور احوال کو تغیر پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب نے تصوف اور شریعت دونوں کے دائروں کو وسیع کیا۔ مذاہب کے معاملہ میں اعتدال پسندی اور اقرب الی الدین مذہب کو ترجیح دی، اور مروجہ طریقوں کو وسعت دی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کی تصنیفات کے بارے میں ہر طبقہ فکر و خیال کے لوگ محتاط رجحان رکھتے ہیں اور انہیں کسی مذہبی فرقہ کی طرف سے مذمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہندوستان میں حنفیت کا دارو دورہ تھا۔ ایک موقع پر شاہ صاحب نے کہا ہمارے آباء و اجداد حنفی المذہب تھے اور مجھے کتاب و سنت سے اجتہاد کرنے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ بھی نہیں۔

شاہ صاحب کی تصانیف زیادہ تر عربی زبان میں ہیں۔ جیسے سہل فنی اصطلاحات اور جامع الفاظ کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ تصنیف میں روانی، جدت، وضاحت، معنویت اور افہام و تفہیم کا پہلو ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مختصر الفاظ میں پوری باتیں

کہنا کچھ اتنا آسان کام نہیں لیکن شاہ صاحب غیر ضروری طوالت سے قطعاً گریزاں نظر آتے ہیں۔ اور تھوڑے الفاظ میں اپنا مفہوم ادا کر کے آگے بڑھتے ہیں۔

مذاہب اربعہ فلسفہ تفسیر اور علم کلام سے متعلق جو تصنیفیں ہمیں ملتی ہیں یا تو وہ اس درجہ مختصر ہیں کہ انکی تفسیر و تشریح کی ضرورت پیش آتی ہے یا پھر مبہم عبارت میں الجھ کر نفس مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن شاہ صاحب کی تصانیف اصل اور شرح دونوں کا کام دیتی ہیں۔

تصانیف کی سب سے بڑی خوبی وضاحت اور مثال ہے جو شاہ صاحب کے فن تحریر میں بہت عام ہے۔ شاہ صاحب جہاں کہیں ضرورت محسوس کرتے ہیں وہاں بغیر مثال پیش کئے آگے نہیں بڑھتے۔

فقہ کو کتاب و سنت سے قریب لانے، مذاہب اربعہ میں اعتدال پسندی کا رجحان اختیار کرنے اور عالم بالا اور عالم دنیا میں ربط و مطابقت پیدا کرنے میں شاہ صاحب امام ہیں۔

فلسفہ اسلامی

فلسفہ اسلامی، یونانی اور ہندوستانی فلسفہ سے کافی متاثر تھا لیکن شاہ صاحب نے اپنی تصانیف کے ذریعہ قرآن و حدیث کے فلسفہ کو مقبول بنایا اور تخمین و ظن اور شک و شبہات کی باتیں فلسفہ سے نکال کر اسے یقین محکم اور ایک مثبت پہلو بخشا۔ فلسفہ اسلامی پر شاہ صاحب کی ہمعات، سطعات، لمعات، الطاف القدس اور خیر کثیر مشہور تصانیف ہیں۔

اسرار شریعت

شریعت کے رموز و اسرار پر آپ نے جس وضاحت، یقین اور مثبت پہلو سے روشنی ڈالا ہے وہ مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ مشہور تصانیف ہیں۔

الاہیات کے سوالات بڑے پیچیدہ رہے اور ان پر اتنی بحث ہوئی کہ کچھ لوگوں نے اس پر کچھ لکھنا عبث سمجھا لیکن شاہ صاحب ایک صاف ذہن کے ساتھ یہاں بھی واضح طور پر الٰہیات کے سوالات حل کرتے نظر آتے ہیں۔ تفہیمات الٰہیہ گرچہ ایک کشکول ہے جس میں مذہبات و الٰہیات دونوں ہی ہمیں ملتے ہیں پھر بھی الاہیات پر جس قدر سیر حاصل بحث یہاں کی گئی ہے دور وسطیٰ کے علماء کے یہاں نہیں ملتی۔

تفسیر

تفسیریں عام طور پر یا تو بڑی طویل ہوا کرتی ہیں یا انتہائی مختصر۔ شاہ صاحب نے درمیانی راہ اختیار کی اور تفسیر سے متعلق اپنے تاثرات بطور نمونہ چھوڑے۔

اصول حدیث

اصول حدیث پر سلف صالحین کی کئی تصنیفات ملتی ہیں۔ شاہ صاحب نے بھی موطہ امام مالک سے متعلق اصول حدیث کی کچھ تشریحات کی ہیں جنکی فارسی اور اردو شرحیں دونوں ہی دستیاب ہیں۔

بدعات و شرک

شاہ صاحب کے دور میں بدعات و شرک کا بڑا زور تھا اور شرک کی نزاکت اور بدعات کی طرف لوگ متوجہ نہ تھے۔ ان موضوعات پر شاہ صاحب نے البلاغ المبین، تحفہ المبین، تحفۃ الموحدین جیسی یادگار تصانیف چھوڑیں جن میں پوری طرح واضح کیا کہ شرک کیا ہے۔ بدعت کسے کہتے ہیں اور اصل اسلام کیا ہے۔

مذاہب اربعہ میں محاکمہ

مذاہب اربعہ میں کس طرح تطبیق دی جائے اور قیاس کو کتاب و سنت سے کسطرح قریب لایا جائے اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے فقہیات میں اظہار خیال کیا ہے اور ہندوستان میں مذہب کے چار تصور کو وسعت بخشا۔ اور کتاب و سنت سے اجتہاد کو ترجیح دی۔

تصوّف

تصوف کا سوال بڑا ہی اہم تھا جس پر ایک صاحب شریعت قلم اٹھائے لیکن شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ ثابت کیا کہ شریعت سے بڑھکر کوئی تصوف نہیں، شاہ

صاحب نہ تصوف کے منکر رہے اور نہ متقشف فقہا کو تسلیم کیا۔ شاہ صاحب اعلیٰ تصوف اسی کو کہتے ہیں جو قرآن و سنت کے ساتھ ہو اور جس میں عملی زندگی سے کنارہ کشی نہ اختیار کی جائے۔ شاہ صاحب نے ہمعات نامہ میں تصوف پر سیر حاصل تبصرہ چھوڑا۔

الٰہیات

الٰہیات سے متعلق مشہور مصنفین شیخ ابن عربی کی وحدۃ الوجود اور مجدد الف ثانی کی وحدت الشہود کے لفظی اختلافات مٹا کر دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی۔ برہمن اور آریائی طرز فکر کو واضح کیا اور ثابت کیا کہ الٰہیات کے سلسلہ میں اسلام سے بڑھ کر صاف اور واضح موقف کہیں اور نہیں مل سکتا۔

اساتذہ

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے اساتذہ کے بارے میں کچھ لکھا اور فیوض الحرمین فی مشائخ الحرمین میں سیر حاصل تذکرہ چھوڑا۔ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں بھی کافی گفتگو کی ہے۔

علم کلام

شاہ صاحب کا زمانہ یونانی طرز فکر و فلسفہ کا شکار تھا جو فقہ پر بھی غالب آچکا تھا۔ شاہ صاحب نے علم کلام پر اپنے رجحانات دیکر اس بگاڑ کو ختم کیا۔

سیاسی رجحانات

شاہ صاحب نے اپنے سیاسی رجحانات سے متعلق یادگار خطوط چھوڑے جنہیں یہ بتایا کہ اسلامی سیاست کیا ہے اور کتاب و سنت کی روشنی میں ریاست عوام اور حقوق اللہ و حقوق العباد کو کسطرح ادا کیا جاسکتا ہے۔ شاہ صاحب نے مغلیہ دور حکومت پر سخت تنقیدیں کی ہیں اور لکھا ہے کہ یہ لوگ اسلام سے بہت دور نکل چکے اور انکے رجحانات ملوکیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مغلوں کی سیاسی فرماں روائی کو وہ پسند نہیں فرماتے تھے اور روہیلوں کو انکی حمایت حاصل تھی۔

حدیث کی تعلیم کا نیا طریقہ

درسی طرز پر حدیث کی تعلیم کا نیا طریقہ شاہ صاحب کا مرہون منت ہے اور ان پر ہی ختم ہوتا ہے۔ حدیث کی تعلیم دور شاہ صاحب سے شروع ہوا اور یہیں سے رواج بنا۔

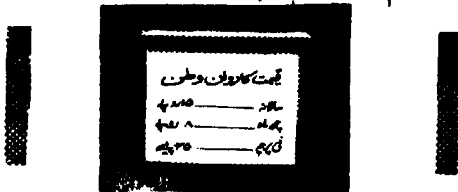
کلام پاک کا ترجمہ

فقہ اور فلسفہ کی تعلیم ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں کافی سمجھی جاتی تھی۔ شاہ صاحب نے اس طریقہ کو کافی نہیں سمجھا اور کلام پاک کا فارسی ترجمہ (فتح الرحمٰن) لکھا۔

اقتصادیات و معاشیات

اقتصادیات و معاشیات کا بابا آدم آج مارکس کہلاتا ہے حالانکہ مارکس کا دور شاہ ولی اللہ کے بہت بعد ہے مارکس سے بہت پہلے شاہ صاحب مرحوم نے ابتغاء الرزق اور ارتفاقات کے ابواب میں بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ سماج کے مفاد میں کس ڈھنگ کی عوامی اقتصادیات کی بنیاد ڈالی جاسکتی ہے۔ شاہ صاحب اقتصادیات کے پہلے مفکر ہیں جنھوں نے اسے سماجی اور عوامی سانچہ میں ڈھالنے کا نظریہ دیا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایک چراغ راہ، ایک مشعل ایک منارہ اور سنگ میل کی حیثیت سے نہ صرف ہندوستان کے علم و فن کے ارتقار کی منزل سمجھے جاتے ہیں بلکہ مغربی مفکرین بھی ان کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے مذہب اسلام و دیگر مذاہب کے اکثر و بیشتر اہم مسائل کا تقابلی جائزہ لیا اور واضح کیا کہ طبعی مسائل ہوں یا مابعد الطبعی دونوں میں مثبت اور حقیقت پسندانہ رجحانات کیا ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اہل اسلام کے فن کو بڑھا دیا اور اپنے تازہ اور جان دار فکر سے اسے تابناک بنایا۔ الٰہیات اور عالم ارواح کا مطالعہ بحیثیت فن ختم ہو رہا تھا جسے شاہ صاحب نے ازسر نو زندہ کیا اور بحیثیت فلسفی ماہر الٰہیات، ماہر علم کلام، مفسر محدث، ماہر اقتصادیات سیاسی مفکر اپنی نہ بھلائی جانی والی یاد اہل علم و فن میں چھوڑی۔



پروفیسر

عبدالباری



۱۹۲۰ء میں کالج چھوڑا، تحریک ترکِ موالات میں شریک ہوئے، بہار ودیاپیٹھ میں پروفیسری کی اور دنیا اگرچہ انہیں بھول رہی ہے۔ مگر قومی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ضدی تھے، فسادی تھے۔ ہندوستان کی آزادی سے کچھ ہی مہینے پہلے، جب بہار میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی، انہیں کسی فرقہ وارانہ مسئلہ کے سلسلہ میں نہیں بلکہ سرِ راہ گولی مار دی گئی اور ۲۸ مارچ ۱۹۴۷ء کو شہید ہو گئے۔ گاندھی جی کی شہادت سے کچھ ہی پہلے، ایک شہید اور تھا، جس کا نام عبدالباری تھا۔ ان کی شہادت پر گاندھی جی کا بیان آیا کہ پروفیسر باری کی شہادت میں کسی سازش کو دخل نہیں ہے، اس لئے دنیا خاموش رہی۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ باری صاحب کی شہادت کے اسباب و محرکات کیا تھے۔ ان کا وجود کئی عناصر کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرساد بہار پراونشیل کانگریس کے صدر رہتے تھے۔ جب مرکزی حکومت میں آئے تو باری صاحب بہار کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ بہار کے ذات پرست لیڈر ان سے خفا تھے، وہ بھی ذات پرستوں سے بیزار تھے۔ ان کی شہادت سے پہلے یہ خبریں آئی تھیں کہ ان کی کار کا تعاقب سرمایہ داروں کے دلال اور ایجنٹ کرتے ہیں۔ فرقہ وار فسادات کے سلسلہ میں باری صاحب کا مطالبہ یہ تھا کہ بہار کی کانگریسی وزارت برطرف کی جائے۔ اس لئے ان کی موت یقیناً دفعتاً واقع ہوئی، اور وہ المناک حادثہ بھی تھی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہار کے مزدوروں کا پہریدار اور نڈر رہنما۔ کارخانہ داروں، سرمایہ داروں اور ذات پرستوں کے نرغے میں آ گیا۔

آج کہ گاندھی جی کی موت کے اسباب و علل کی جانچ کرائی جا رہی ہے، کیا کوئی ہے جو باری مرحوم کی موت کے اسباب و علل کی جانچ کرائے۔؟ ہم کوئی نیا فتنہ برپا نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ انصاف پسندوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ باری صاحب کی شہادت کی تحقیقات کرائی جائے جو ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا اہم واقعہ ہے کم و بیش بیس سال بعد ہمارے مطالبہ کو زائد المیعاد قرار دیا جائے گا لیکن انصاف کے لئے کوئی مانگ زائد المیعاد نہیں ہو سکتی۔

پروفیسر باری فرقہ پرست تنظیموں کے آغاز کار سے دشمن تھے۔ انہوں نے نیشلسٹ مسلمانوں کی تنظیم کو بھی برا سمجھا ان کے لئے قومی جدوجہد کے سلسلہ میں کانگریس کا محاذ سب سے بڑا محاذ تھا۔ وہ کانگریسی سوشلسٹوں کے بہت قریب تھے بلکہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کو جنم دینے والوں میں ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ شخص جے پرکاش نارائن سے بھی اختلاف رائے کرتے تھے کہ کانگریس میں کسی قسم کی گروہ بندی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن کانگریس کو قومی محاذ سمجھ کر مزدوروں کے لئے انہوں نے جو مجاہدے کئے اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ بہار کے مزدور علاقوں میں ان کے نام کی آج بھی پرستش کی جاتی ہے۔ مزدوروں کا خیال تھا کہ سرمایہ دار اور کارخانہ دار، بڑے سے بڑے لیڈر کو خرید سکتے ہیں، لیکن پروفیسر باری نہیں خریدے جا سکتے۔ سرمایہ داروں نے ان کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنی چاہی لیکن باری ہندوستان کے انمول رتن تھے، انہوں نے راج کیا مزدوروں پر جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، آدی باسی سب ہی تھے۔

وہ فرقہ پرست تنظیموں سے بیزار تھے، لیکن اقلیتوں کے لئے جان کی بازی لگانے کا موقع آ جائے تو ان کی شان یہ تھی کہ بہار کے فرقہ وار فسادات کے سلسلہ میں انہوں نے کانگریسی وزارت کی برطرفی کا مطالبہ کیا، اور اس طور پر اپنے دوستوں میں بے شمار دشمن پیدا کر لئے۔ یہ مطالبہ اس وقت کیا جب بہار پراونشل کانگریس کے وہ صدر تھے۔ ان کی ایک لڑائی یہ تھی کہ کانگریسی وزارت کانگریس کی تنظیم پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کانگریس کی تنظیم کو وزارتوں پر حاوی ہونا چاہئے۔ باری صاحب کا یہ نقطۂ نظر ایسا تھا جس نے سیاست کے اونچے ایوانوں کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔

بقیہ صـ ۳۴





رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۲۰ کی تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت میں ایک نئی زندگی، ایک نیا کیف پیدا کیا۔ ان کی قیادت، مسلمانوں کی ملی زندگی کا جو کھار رنگ تھی۔ جیسے مہاتما گاندھی نے کھلی آنکھوں سے دیکھا اور کھلے دماغ سے سمجھا۔ ان کی مجاہدانہ قیادت نے مسلم قیادت کے بڑے بڑے بتوں کی گردنیں جھکا دیں۔ سر آغا خاں مرحوم اپنی دولت و ثروت کے باوجود گردِ کارواں بن گئے۔ مسٹر محمد علی جناح نے پسپائی اختیار کر لی۔ سر شفیع کے قدم اکھڑ گئے اور 'باپو' یعنی مہاتما گاندھی مولانا محمد علی یا بالفاظ صحیح تر 'علی برادران' کی جیبوں میں رہنے لگے۔

مولانا محمد علی آکسفورڈ (انگلستان)، کے 'بی' اے تھے، انگریزی زبان ایسی لکھتے تھے کہ بڑے بڑے انگریز قلم کاران کا ادب کرتے تھے۔ ایسے خطیب تھے کہ حکومت برطانیہ کے مشہور لبرل وزیر اعظم مسٹر لائیڈ جارج کی خطابت، ان کی خطابت کے آگے شرماتی تھی۔ کلکتہ کانگرس کے اجلاس خصوصی میں جو ۱۹۲۰ میں منعقد ہوا تھا، انہوں نے تحریک ترک موالات کی ایسی زبردست وکالت کی کہ اس زمانہ کے خدادی بنگالی خطیب جن کا ہندوستان میں ڈنکا بجتا تھا راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان کی حق گوئی نے مسٹر سی۔ آر۔ داس کو تحریک ترک موالات کا مخلص حامی بنایا۔ ورنہ انگریزی حکومت سے اس طریق جنگ کو جس کا نام ترک موالات تھا، مسٹر سی۔ آر۔ داس پسند نہ فرماتے تھے۔ مولانا محمد علی کا ہفتہ وار 'کامریڈ' دنیا بھر کے انگریزی اخباروں اور جریدوں میں رہنمائی کا بلند ترین مقام حاصل کر چکا تھا۔ ان کی سامراج دشمنی، سے سلطنت برطانیہ کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ کوکناڈا کانگرس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے جو خطبۂ صدارت پڑھا وہ ادبیت، انشاپردازی، خیال آفرینی، صاف بینی اور بر وقت رہنمائی کے لئے کانگرس کی کم و بیش ۸۰ سالہ تاریخ میں بے مثال ہے۔ کانگرس کے کسی صدر کے خطبہ میں وہ آب و رنگ نہیں ملتا جو مولانا محمد علی کے خطبہ میں ہے۔

۱۹۲۰ سے لے کر ۱۹۳۰ تک مولانا محمد علی جوہر کی قیادت قومی زندگی کا نیا شباب، رعنائی اور حسن بنی رہی۔ واقعات نے پلٹا کھایا۔ شدھی سنگھٹن اور تنظیم و تبلیغ کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ بڑے بڑے لیڈروں نے جیلوں میں سازشیں کیں۔ فرقہ وار فسادات بھی ہوئے، ایک ہمہ گیر سازش جسے اس زمانہ تک زبان نہیں ملی تھی، یہ تھی کہ محمد علی کی قیادت ہندوستان پر مسلط ہو گئی تو ہندی مسلمان ہندوستان پر مسلط ہو جائے گا۔ اور یہ وہ خطرہ تھا جو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

محمد علی کو الزام دیا گیا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرانے کی سازش افغانستان سے کر رہے ہیں۔ محمد علی نے اس الزام کی ایسی فیصلہ کن تردید کی کہ یاروں کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان پر جو ملک جارحانہ حملہ کرے گا، اس کا منہ توڑ جواب دینا، محمد علی اور ہر ہندی مسلمان کا مذہبی فریضہ ہوگا۔ پھر فرمایا گیا کہ جب تک قرآن موجود ہے، ہندو مسلم اتحاد نہیں ہو سکتا۔ محمد علی نے جواب دیا اتحادِ عالم قرآن حکیم کا مقصد عظیم ہے۔ اور صلح و سلام قرآن کا ابدی و سرمدی پیغام ہے۔

سازشیں خلوت و جلوت میں پکتی رہیں۔ اور محمد علی سازشوں کا توڑ کرتے

بقیہ صـ۳۳

رفیع احمد قدوائی



جناب رفیع احمد قدوائی، گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو ہوں یا نہ ہوں، فیصلے کرنے اور فیصلے منوانے میں وہ سب پر بھاری تھے۔ اور ایڈمنسٹریٹر ایسے تھے کہ صف اول کے لیڈران سے مرعوب تھے۔ پنڈت نہرو کے دماغ سے جغادری آئی۔ سی۔ ایس۔ افسر خم کھاتے تھے۔ لیکن قدوائی صاحب کے دماغ اور عمل سے لرزتے تھے۔ ہند سرکار اور یو۔پی سرکار کی کئی وزارتیں ان کے سپرد کی گئیں۔ لیکن جب بڑے افسروں سے کہا گیا کہ قدوائی صاحب کی وزارت میں کام کرو تو وہ گھبرا گئے۔ ان کی وزارتیں بڑے افسروں کا امتحان گاہ تھیں۔ جو پاس کر گیا وہ اونچا گیا۔ ایک ذمہ دار آئی۔ سی۔ ایس افسر نے جو آج بھی مرکزی سکریٹریٹ میں اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہے ہیں ہم سے کہا کہ تفصیلات پر جیسی نگاہ قدوائی صاحب کی تھی، کسی وزیر کی نہیں تھی۔ انہی کی رائے ہے کہ وہ وزیر تو تھے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری، اسسٹنٹ سکریٹری بھی تھے۔

وزیر کی حیثیت سے کانگرس کی پالیسیوں پر جس طرح انہوں نے عمل کیا اور کرایا، اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ جس وزارت خوراک میں بڑے بڑے وزیر ناکام رہے، اس میں ان کی کامیابی کانگرس کے دور اقتدار کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے۔ ہر معاملہ میں پہل اور اقدام کرتے تھے اور کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔

ان کی نجی زندگی پر موٹی موٹی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی سیاسی اختلاف میں شدت تھی، لیکن دل ایسا تھا کہ اپنے بدترین مخالف کی بروقت مدد کرتے تھے۔ پالیمنٹری جمہوریت کا یہ دستور ہے کہ اپوزیشن پارٹیاں بھی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں ہونی چاہئیں، اور برسر اقتدار ہونے کے باوجود اس دستور کا اتنا خیال کیا کہ اپوزیشن پارٹیوں کی مالی مدد کی۔

جمہوری دور میں وزیروں سے ملنا ایک مشکل معاملہ ہے۔ ملنے والوں کے لئے پرائیویٹ سکریٹری نہایت گستاخ دربان کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن قدوائی صاحب کے یہاں عام آدمی کے لئے ملاقاتوں میں جو آسانیاں تھیں، کسی مرکزی وزیر کے یہاں نہیں تھیں۔ ان کے پرائیویٹ سکریٹری یو۔ پی کے ایک زندہ دل نوجوان تھے اور اس معاملہ میں وہ قدوائی صاحب کے مزاج داں تھے۔ اس لئے ملاقاتوں کے معاملہ میں انہوں نے کبھی "گستاخ دربان" کا پارٹ ادا نہیں کیا۔ مزاج کے خلاف کوئی بات ہوتی تو فوراً خفا ہو جاتے۔ لیکن فوراً پسیج بھی جاتے۔ ایک مسلم اخبار نویس سے اس بات پر خفا ہو گئے کہ وہ ان کے مشورہ کے مطابق چھوٹی چھوٹی سرکاری ملازمتیں قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اخبار نویس بھی منچلا تھا اس نے قدوائی صاحب کے یہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے یہاں خود پہنچے اور موٹے موٹے آنسوؤں سے معذرت چاہی۔ اپنی زندگی کی آخری ساعت تک وہ اخبار نویس کے مخلص رہے اور اس کی سفارت کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قدوائی صاحب زندہ ہوتے تو اخبار نویس کی سفارت کہیں گئی نہیں تھی۔

قدوائی صاحب نماز فجر کے معمولاً پابند تھے۔ ان کی دیش بھگتی جو "کرہن" کی حد تک پہنچ چکی تھی، یاد الٰہی میں کبھی مخل نہ ہوئی۔ ان سے ملاقات کا بہترین وقت وہ تھا جب وہ نماز فجر کے بعد سیر فرماتے، ان کی طبیعت اس وقت شاداب ہوتی اور خوب باتیں کرتے۔ جن میں لطائف و ظرائف کی افراط ہوتی۔ خود چھیڑتے اور دوسرا چھیڑتا تو لطف اندوز ہوتے۔

سیاسی زندگی میں ان سے بڑا نقاد ہم نے دیکھا نہیں۔ ایک مرکزی وزیر کا نام انہوں نے "بیسک انگلش" رکھا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ انگریزی زبان واجبی ہی جانتے ہیں اور فائلوں پر نوٹ بھی اپنے پرائیویٹ سکریٹری اور سکریٹریوں سے لکھواتے ہیں۔ کابینہ میں جب گرما گرم بحثیں ہوتیں تو قدوائی صاحب کوئی ایسا فقرہ چست کر دیتے کہ بڑے بڑے منطقی جھینپ جاتے۔

ان کی عنایتوں نے جن سنگھیوں اور ہندو مہاسبھائیوں کو بھی نوازا۔ مسلم لیگیوں سے وہ چڑتے تھے، لیکن ان پر کوئی وقت پڑا ہو، تو ان کے آڑے آتے اور دل کھول کر ان کی مدد کرتے۔ ایک زمانہ میں یو۔پی کی وزارت کے امیدوار چودھری خلیق الزماں تھے، اور دنیا جانتی تھی کہ اس معاملہ میں وہ قدوائی صاحب

کے رقیب تھے۔ لیکن ایک گھریلو مسئلہ میں چودھری صاحب کی عزت کا جب معاملہ آیا تو قدوائی صاحب نے کسی فرمائش کے بغیر ان کی مدد کی، اور سب کچھ خود اوڑھ لیا۔ گونڈا میں الیکشن تھا قدوائی صاحب کانگرسی امیدوار تھے۔ سوءِ اتفاق سے انہیں شکست ہوئی۔ لیکن وہ شکست کے بعد حلقہ انتخاب میں گئے اور اپنے مخالفوں اور حامیوں دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ مخالفوں کا اسلئے شکریہ ادا کیا کہ (انہی کے الفاظ میں) "آپ نے مجھے میرے حامیوں سے زیادہ سمجھا۔

ان کی معلومات کا یہ عالم تھا کہ وہ گاؤں کے معمولی سے معمولی پٹواری، اور بمبئی کلکتہ اور کان پور کے بازاروں کے معمولی سے معمولی دلال کو جانتے تھے۔ یہاں کی شرافت تھی (جسے کمزوری کہا گیا ہے) کہ کسی کی بیٹی شادی کے قابل ہوا ور کسی مجبوری سے شادی نہ ہو رہی ہو تو مجبور والدین کو بے دریغ روپیہ دیتے اور دلواتے ان کی جیب میں روپیہ نہ ہوتا تو نہایت جرأت سے کام لے کر کسی سرمایہ دار کو فون کرتے کہ کل بارہ بجے تک یا دو بجے تک روپیہ میری میز پر ہونا چاہئے اور کمال یہ تھا کہ قدوائی صاحب وقت مقررہ پر سرمایہ دار کو روپیہ واپس بھی کر دیتے۔

شاید وہ اپنے زمانہ کے ایسے ہی مسلمان تھے جن کے حامیوں میں مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم تھے۔ اور یہ زمانہ وہ تھا، جب ابوالکلام اور قدوائی کا نام فرقہ پرستوں کے لئے ایک مستقل "اشتعال" بن چکا تھا۔

جہاں مسلمان اہل ہو، اس کے لئے انہوں نے اونچی سے اونچی سطح پر جنگ کی اور فتح پائی۔ شرط صرف یہ تھی کہ انہیں یقین ہو جائے کہ مسلمان اہل ہے۔ یا اس کا مقدمہ سچا ہے۔

علی گڑھ کے روایتی کھلنڈروں کا مزاج ہم جانتے ہیں، اس لئے ہم نے نہایت المناک لمحوں میں انہیں کھلنڈرا دیکھا ہے۔ چھیڑ دینا، طنز و تعریض کے تیر برسانا مسکرانا، وار کرنا اور وار بچانا ان کی عادت تھی۔

سردار پٹیل کے بعد شاید ہندوستان کے کامیاب ترین وزیر داخلہ وہ ہوتے، اور آخر کوئی سبب ہی تھا کہ موت سے کچھ ہی پہلے ہندوستان کے آنے والے وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کا نام آنے لگا تھا۔ ہندوستان کے لئے انہوں نے اتنا کیا کہ وہ ہندی مسلمانوں کے کردار کی ضمانت بن گئے۔ رہتی دنیا تک ہندوستان فراموش نہیں کر سکتا کہ اس کی خاک سے ایک رفیع احمد قدوائی پیدا ہوا تھا۔

ان کی موت اس وقت آئی جب ہندوستان کو ان کی ضرورت تھی۔ بے وقت موت کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کی موت صحیح معنوں میں بے وقت تھی۔ قدرت کی ان بوجھی مصلحتوں کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے لیکن قدوائی صاحب کا یکایک ہم سے چھن جانا، ایک ایسا زخم ہے جو کبھی مندمل نہیں ہو سکتا۔

اخلاص، سچائی، اونچے کردار کا وہ جوہر لطیف تھے۔ اور اگرچہ مسکرانا ان کی عادت تھی۔ لیکن ان کی موت نے پورے ہندوستان اس کے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور پارسیوں کو رلایا، اور ان کی یاد میں آج بھی ہندوستان روتا ہے۔ ان کی موت اس حال میں آئی کہ انہوں نے دولت جمع نہیں کی۔ بلکہ ایک لاکھ کے مقروض مرے۔ یہ قرض غریبوں، محتاجوں، ناداروں، تباہ حال شریفوں، بیواؤں اور یتیموں کے لئے لیا گیا تھا۔

آہ اور واہ قدوائی! ان کی موت آہ تھی، ان کی زندگی واہ تھی۔

کون ہے ان کا ساز مانہ میں۔

بقیہ محمد علی جوہر

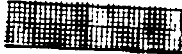
ہے۔ لیکن ان کی سب سے بڑی مایوسی یہ تھی کہ ان کے رفقائے سفر نے انہیں نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ نہرو رپورٹ آئی، اور یہ نازک مقام وہ تھا جہاں پرانی بدگمانیوں نے شخصی پندار کو بے لگام کر دیا۔ مولانا محمد علی ان دنوں ہندوستان میں نہ تھے۔ بڑے بھائی مولانا شوکت علی نے غلط یا صحیح محسوس کیا کہ اس زمانہ کی قومی لیڈر شپ نے ان کی توہین کی۔

مولانا محمد علی غالباً بڑے بھائی کے نقطۂ نظر سے متفق نہ تھے۔ لیکن بڑے بھائی کا معاملہ تھا، بددل ہوئے، خاموش خاموش سے رہنے لگے۔ بہرحال محمد علی ان لوگوں میں سے نہ تھے، جو بڑی محنت سے بنائی ہوئی لیڈر شپ سے ہندی مسلمانوں کو محروم ہونے دیتے۔ انہوں نے لاہور کانگرس میں کانگرسی صدروں کے جلوس میں حصہ لیا، ان کا لمبا چغہ، ان کی ڈاڑھی، ان کی ٹوپی، ان کی معجزانہ انفرادیت کا اعلان کر رہی تھی۔

لندن میں گول میز کانفرنس ہوئی۔ وہاں مولانا محمد علی نے انگریز سیاست دانوں کے دانت کھٹے کر دئے۔ جب یہ اعلان کیا کہ "یہ نہ سمجھو کہ لنگوٹی پوش گاندھی سے میرا اختلاف آزادی کے سوال پر ہے۔ آزادی میں یہاں سے لے کر جاؤں گا۔ یا ہندوستان سے باہر کہیں دفن ہو جاؤں گا۔

اور وہ بیت المقدس (فلسطین) میں دفن ہو گئے۔ مولانا محمد علی جوہر کی بے وقت موت کے بعد ہندوستان میں کوئی ایسا عوامی لیڈر نہیں رہ گیا تھا، جو رجعت پسندی کا مقابلہ کرتا اور مسلمانوں کے مذہبی شعور کو آزادیٔ وطن کے جذبہ سے ہم آہنگ کر دیتا۔ مولانا محمد علی ہی کے زمانہ میں مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر پیدا ہونے لگے تھے لیکن مولانا محمد علی کی جو مغربیت اور مشرقیت سامراج کے لئے ایک خطرناک چیلنج بن کر آئی تھی، اسے زیادہ مضبوط اور قوی بنانے کی ہمت بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی تھی۔ حق یہ ہے کہ مولانا محمد علی کی بے وقت موت سے جو جگہ خالی ہوئی وہ آج تک پر نہ ہو سکی۔

عجیب انجام ہوا اس قائد فکر و عمل کا جس کا نام محمد علی جوہر تھا جس نے نئی روشنیں قائم کیں، نئی راہیں پیدا کیں، اور اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے سپردِ خاک ہو گیا۔



خان عبدالغفار خان



ان سا صاحب کردار ہم نے اس زمانہ میں کہیں دیکھا نہیں، سچے مسلمان ہیں، اور ہندوستان و پاکستان میں ان سے بڑا آدمی ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہمیں تو ملا نہیں۔ لوگ حق پرستی کے دعوے کیا کرتے ہیں۔ وہ عملاً، قولاً، عقیدتاً حق پرست ہیں، حق پرستی کی آن ہیں، جان ہیں، مجسمہ ہیں۔ کبھی بڑا بننے کی کوشش نہیں کی، بڑا پن انہیں بن مانگے ملا۔

اتمان زئی (صوبہ سرحد) کے رہنے والے ہیں، خدائی خدمت گاروں کی تنظیم کی۔ اور سرحد کے پٹھانوں میں بلکہ مسلمانوں میں وہ زندگی پیدا کی، جو گاندھی جی ہندوؤں میں نہ پیدا کر سکے۔ سرحد ملک پچھڑا ہوا علاقہ سمجھا جاتا تھا، اور پٹھانوں کو وحشی اور درندہ سمجھ کر، اصلاحات کے نفاذ کی مخالفت کی جاتی تھی۔ صوبہ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کی مخالفت صرف انگریز ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ اس زمانہ کے ہندو لیڈر بھی کرتے تھے۔ خان عبدالغفار خاں کا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ ہندوستان میں سرحد کا صوبہ بنا اسے ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا مساوی درجہ دیا گیا۔ خانصاحب کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ جن سرحدی پٹھانوں کو ہندوؤں کا عام طور سے دشمن سمجھا جاتا تھا، انہیں دوست سمجھا گیا۔ گاندھی جی اور خان عبدالغفار خاں کی رفاقت کی یہ ایک دین تھی۔

انگریز حکومت پٹھانوں سے سخت بیزار تھی۔ سرحد اور علاقہ آزاد میں ایک زمانہ سے آزادی کی لڑائی جاری تھی۔ کبھی جہاد کیا جاتا تھا، کبھی انگریز کی فوجی چھاؤنیوں پر چھاپے مارے جاتے تھے۔ سچ پوچھ کر سرحد کے پٹھانوں نے اپنی آزادی کی جنگ کم و بیش سو سال تک جاری رکھی

اس زمانہ کے مسلم لیڈروں نے بہادر پٹھانوں کو دسمجھا۔ اور انگریز نے ان کے مجاہدوں کو ختم کرنے کے جو منصوبے بنائے، انہیں دیکھتے رہے کہ سرحدی پٹھان درندہ ہے، انگریزوں سے خواہ مخواہ ٹکراتا ہے۔ انگریزوں کے اس لغو پروپیگنڈے کا بھی انھوں نے یقین کر لیا کہ سرحدی پٹھان انگریز میموں کی بے عزتی کرتا ہے۔

اور جب مسلم لیڈروں اور جماعتوں نے سرحدی پٹھانوں سے انصاف نہ کیا تو خان عبدالغفار خاں نے کانگریس اور گاندھی جی سے رجوع کیا، جہاں انہیں ہمدردی ملی۔ خان عبدالغفار خاں نے اصول عدم تشدد کی تائید کی، اس کا پس منظر ایک تو یہ ہے کہ وہ اسلام کو امن و اسلام کا پیغامبر سمجھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جن سرحدی پٹھانوں کو خونخوار اور دشمن امن ثابت کیا گیا تھا، وہ انہیں امن پسند ثابت کرنا چاہتے تھے۔ خانصاحب کا اصول عدم تشدد، بودھ دھرم اور جین دھرم کا اہنسا نہیں تھا بلکہ سرحدی پٹھانوں کی امن پسندی کا اعلان تھا۔ اور اس اعلان کی انگریز سامراج کی غلط بیانیوں اور ہندوستانیوں کے ایک بڑے طبقہ کی غلط فہمیوں کے پیش نظر ضرورت تھی۔ حیرت یہ ہے کہ خان عبدالغفار خاں کی امن پسندی نے سرحدی پٹھانوں کے لئے جو جنگ جیتی تھی، وہ حصول آزادی کے بعد شکست سے بدل گئی، ۱۹۴۷ء میں جب آزادی آئی۔ تو خان عبدالغفار خاں اور ان کے سرحدی پٹھانوں کو ان لوگوں کے سپرد کانگریسی لیڈروں نے کر دیا جن کے خلاف انہوں نے ایک زبردست مہم برسوں تک آراستہ کئے رکھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ کانگریسی لیڈروں کی مجبوریاں تھیں، اور جب ہندوستان کی تقسیم انہوں نے گوارہ کر لی تو خان عبدالغفار اور ان کے پختونستان کی خبر کون لیتا۔

حالات کے مطالعہ کی بنا پر ہمار ۔۔۔ یہ ہے کہ خان عبدالغفار خاں مہاتما، درویش، قلندر سب ہی کچھ تھے۔ مگر سیاستداں شاید کم تھے "سرحدی گاندھی" ضرور کہلائے، لیکن ان میں اور گاندھی جی میں فرق یہ تھا کہ گاندھی جی مہاتما ہونے کے باوجود بہت بڑے سیاست داں تھے۔ اور ان کی سیاست دانی بھی نیک نفسی سے پیدا ہوتی تھی، لیکن خان عبدالغفار خاں میں یہ بات نہ تھی۔ ان کی اور ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خانصاحب کی سیاسی ناکامی کا دور اس وقت شروع ہو گیا تھا، جب آزادی سے پہلے انہیں ایک بار مسلم لیگ نے شکست دی۔ سردار پٹیل کی دوربینی نے بہت پہلے دیکھ لیا تھا کہ خان عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خانصاحب عبدالقیوم خاں کی سیاست کاری کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اور بری طرح مات کھائیں گے، یہی ہوا۔

آزادی کے بعد ایک طرف تو یہ ہوا کہ ان کے پرانے ساتھیوں نے انہیں چھوڑ دیا۔ دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ خان بھائیوں کی راہیں دو ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر خان صاحب نے ایک نئی پارٹی بنائی، برسر اقتدار آئے اور قتل کر دئے گئے۔

خان عبدالغفار خاں نے اپنی وضع داری نہ چھوڑی۔ انہوں نے پاکستان سے وفاداری کا حلف تو ضرور اٹھایا مگر مسٹر محمد علی جناح اور ان کے جانشینوں سے ان کی اَن بَن رہی۔ لوگ اسے خان صاحب کی اصول پسندی اور مقصد پسندی کہتے ہیں ہم اسے ان کی سیاست کی کمزوری کہتے ہیں۔

یا یہ ہوتا کہ خان عبدالغفار خاں درمیان کا آدمی پاکستان پر راج کرتا، یا یہ ہوتا کہ وہ درویشی اور قلندری کا حق ادا کرتے۔ اور پاکستان ان کی پرستش کرتا

بقیہ صفحہ ۔۔

مہاتما گاندھی



ہمارے بیان میں سو فی صدی سچائی ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انگریز سامراج کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلم لیڈروں نے "ہندو مسلم اتحاد" پر جان کی بازی لگائی۔ لیکن گاندھی جی بیسویں صدی میں پہلے لیڈر تھے جو افغانی تھا اور مسلم ممالک کے مفروضہ حلے سے بالکل بے پرواہو کر میدان عمل میں آئے اور علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد مسیح الملک حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر مختار انصاری کے مخلصانہ تعاون سے ایک عظیم الشان قیادت کی رفیع الشان عمارت بنائی جس کا نام "ہندو مسلم اتحاد" یا "قومیت متحدہ" تھا۔

گاندھی جی کی سنہ ولادت یا سنہ وفات یاد ہو یا نہ ہو، اتنی بات تو عقل سلیم کو ضرور یاد ہے کہ ان کی ولادت کی گھڑی نیک تھی، اور اگرچہ وہ شہید وطن کہلائے مگر ان کی موت کی گھڑی نحس تھی۔ اس اعتبار سے نحس تھی کہ انہیں ابھی اور جینا تھا۔

وہ یو۔پی یا بہار میں پیدا نہیں ہوئے تھے جہاں مسلمانوں کی تاریخی و تہذیبی اہمیت تسلیم کی جاتی تھی، بلکہ ایک ایسے علاقہ میں پیدا ہوئے تھے جہاں مسلمان موجود تھے اور ان کی آسودہ حالی بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی تھی لیکن وہ آبادی کے مختلف طبقوں میں برابری کا درجہ نہیں رکھتے تھے۔ اس ماضی کے باوجود گاندھی جی نے ہندو مسلم مسئلہ کی جو اہمیت سمجھی، وہ نئی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اور یہ اہم ترین واقعہ اس واقعہ کے باوجود ہے کہ ان کی قیادت سے پہلے لوکمانیہ تلک کا طوطی بولتا تھا جو ہندو فلسفہ کی تعبیر مہاراشٹر کے ماحول میں کرنا چاہتے تھے۔ اور پنڈت مدن مالویہ کا ڈنکا بجتا تھا، جن کی سیاست، سیاست نہیں تھی "جادوئے سامری" تھی۔

محمد تغلق شیر شاہ سوری اور اکبر کے بعد شاید پہلی بار صوفیوں اور بھگتوں کی زبان گاندھی جی کی زبان بنی چشتی، کبیر، نانک کا پیغام بیسویں صدی میں گاندھی کا نام تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے اور موٹی موٹی کتابوں کے مطالعہ کے بعد صوفیوں اور بھگتوں کی زبان نہیں بنے، بلکہ خود بخود بنے۔ ان کے وجدان اور شعور نے انہیں صوفیوں اور بھگتوں کی زبان بنایا۔ دنیا نے بلکہ مسلمانوں کے ایک طبقہ نے بھی انہیں تصنع اور بناوٹ کا الزام دیا لیکن آج راقم الحروف جو بحمداللہ مسلمان ہے، اور جس نے برسوں گاندھی جی کو قرآن حکیم پڑھایا ہے۔ بلا خوف تردید کہہ سکتا ہے کہ اگر گاندھی جی میں بناوٹ تھی، تو صداقت اس بیسویں صدی میں ڈھونڈے سے، ہندوستان تو ہندوستان بسیط ارض پر نہیں مل سکتی۔

گاندھی جی سنجیدہ انسان تھے۔ ان کی سنجیدگی ایسی تھی جو صداقت کی پرستاری سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ہندو مسلم اتحاد ان کی سیاست کی ایک تدبیر تو تھا لیکن ان کا ایمان کامل، ان کا جذبۂ صادق بھی تھا۔ انگریز سامراج نے ہندوستان میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اختیار کی تھی۔ اس کی پالیسی کا توڑ، ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے علمبرداروں نے تو کیا، مگر یہ توڑ اتنا سطحی تھا کہ ناکامی ہوئی، بلکہ ہم کہیں گے کہ شیر شاہ کے پوتے کمان دار نبی بخش خاں ایسے عظیم الشان انسان کو بھی ناکامی ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ ۱۸۵۸ء میں ناکام نہیں ہوئی بلکہ ۱۸۸۰ء میں ناکام ہوئی جب پلاموں کے جنگلوں میں کمانڈر نبی بخش خاں شہید کئے گئے۔ ۱۸۸۰ء کے بعد سریندر ناتھ بنرجی، طیب جی، گوکھلے، تلک "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی سامراجی تدبیروں کا جو مقابلہ کرتے رہے، اسے زیادہ سے زیادہ کرسی نشین سیاستدانوں کی ایک نکمی "بیت بازی" کہہ سکتے ہیں۔

ہمارے بیان میں سو فیصدی سچائی ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انگریز سامراج کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلم لیڈروں نے "ہندو مسلم اتحاد" پر جان کی بازی لگائی لیکن گاندھی جی بیسویں صدی میں پہلے لیڈر تھے جو افغانی اور مسلم ممالک کے مفروضہ

حلقے سے بالکل بے پرواہ ہو کر میدان عمل میں آئے اور علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار انصاری کے مخلصانہ تعاون سے ایک عظیم الشان قیادت کی رفیع الشان عمارت بنائی جس کا نام "ہندو مسلم اتحاد" یا "قومیت متحدہ" تھا، اور جس کے صدر دروازہ پر جلی لکھا تھا: "آزاد ہندوستان کا تاج محل ہے"۔

تحریک ترک موالات کہئے یا تحریک آزادی، ان میں ایسے دور بھی آئے کہ جس تاج محل کا نام ہندو مسلم اتحاد تھا وہ کمزور بھی ہوا۔ گاندھی جی خود "ہندو مسلم اتحاد" کے علمبردار تھے لیکن ان کے ارد گرد ایسے بھی تھے جو ہندو مسلم اتحاد کو "سلطنت مغلیہ" کا بدل سمجھتے تھے اور اگر ہماری حق گوئی معاف کی جائے تو ہم کہیں گے کہ یہ کسی حد تک غلط بھی نہ تھا جہاں مولانا محمد علی، مولانا مظہر الحق بار ایٹ لا، مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مسیح الملک حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور مولانا ظفر علی خاں ہوں، وہاں سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے لئے یہ سمجھ لینا کیوں دشوار تھا کہ "ہندو مسلم اتحاد" نام ہے "سلطنت مغلیہ" کے احیاء ثانی کا۔

گاندھی جی عظیم انسان تھے لیکن آخر قریب کا ماحول بھی تو کوئی چیز ہے۔ مولانا محمد علی نے کبھی کہا تھا کہ "باپو" (یعنی گاندھی جی) میری جیب میں ہیں لیکن جیب پھٹی، یا جیب تراشی گئی، باپو اس میں سے نکلے، مالویہ جی نے ان پر رنگ جمایا، لالہ لاجپت رائے نے انہیں کچھ سمجھایا، سابرمتی میں آشرم بنا، وردھا میں دوسرا آشرم بنا۔ اور ــ اسے حسن اتفاق کہئے یا سوء اتفاق کہ مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر انصاری اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں، ان نوبنو واقعات سے دور رہے، اور دور ہی نہیں رہے، بلکہ مسلمانوں میں ایسے لیڈر بھی پیدا ہونے لگے جو گاندھی جی کے "ہندو مسلم اتحاد" کو کھوٹا سکہ سمجھنے لگے تھے۔ سی۔ آر۔ داس مر چکے تھے، پنڈت موتی لال نہرو مر چکے تھے، پنڈت جواہر لال نہرو زندہ تھے، لیکن "عوام زندہ باد" کا نعرہ انھوں نے اتنی بلند آہنگی سے مارا کہ "ہندو مسلم اتحاد" "برائے وزن بیت" رہ گیا۔ کہنا یہ نہیں ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے "ہندو مسلم اتحاد" کی اہمیت نہ سمجھی بلکہ کہنا یہ ہے کہ اسے اپنے نئے نظریات کے سانچے میں اس طرح فٹ کیا کہ "ہندو مسلم اتحاد" سکڑ کر رہ گیا۔ اور گاندھی جی سمجھنے لگے کہ میں پرانا آدمی ہو چکا، اس لئے نئے زمانہ کا نیتا نہرو جو کچھ کہتا ہے وہ صحیح ہی ہو گا، بلکہ کسی طبیب حاذق کا تیر بہدف نسخہ ہو گا۔

ہمیں دکھ ہے کہ گاندھی جی کی قومیت متحدہ یا ہندو مسلم اتحاد پر کئی سمتوں سے دباؤ پڑنے لگا، پھر گاندھی جی نے "ہری جن ادھار" "دیہات سدھار" چرخہ اور کھدر پر اتنا زور دیا کہ بہت سے نعرے فضا میں بیک وقت بلند ہونے لگے، اور اس طرح گھل مل گئے کہ کسی نعرہ یا کسی تحریک کی کوئی مخصوص انفرادیت باقی نہ رہی۔

گاندھی جی کی شکست کا ایک المناک لمحہ وہ تھا جب ایک طرف تو دو قومی نظریہ آیا۔ دوسری طرف گاندھی جی نے قومیت متحدہ یا ہندو مسلم اتحاد کا نظریہ اس شدت سے پیش نہیں کیا، جو ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے علل و اسباب کیا تھے لیکن سیاسیات کے ایک طالب علم کے لئے یہ مطالعہ نہایت سبق آموز اور بصیرت افروز ہے کہ گاندھی جی کے اسی رویہ کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ ایک طرف تو انھوں نے یہ فرمایا کہ پاکستان میری نعش پر بنے گا، دوسری طرف ملک کی تقسیم بھی ہو گئی لیکن تقسیم ملک کے بعد گاندھی جی کی حق پسندی ایک بار پوری توانائی کے ساتھ ابھری، اور اگرچہ ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ انھوں نے تقسیم ملک کے بعد اتنی جلدی تو نہیں بلند کیا، مگر جارحانہ فرقہ پرستی کا نہایت کامیاب مقابلہ کرتے ہوئے، شہید ہو گئے۔ اور ان کی موت اس شان سے آئی کہ سکندر اعظم اور نپولین اعظم کے حصہ میں بھی نہ آئی ہو گی۔ ایک ایسی موت جو اہنسا کے علمبردار کے شایان شان تھی۔

دنیا کہتی ہے کہ گاندھی جی کی بہت بڑی دین اصول عدم تشدد، اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ بیسویں صدی کے ہندوستان کو گاندھی جی کی سب سے بڑی دین ہندو مسلم اتحاد ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں بہت سے پیچ و خم آئے کبھی اس پر شباب، کبھی سن رسیدگی آیا، کبھی اضمحلال بھی آیا، پھر بھی گاندھی جی نے بیسویں صدی میں ہندو مسلم اتحاد کو خار و خس سے جس طرح پاک کیا، وہ ایک حد تک پنڈت نہرو اور بڑی حد تک مولانا ابوالکلام آزاد ہی نے کیا ہو گا۔

ہم آج اس قابل تو ہیں فسطائیت اور فرقہ پرستی کے اس دور میں قادر تو ہیں کہ گاندھی جی کی عظیم موت کا نام لیں اور ہندو مسلم اتحاد میں جان ڈالنے کی کوشش کریں۔

دنیا آج ان کی سو سالہ سالگرہ مناتی ہے، انہیں ہاتھ پر تھامتی ہے لیکن ان کا ہندو مسلم اتحاد شاید طاق نسیاں کا ایک گلدستہ بھی نہیں رہا۔ ہمیں آج بھی انتظار ہے کہ کیا گاندھی جی کے ہندو مسلم اتحاد میں آج بھی جان ڈالی جائے گی؟ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکا تو ان کی یاد کیا، ان کی ۱۰۰ سالہ سالگرہ کیا؟

جذبوں کی گرمی، ماضی کی وابستگیاں، کچھ چھوٹی کچھ بڑی یادیں آج بھی گاندھی جی کو زندہ دیکھتی ہیں۔ یہ کوئی واہمہ نہیں ہے۔

سالنامہ کاروانِ وطن

جلد نمبر ۳ — شمارہ نمبر ۲

ادارہ

شاہدہ باقی نکہت — عبدالباقی

منتظم اعلیٰ — عبدالباسط

ناشر و پبلشر — عبدالباقی

مطبوعہ — لطیفی پرنٹنگ ورکس دہلی

مقام اشاعت۔ ہوٹل تاج جامع مسجد دہلی ۶

مولانا ابوالکلام آزاد

میں ہندوستان کی ملی جلی زندگی کا جلی نقش، سنہری عنوان
تھے مولانا ابوالکلام آزاد اکبر اعظم کے مقابلے پر بھی آزاد اعظم، شاہ جہاں سے
بھی زیادہ عظیم الشان تاج محل سے زیادہ حسین جامع مسجد کے گنبدوں سے زیادہ
متوازن اور پروقار ہندوستان کو مسلمانوں سے ایک ہزار سال تک جو کچھ ملتا رہا
مولانا نے بیسویں صدی میں منافع کے ساتھ دیا۔ اور اگر اور کچھ نہ ہوتا مسلمانوں
کی وطن پروری کا خانہ خالی بھی ہوتا۔ تو آزاد اس خانے کے آب و رنگ، زینت
شان آبرو تھے۔ آج استغاثہ کی کہانی کتنی ہی چھوٹی ہو، صفائی کا بیان کیا آزاد
کے وجود سے زیادہ سچا، زیادہ پاک، زیادہ صاف ہو سکتا ہے۔

ہندوستان نے بیسویں صدی میں ایک سے ایک لیڈر پیدا کئے۔ مہاتما
گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد، سردار پٹیل آسمان ہند کے آفتاب
و ماہتاب تھے، لیکن ہمیں بلا خوف تردید کہنے دیجئے کہ مولانا ابوالکلام آزاد سے بڑا مفکر
و مدبر، جو دنیا بھر کے مفکروں اور مدبروں کو ڈکار لئے بغیر ہضم کر سکتا تھا۔ بیسویں
بر اس صدی میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ قصیدہ مدحیہ نہیں ہے۔ ننگی حق گوئی ہے۔ اور اس پر
بھی، جب مولانا ابوالکلام آزاد پر صدارت جمہوریہ نثار کرتی ہے وزارت عظمیٰ اترائی،
وہ آزاد جمہوری ہندوستان کا صرف وزیر تعلیم تھا، یعنی جس طرح کبھی سر میاں فضل
حسین وزیر تعلیم تھے، یا ڈاکٹر خر سپالی وزیر تعلیم تھے

اسے افشائے راز نہ سمجھئے اور خدا کے لئے خود ستائی تو کبھی نہ سمجھئے کہ ہم نے
مولانا ابوالکلام آزاد کو خلوت و جلوت میں دیکھا ہے اور انھوں نے جب کسی معاملہ
میں رہنمائی کی ہے، یا کوئی خاص نقطۂ نظر پیش کیا ہے، تو ان کا بدترین نکتہ چیں کسمسا
کے رہ گیا، گاندھی جی پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی ہے، پنڈت نہرو "مولانا یہ تو صحیح ہے"
کہہ کے خاموش ہو گئے ہیں، سردار پٹیل کے سپاٹ چہرے پر ایک رنگ آیا ہے، دوسرا
رنگ آیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر راجندر پرساد بے دلی سے مسکرا دیئے
ہیں۔

مولانا اتنے بڑے خطیب، اتنے بڑے ادیب تھے کہ ان کا ثانی بیسویں صدی



میں ہندوستان نے پیدا نہیں کیا۔ یہ تسلیم کہ مسٹر سری نواس شاستری پنڈت مدن موہن
مالویہ، مسز سروجنی نائیڈو کی خطابت کا جواب نہیں تھا لیکن مولانا آزاد کی خطابت
میں جو معجز نفادہ تاریخ عالم میں کم ہی پڑھا اور کم ہی سنا ہے۔ کاش ان کی آواز
زیادہ پائیدار ہوتی تو ہم بلا خوف تردید کہتے کہ دنیا نے روز اول سے لے کر
اب تک اتنا بڑا خطیب پیدا نہیں کیا۔ لیکن وہ خطیب تھے۔ زبان اردو کے
جو بے سہارا ہو چکی ہے۔ پھر بھی آل انڈیا کانگرس کی مجلس کمیٹیوں میں مولانا
کی تقریریں جب سنیں تو محسوس ہوا کہ ان کی خطابت ہندوستانی زبان کا بھی نقطۂ آخر
ہے، جس پر تامل، تلنگو، کنڑی اور ملیالم والا بھی سر دھنتا تھا خطیب اپنی نمائش
چاہتا ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ مولانا نے نمائش رچائی اور آزادی کعبہ تو دنیا بھول
گئی کہ آزاد کے منہ میں زبان بھی ہے۔

ان کی خطابت، ادب وانشا کے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ الہلال نے
ہندوستانی صحافت کی جو اہم خدمات انجام دیں ان سے انکار نہیں ہو سکتا، لیکن
الہلال کا کمال صرف ادبی کمال نہ تھا، بلکہ اس کا کمال اس کے تیور تھے۔ بات
کہنے کا انداز تھا جذبات میں تلاطم پیدا کرنے کی جادوگری تھی، ایک نئی زندگی
ایک نئی فکر کی دسانگ وہی دعوت تھی، ان کی تحریروں سے محسوس ہوتا تھا کہ کسی
یونانی مجسمے کو بڑی بڑی آنکھیں سڈول بازو مضبوط کلائیاں اور گوشت کی لمبی
لمبی انگلیاں لگی ہیں۔

مولانا کے کمالات میں ان کی ہمہ دانی، ان کی خطابت، ان کی علمی
و ادبی بصیرت یقیناً تھی، لیکن ان کا بہت بڑا کمال یہ تھا کہ یہ ایک مولوی کا بیٹا

پنڈت جواہر لال نہرو



پنڈت جواہر لال نہرو کی موت پر تین سال گزر چکے۔ محسوس ہوتا ہے کہ تین سال تین صدیاں ہو گئیں۔ ہندوستان کمزور ہوا، کانگریس کمزور ہوئی، ترقی و تعمیر کے منصوبوں پر جمود طاری ہے، مقاصد عالیہ کو گھن لگ گیا، نظریات کو یرقان کا روگ لگ گیا، فرقہ پرستی اور فسطائیت بے باک ہے۔ بعض ریاستوں میں کانگریسی وزارتیں کیا چھن گئیں کہ وہ جو کبھی سر سے کفن باندھ کر میدانوں میں نکلے تھے، موت سے پہلے موت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔

یہ تصویر ہے نہرو کے بعد ہندوستان کی اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نہرو کے زمانہ میں ہندوستان کیا تھا اور نہرو کے بعد ہندوستان کیا ہے۔ یہ تضاد سبق آموز ہے

ہندوستان، نہرو سے یقیناً بہت بڑا ہے، لیکن ہندوستان میں ہمالیہ بھی ہے اور ایورسٹ بھی! نہرو ہندوستان کے لئے بھی ہمالیہ اور ایورسٹ تھے، اور دنیا کے لئے بھی ہمالیہ اور ایورسٹ تھے۔ یعنی ہندوستان کا سب سے اونچا پہاڑ، سب سے اونچی چوٹی، بلکہ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ اور سب سے اونچی چوٹی۔

وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا

مشاہیر عالم میں پنڈت نہرو کے معاصرین روزولٹ، اسٹالن، چرچل، آئزن ہاور، خروشچوف تھے۔ صدر ناصر بھی پنڈت نہرو کے معاصرین ہیں اور ڈاکٹر سوکارنو، ماؤ اور چو این لائی بھی ان کے معاصر ہیں۔ لیکن یہ عقیدت کا معاملہ نہیں ہے، حقیقت کی بات ہے کہ پنڈت نہرو کی قامت بلند سے کوئی ایک انچ، کوئی ایک فٹ نیچا ہی تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں چرچل کو برطانیہ کا نجات دہندہ کہا جاتا ہے، ان کے مقابلہ میں نہرو سامراج کی دو صد سالہ جنگ میں صرف ہندوستان کے نجات دہندہ نہ تھے، بلکہ ایشیا و افریقہ کی غلام قوموں کی آزادی کے علمبردار تھے۔ اسٹالن کمیونزم کا فولادی مجسمہ تھے۔ نہرو امن کے پیغامبر، اور سامراج دشمن، جنگ کے کامدار اعظم تھے، امریکہ کی بڑائی دنیا پہلے بھی تسلیم کرتی تھی، لیکن نہرو نے غلام ہندوستان کی عظمت دنیا سے اس طرح تسلیم کرائی کہ ایک زمانہ میں اخلاقی سطح پر اس کا کوئی رقیب نہیں تھا۔ نپولین اعظم کو مصر میں برطانیہ نے ایک حد تک شکست دی تھی، نہر سوئز پر بڑی بڑی طاقتوں کے جارحانہ حملوں کی پسپائی کا انتظام کر کے عظیم نہرو نے عظیم نپولین کو مزنوں پیچھے چھوڑ دیا۔

چین میں ماؤ اور اس کے ساتھیوں کا براہ راست مقابلہ کسی عظیم غیر ملکی طاقت سے نہیں تھا، ہندوستان میں نہرو کا مقابلہ براہ راست برطانوی استعمار (امپیریلزم) سے تھا۔ جیسے نہرو اور ان کے ساتھیوں شکست فاش دی۔ نہرو جنگ بیسویں صدی میں صحیح معنوں میں عوامی جنگ تھی، جس میں عوام نے بھی یقیناً حصہ لیا۔ ماؤ نے چین کا مذہبی و تہذیبی مسئلہ یوں حل... مارکسٹ نظریات کو چین پر زبردستی مسلط کر دیا۔ نہرو نے ہندوستان کا مذہبی و تہذیبی یوں حل کیا کہ ایک سیکولر اسٹیٹ قائم کی، اور کثرت میں وحدت کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور ہندوستان کے مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کو نشوونما کی پوری آزادی دی۔ نہرو نے بقائے باہم کی دعوت دی، ماؤ آج بھی تصادم کی دعوت دے رہے ہیں۔

نہرو کی سب سے بڑی ناکامی، ان کی سیکولر پالیسی کی ناکامی ہے، لیکن ان کی سب سے بڑی جیت بھی ان کا سیکولر نظریہ ہے، جس پر انہوں نے عمل کرنا چاہا، مگر سو فیصدی عمل نہ کر سکے۔ نہرو کی دوسری ناکامی یہ ہے کہ وہ ہندوستان سے فرقہ پرستی کو ختم نہ کر سکے۔ لیکن اس کا سبب شاید یہ تھا کہ وہ جمہوریت پسند بھی تھے، اور جمہوریت پسند کسی لعنت کو ختم کرنے کے لئے ڈکٹیٹر نہیں بنتا۔ پھر بھی نہرو کی جمہوریت پسندی کو اس قدر [illegible] آفریں ہونا چاہئے تھا کہ رجعت پسندی، مفاد پرستی، اور فرقہ پرستی زمین کی سات تہوں کے نیچے دفن کر دی جاتی۔ یہاں انہوں نے انقلاب پسند سے زیادہ اصلاح پسند سے زیادہ پسند بننے کی کوشش کی، اور ٹھوکر کھائی۔

سردار پٹیل

گجرات کے رہنے والے تھے، اور گجرات والے ہمارے نزدیک مزاج پرست کم ہی ہوتے ہیں۔ وہ عموماً حقیقت پسند ہوتے ہیں اور ان کی حقیقت پسندی کبھی کبھی کڑوی اور کسیلی بھی ہو جاتی ہے۔ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کا ہم موازنہ تو نہیں کرنا چاہتے، لیکن چونکہ دونوں کے نام ایک تضاد کی حیثیت سے آتے ہیں، اسلئے اتنی بات کہہ دی جائے تو نامناسب نہ ہوگی کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے آبا و اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ دلی سے بھی ان کے خاندان کا تعلق رہا اور جب ان کا خاندان الہ آباد میں آباد ہو گیا، تو وہ ایک ایسے کلچر سے مانوس ہوا جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ملا جلا کلچر کہہ سکتے ہیں۔ اس ملے جلے کلچر پر فرنگی تہذیب کا رنگ چڑھا۔ اور خود پنڈت نہرو کی تعلیم انگلستان کے لبرل ماحول میں ہوئی۔ لبرل ماحول پر سوشلزم کی چھاپ پڑی۔ اس لئے پنڈت نہرو سب ہی کچھ تھے۔ ہندو بھی تھے مسلمان بھی تھے، اور اس کے باوجود ہندوستانی تھے۔

ان کے مقابلہ میں سردار پٹیل کے کردار کے اجزائے ترکیبی وہ نہ تھے جو پنڈت نہرو کے تھے، لکھنؤ، الہ آباد، کشمیر ان سے بہت دور تھے۔ اور جواہر لال نہرو کے باپ پنڈت موتی لال نہرو کے کردار کا رنگ و روغن انہیں ورثہ میں نہیں مل سکتا تھا۔

سردار پٹیل کے کردار میں جو توازن پیدا ہوا، وہ گاندھی جی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ انہیں مسلمانوں سے نفرت پیدا کرنے والا کہا گیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ ذاتی تجربے کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعض مسلمانوں کو آخری سانس تک انہوں نے اتنا عزیز رکھا کہ ہندوؤں کو نہیں رکھا۔

مولانا آزاد سے ان اختلاف ہندو و مسلم کی بنا پر نہیں تھا بلکہ نفسیاتی تضادات کی بنا پر تھا۔ آخر پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی انہیں اختلاف تھا، اور ظاہر ہے کہ ہندو اور مسلمان کا سوال اس میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مولانا آزاد کی بے پناہ انفرادیت، ان کی بے حساب "میں" مختصر یہ کہ ان کی "ابوالکلامیت" سردار پٹیل کی انفرادیت اور "میں" سے ٹکرائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں ذہنی و نفسیاتی ناہمواریاں پیدا ہوئیں۔

سردار پٹیل ۱۹۲۷ء میں "بار دولی" کی مہم سر کرنے کے بعد سردار کہلائے۔ بار دولی میں انہوں نے جو عظیم الشان تنظیم کی اس نے انقلاب روس کی یاد تازہ کر دی۔ انگریزی حکومت کے سرکاری افسر ایک ادنیٰ کسان سے کوئی سوال کرتا تو وہ کہہ دیتا کہ ہمارے سردار سے پوچھو یعنی سردار ولبھ بھائی پٹیل سے پوچھو۔ اس لئے بار دولی کے سردار پٹیل قومی سیاست کے ایک مستقل "فاتح" بن گئے۔ اور شکست تسلیم کرنا ان کی آن اور شان کے خلاف تھا۔



دو قومی نظریہ اور مطالبہ پاکستان کے بارے میں بھی سردار پٹیل کا خیال تھا کہ وہ اسے شکست دے سکیں گے۔ لیکن شکست دینے کے لئے خود مسلمانوں کو رہنمائی کرنی چاہئے تھی۔ اس لئے سردار پٹیل کو مولانا ابوالکلام آزاد اور نیشنلسٹ مسلمانوں سے بہت بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ مسٹر محمد علی جناح اور دو قومی نظریہ کو شکست نہ دے سکے۔ سردار پٹیل نے نیشنلسٹ مسلمانوں کی اکثر حوصلہ افزائی کی۔ لیکن جب انہوں نے غلط یا صحیح سمجھ لیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور نیشنلسٹ مسلمان، ان کی توقعات پوری نہیں کر سکتے تو وہ دو قومی نظریہ سے تو خفا تھے ہی مولانا ابوالکلام آزاد اور نیشنلسٹ مسلمانوں سے بھی خفا ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے انہیں جو شکایت تھی، وہ غلط تھی۔ اس لئے کہ دو قومی نظریہ کو نہ صرف یہ کہ وہ شکست نہ دے سکے بلکہ پوری کانگرس شکست نہ دے سکی۔ اور کانگرس میں سردار پٹیل بھی تھے۔

تقسیم ملک سے پہلے پنجاب کے معاملات کی نگرانی کانگرس نے مولانا ابوالکلام آزاد کے سپرد کر رکھی تھی۔ مولانا نے پنجاب کے معاملات کی جو نگرانی کی، وہ سردار پٹیل کے نزدیک صحیح نہیں تھی۔ سردار پٹیل سمجھتے تھے کہ ان سے پنجاب کے آخری وزیر اعظم سر ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کو قومی قیادت سے جو طاقت ملنی چاہئے، نہیں مل رہی ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے پنجاب میں ایک مخلوط وزارت قائم ہوئی تھی، جس کے وزیر اعظم ملک خضر حیات خاں اور وزیر خزانہ سری بھیم سین سچر تھے۔ سچر صاحب کو سردار پٹیل کے بجائے مولانا ابوالکلام کا اعتماد حاصل تھا۔ سردار پٹیل کی رائے تھی کہ پنجاب کی کولیشن وزارت میں کانگرس کی نمائندگی موثر نہیں ہے۔

اسی طرح صوبہ سرحد کے متعلق سردار پٹیل کچھ اور چاہتے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ عبدالقیوم خاں کو جو مرکزی کانگرس اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے نظر انداز نہ کیا جائے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم حب وطن کے معاملہ میں شیر تھے اور حب ملت کے معاملے میں بھی شیر تھے۔ شیر بے دھڑک حملے کرتا ہے اور آس پاس کے خطروں کو بھی سونگھتا ہے۔ لدھیانہ (پنجاب) ان کا وطن تھا اور دلی ان کا دوسرا وطن تھا۔ ان کی پہلی تقریر جب دلی دروازے (لاہور) کے باغ میں سنی تو خیال ہوا کہ وہ صرف زبان اور صرف پھیپھڑوں سے کام لیتے ہیں۔ لیکن کم و بیش تیس سال کے تجربے گواہ ہیں کہ ان کی زبان سے زیادہ ان کا دماغ کام کرتا تھا اور آخر عمر میں تو شاید ان کی زبان ساکت تھی اور صرف دماغ کام کرتا تھا۔ لدھیانہ کے جید علماء کے خاندان میں وہ پیدا ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند سے روحانی وابستگی رہی مجلس احرار اسلام کو جنم دیا اور کانگرس کے مجاہدۂ حریت کو بہت بڑا محاذ سمجھا۔ اس نے ان کی پوری زندگی کی تاریخ علماء لدھیانہ، دارالعلوم دیوبند، مجلس احرار اسلام اور کانگرس کی تاریخ ہے۔ مسلمانوں میں ان ایسے TACTICIAN یعنی سیاست کے پینترے بازیوں کو سمجھنے والے ہم نے کم ہی دیکھے۔ باط سیاست پر سوچ کر چالیں چلتے تھے۔

ابتدا میں مولانا ظفر علی خاں کی صحافت و سیاست کے قریب آئے اس کے بعد قیادت کا خود بخود مل گیا۔ سیاسی سفر کا ایک مقام ایسا بھی آیا کہ انھیں اور ان کے دوستوں کو مجلس احرار اسلام قائم کرنا پڑی سیاسی سفر کا یہ مقام وہ تھا کہ ڈاکٹر شیخ محمد عالم مرحوم کو آل انڈیا کانگرس کی مجلس عاملہ میں لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ جب ڈاکٹر عالم مجلس عاملہ کے رکن نامزد کر دیئے گئے تو مولانا اور ان کے دوستوں نے سیاست کا رخ کسی حد تک موڑ دیا۔ اس مسئلے کے علاوہ بھی کئی مسائل تھے۔ جن کا تقاضہ تھا کہ ایک نئی رہنمائی کی جائے۔ مولانا کے

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

زمانہ دے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

احراری رفقاء میں خاص طور پر قابل ذکر مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم، چودھری افضل حق مرحوم کو مجلس احرار کا دماغ کہتے تھے۔ لیکن اس دماغ کو فکر اور خیال مولانا حبیب الرحمٰن سے ملتا تھا۔

مجلس احرار وطن دوستی اور ملت دوستی کا ایک صحت بخش مرکب تھی لیکن اسے تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا تھا۔ یہ راہ کبھی کبھی فرقہ پرستی کو بھی چھو سکتی تھی، لیکن ہمیں یقین ہے کہ فرقہ پرستی سے مجلس احرار کو محفوظ رکھنے میں مولانا حبیب الرحمٰن نے جو رول ادا کیا کسی احراری لیڈر نے ادا نہیں کیا مولانا اور ان کے ساتھیوں کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں تحریک کشمیر شروع کی اور ساٹھ ہزار مسلمانوں کو جیلوں میں بھیج دیا۔ اس تحریک کے سلسلے میں کشمیر، اس کے لیڈروں اور کارکنوں کا انھیں کافی تجربہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا حبیب الرحمٰن، شیخ عبداللہ بخشی غلام محمد، صادق صاحب اور میر واعظ (جو اب پاکستان میں ہیں) کو جتنا پہچانتے تھے، شاید ہی کوئی پہچانتا ہو۔

تقسیم ملک سے پہلے کا ان کا پنجاب انگریز حکومت کا چہیتا تھا۔ اسے چونکہ بہادر سپاہی جنگ کے لئے پنجاب سے ملتے تھے، اس لئے بہت سے خاندانوں کو اس نے دودھ پلا پلا کے پالا تھا اور ان افراد کی لیڈری کو پہلوان بنایا تھا جو اس کے وفادار تھے۔

پنجاب کانگرس میں چونکہ مسلمان فعال نہ تھے۔ اس لئے انگریز حکومت اور اس کے پنجابی چہیتوں کا مقابلہ کرنا مجلس احرار کا کام تھا۔ مقابلہ کی یہ جنگ جس طرح مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے لڑی وہ انہی کا حصہ تھی۔ ہندوستان

بقیہ صفحہ ۴۴

مولانا

مظہر الحق

بار ایٹ لا

بہار نے بیسویں صدی میں جن عظیم شخصیتوں کو جنم دیا، ان میں مسٹریا مولانا مظہر الحق بار ایٹ لا، مسٹر حسن امام (کلکتہ ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی چیف جسٹس اور کانگریس کے سابق صدر) ان کے بھائی سر علی امام اور سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بہار میں مسلمان اب اقلیت ہیں، لیکن یہ اتفاق ہے کہ جنہیں "رجل عظیم" کہا جاتا ہے، ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، اس اکثریت کا تعلق اگرچہ سیاسی دنیا سے تھا، لیکن ادبی یا علمی دنیا میں تلاش کی جائے تو مسلم ادبا، شعراء، فضلا، علماء کی ایک لمبی چوڑی فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔

مولانا مظہر الحق بار ایٹ لا، ۱۹۲۰ سے پہلے مسٹر مظہر الحق تھے وکیلوں اور بیرسٹروں کے وہ سرتاج تھے، پٹنہ کی مشہور شارع عام فریزر روڈ پر ان کی کوٹھی تھی بلکہ محل تھا جس کا نام آج بھی سکندر منزل ہے، یہاں ۱۹۲۰ء کے بعد کانگریس اور مجلس خلافت کی کئی اہم ترین نشستیں ہوئیں، سکندر منزل ہی میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ تحریک ترک موالات شروع کی جائے، اور تحریک خلافت کو تحریک ترک موالات کی سیاست خارجہ سمجھا جائے۔ اس محل میں قیام فرمایا، گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت موتی لال نہرو ڈاکٹر انصاری، مسیح الملک حکیم اجمل خاں علی برادران اور بی اماں نے۔

حضرت مظہر الحق کا مسٹر اور مولانا بھی تاریخ کا درجہ رکھتا ہے ۱۹۲۰ء سے پہلے وہ سو فیصدی مسٹر تھے، ترشے ترشائے سوٹ زیب تن کرتے تھے، داڑھی منڈاتے تھے، اور چونکہ رنگ گورا تھا، اس لئے انگریزوں سے زیادہ انگریز تھے۔ عدالتوں میں اس زمانہ کے سرکاری قوانین کی وضاحت ایسی انگریزی زبان میں کرتے تھے جو کوئی فصیح البیان انگریز بھی نہیں کرسکتا تھا۔ کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک انگریز جج مسٹر سمتھ نے داد دیتے ہوئے کہا تھا کہ فاضل کونسل لندن کا بیرسٹر معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر مظہر الحق نے جج کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ دراصل حسن نہیں عیب ہے اس لئے کہ ہماری زبان بھی غلام ہوچکی ہے۔"



لیکن جب تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات پر مذہبی رنگ چڑھنے لگا اور انہوں نے محسوس کیا کہ برطانیہ مسلمانوں اور ہندوستانیوں کا دشمن ہے تو انہوں نے انگریزی سوٹ ترک کردیا، داڑھی بڑھالی، اسلامی اور ہندوستانی معاشرت اختیار کی، اور صوم وصلوٰۃ کے پابند ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا مسٹر کو مولانا کہنے لگی۔ انہوں نے روزنامہ "لیڈر" (الہ آباد) کے نمائندے سے ایک بار تاکید اً کہا کہ میں نہ تو مسٹر ہوں، نہ مولانا۔ مجھے صرف مظہر الحق کہو یا لکھو۔ نمائندے نے کہا کہ صرف مظہر الحق کہنا بے ادبی ہوگی۔ جواب دیا کہ "مظہر الحق صاحب" لکھ دو۔

انہوں نے بیرسٹری ترک کردی۔ فیاض اور فرخ دل تھے، اس لئے کوئی بہت بڑا سرمایہ پس انداز نہیں کیا۔ بہار کے مشہور روحانی مرکز پھلواری شریف اکثر تشریف لے جاتے، علماؤں سے تبادلۂ خیالات کرتے، پنڈتوں سے ویدانت پر بحثیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ درویشی سے طبیعت مانوس ہوگئی اور سکندر منزل میں قیام بھی اچھا نہ لگتا، اس لئے کہ اس سے امارت کی بو آتی تھی۔ روحانی ریاضت کرتے، اللہ کو یاد کرتے، اور عوامی معاملات کے لئے وقف رہتے۔ کانگریس کی تحویل میں پیسہ نہیں تھا۔ جب کبھی کانگریس کو اپنی بے مائگی محسوس ہوئی، مولانا مظہر الحق کا روپیہ اور جائیداد کام آئی۔ تحریک ترک موالات کا جب ان پر رنگ چڑھا تو اپنی تین موٹر کاریں، ایک لینڈو اور ایک فٹن بیچ ڈالی۔ عموماً پیدل چلتے، یا پٹنہ کے عجیب و غریب یکوں پر آتے جاتے اور ایک ایک آنہ یا دو دو آنے کرایہ ادا کرتے۔ ان کی درویشی نہایت پُرمشقت تھی۔ گاندھی جی نے ایک بار کہا کہ آپ کی صحت خراب رہنے لگی ہے، کچھ تو اپنا خیال کیجئے۔ فرمایا کہ اس

معاملہ میں آپ کے مشوروں کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے جو بات اچھی لگتی ہے، کرتا ہوں۔

سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے اگرچہ گاندھی جی سے بہت کچھ حاصل کیا، لیکن انہوں نے اصل میں مولانا مظہر الحق کے آداب میں زانوئے تلمذ تہ کیا، قانون اُن سے سیکھا، وکالت اُن سے سیکھی۔ ڈاکٹر راجندر پرساد ۱۹۲۰ء میں جوان یا نوجوان تھے، اور اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک دن صدر جمہوریہ ہوں گے۔ بہار کے طلبا نے جب انہوں نے تحریک شروع کی تو مولانا مظہر الحق کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعائیں لیں۔ ڈاکٹر راجندر پرساد کے مطبوعہ سوانح حیات سے صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ دونوں کے تعلقات کیا تھے۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مظہر الحق گرو تھے اور راجن بابو چیلے تھے۔

مولانا مظہر الحق نے انگریزی زبان کا ایک اخبار بھی جاری کیا، جس کا نام "مدرلینڈ" تھا۔ پہلے شمارے میں مولانا نے لکھا تھا کہ

"اگر سیاست میں اخلاقی محرکات نہیں ہیں، تو
وہ شیطان کا ایک گورکھ دھندا ہے۔ ہندوستانی
قوم اخلاق کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

آج کی سیاست میں کہ بد اخلاقی عام ہو رہی ہے، مولانا مظہر الحق کی بات کتنی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اُن کی سفید داڑھی اگرچہ شاعر ٹیگور کی داڑھی کی طرح گھنی، ابھر کا دُم پھریلی نہیں تھی، مگر اُس کا گھیر دُرویش کی ریش مقدس کا گھیر تھا۔ انہوں نے بھاگلپوری سِلک کا لمبا کُرتا اگرچہ نہیں پہنا، اگرچہ لنگا زیں بناؤ نہیں پیدا کیا، لیکن اگر تحریک ترکِ موالات نے کسی نفس کش دُرویش کو واقعی جنم دیا تو اس زمانہ کے بڑے لوگوں میں وہ مولانا مظہر الحق ہی تھے جو صورتاً بھی درویش اور سیرتاً بھی دُرویش تھے۔ اُن کی دُرویشی کبھی اشتہار نہیں بنی، بلکہ اُن کا بے تکلف کردار بنی، جس میں آورد نام کو نہیں تھا۔

انہوں نے بہار کانگرس کو لمبی چوڑی زمین دے دی، جہاں آج صداقت آشرم ہے۔ اس زمین پر آم کا ایک گھنا باغ تھا، کہتے ہیں کہ آموں کی فصل میں باغ سے کم و بیش دس ہزار روپیہ سالانہ آمدنی تھی۔ صداقت آشرم تو قائم ہو گیا، لیکن اگر وہ چاہتے تو خانقاہ میں بیٹھ جاتے اور ایک عالم کے لئے رشد و ہدایت کا مرکز بنتے، زندہ رہتے تو ایک بہت بڑی سیاسی جماعت کے قائد ہوتے، منصب اور عہدے کی فکر کرتے، تو سب سے اونچی کرسی پر بیٹھتے، فلسفی ہونا پسند کرتے تو ایک زمانہ اُن کا ادب کرتا، مذہب کی وادی میں نکل جاتے تو قافلوں کے سالار بنتے۔

زندگی نے وفا نہ کی۔ اس درویش، اس مدبر، اس سیاست داں، اس قائد نے بہت پہلے دُنیا چھوڑ دی جبکہ چشم تصور آج بھی دیکھتی ہے کہ مولانا مظہر الحق زندہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ وہ شاید دُنیا سے کنارہ کر لیتے، اور اگر کنارہ نہ کرتے تو آزاد ہندوستان کے بڑے سے بڑے منصب پر اُن کا حق ہوتا، حق کیا ہوتا بڑے سے بڑا منصب اُن کے قدم چومتا لیکن ایسا کیوں ہوتا۔ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، موت مقدر ہے، اور اس کے بعد مولانا کے بارے میں جو سوچا جائے فقط قیاس آرائی ہے۔

حق مغفرت کرے وہ تھا حق کا مظہر جمیل

بہار آج اُن کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ دلّی میں پچھلے دنوں اُن کی یاد تازہ کی گئی تھی۔ ہماری دعائیں اُن کے لئے ہیں جو مولانا مظہر الحق کی عظمت کا تعارف آزاد اور سیکولر ہندوستان سے کرانا چاہتے ہیں۔ مولانا مظہر الحق ایسے آدمی اس عالم آب و گل میں کم ہی پیدا ہوئے ہیں اور جب پیدا ہوتے ہیں تو بجائے خود ایک افادہ گاہ ایک انجمن ہوتے ہیں۔ اور ذرات کی سونی بستی میں ایک محشر بپا کرتے ہیں۔

بقیہ جواہر لال نہرو

ہندوستان کی آزادی کے بعد گوناگوں مشکلات تھیں، بیرونی و اندرونی خطرے منہ پھاڑے کھڑے تھے، اس لئے نہرو نے ملک کی تدریجی ترقی پر زور دیا۔ اس میں ان کی جمہوریت پسندی کو ابھر سکی۔ لیکن ان کی انقلاب پسندی دب گئی۔ تضادات میں مطابقت پیدا کرنے کی جو غیر معمولی صلاحیت پنڈت نہرو کو ملی تھی۔ اس نے انہیں اس حد تک اعتدال پسند بنا دیا کہ جہاں ان کی ضربیں شدید رہیں، شاید زندگی نے دو چار سال اور وفا کی ہوتی تو نہرو کے عمل کا کلہاڑا، باطل کے پرخچے اڑا دیتا۔ لیکن غالب کا یہ طنز شاید انہیں یاد ہو کہ ؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

نہرو سمجھے شاید غلط سمجھے کہ تیشے کے بغیر بھی شخص مر سکتا ہے۔

ہندوستان بہت پرانا ملک ہے، ہزاروں سال کی اس کی تاریخ ہے، ہزاروں سال کے انقلابات کے ایک سماج، ایک تہذیب، ایک نظام کو جنم دیا تھا، جس کی بنیادیں انگریزی حکومت نے ہلا دیں۔ آزادی کے بعد نہرو کا بہت بڑا کام یہ تھا کہ ایسا سماج اور ایک ایسا نظام بنایا جائے جسے انگریزوں نے بگاڑ دیا تھا۔ اس اعتبار سے نہرو نئے ہندوستان کے معمار اعظم ہیں، صناع ہیں، ہدایت کار ہیں۔ بلکہ خالق ہیں۔ یہ کام نہرو جی کر سکتے تھے، اور انہوں نے کیا، مگر ان کی نئی تعمیر ادھوری رہی۔ ادھوری ہی نہیں رہی بلکہ فرقہ پرست اور فساد پرست اس کا نشان تک باقی نہیں رکھنا چاہتے

عالم حسرت میں دل عرض تمنا چھوڑ دے!
یہ بھی تو ہوتا ہے مجنوں کوئے لیلیٰ چھوڑ دے



مسز اندرا گاندھی

پنڈت جواہر لال نہرو کے کوئی بیٹا نہیں تھا، ان کی بیٹی اندرا ہی بیٹے کا کام کر رہی ہے۔ وہ نہرو کی لاج ہے، ہندوستان کی لاج ہے۔

کانگرس پارلیمنٹری پارٹی نے مسز اندرا گاندھی کو لیڈر منتخب کیا، اور اس پارٹی کی لیڈر کی حیثیت سے جسے پارلیمنٹ میں غالب اکثریت حاصل ہے۔ وہ ہندوستان کی وزیر اعظم ہیں۔

ہم یہ نہیں مانتے کہ پنڈت نہرو زندہ ہوتے تو الیکشن میں کانگرس کی کامیابی نمایاں ہوتی، شاید کانگرس کو پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں کچھ زیادہ نشستیں ملتیں لیکن پنڈت نہرو اور اندرا جی کے دور میں بہت زیادہ فرق نہ ہوتا۔ مدراس میں شری کامراج کی قیادت کو پنڈت نہرو بھی فیصلہ کن مانتے، اس لئے مدراس کا جو حال اب ہوا، وہ پنڈت نہرو کے دور میں بھی ہوتا۔ راجستھان میں پنڈت نہرو کی قیادت نے ۱۹۶۲ء میں بہت زیادہ نشستیں حاصل نہیں کیں، مدھیہ پردیش میں پہلے سے زیادہ کانگرس نے نشستیں حاصل کیں۔ کیرالا میں پنڈت نہرو کے زمانہ میں بھی کانگرس ہاری۔ ہاں دو تین ریاستوں میں کانگرس کا حال بُرا ضرور ہوا۔ اس لئے کانگرس اگر لوک سبھا اور بعض اسمبلیوں میں کمزور ہے تو اس کا سبب پنڈت نہرو کی موت نہیں ہے۔

آل انڈیا کانگرس کے صدر شری کامراج ہوں یا شری ایس۔ کے۔ پاٹل، نجلنگپا یا کوئی جندگ ہوں یہ کام بدرجۂ اولیٰ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کا ہے کہ وہ اپنی قیادت کو ایڈمنسٹریشن کے جنگل میں گم نہ ہونے دیں، بلکہ کانگرس کے نظریات اور مقاصد کو عوامی سطح پر پیش کریں اور ثابت کریں کہ قاید مغلوب نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے نظریات، مقاصد اور طریق کار کی راہوں سے غالب آتا ہے۔ اندرا جی کے باپ پنڈت نہرو کا کمال یہ تھا کہ ان کی قیادت ابھری ابھری سی رہتی تھی۔ وہ کوئی نہ کوئی بات ایسی کہتے اور کرتے تھے کہ کانگرس دوسری پارٹیوں سے ممتاز نظر آتی تھی۔ اندرا جی کی پچھلی وزارت عظمیٰ سے یہ نہ ہو سکا کہ عوامی مسائل اس انداز سے ابھرتے کہ عوام واہ واہ کرتے تھے جھوٹے اور بے ساختہ کہنے کہ کام یوں ہوتا ہے۔ طلبا کے جذبات کو نہ سمجھنا، قیمتوں کی گرانی کو اس طرح گوارہ کرنا کہ قیادت کی بے بسی ظاہر ہو، شکست خوردگی کی علامت تھی۔ اندرا جی معزز خاتون ہیں، لیکن اب کہ وہ "مرد میدان" ہیں، عوام ان کی ذات گرامی میں سکندر کی معرکہ آرائی، نپولین کا عزم، اشوک کی بصیرت، شیر شاہ کی جلالت قدر، اکبر کی سوجھ بوجھ دیکھنا چاہتے ہیں اور اس پر سے سیتا جی کی عصمت مآبی، نورجہاں کی انفرادیت پسندی، چاند بی بی کی جنگ آزمائی، رانی جھانسی کی فداکاری، ان کے حصہ میں آئے تو جمہوری ہندوستان کی اس دور میں بھی ایک نئی تاریخ بنے۔ جمہوری ہندوستان میں دوستوں اور رفیقوں سے مشوروں کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن لیڈر کی اپنی رائے بھی ہوتی ہے جس پر عمل کرنے میں قیادت کی آن ہے، شان ہے۔

دل کی گہرائیوں سے ایک بات نکلی ہے کہ اندرا جی کو اقلیتوں میں کام کرنا چاہیے۔ شری کامراج بہت بڑے لیڈر ہیں، لیکن ان کی شان میں ہم گستاخی نہیں کر رہے ہیں۔ جب یہ کہتے ہیں کہ وہ اقلیتوں کو نہیں سمجھتے۔ جنوبی ہند کا ایک لائق احترام لیڈر سمجھ ہی نہیں سکتا کہ شمالی ہند کی اقلیتوں کے مسائل کیا ہیں۔ شری ایس۔ کے پاٹل شاید اقلیتوں کو سمجھتے ہیں، لیکن ان کا انداز یہ ہے کہ اقلیتوں سے الٹی سیدھی مفاہمت کی جائے، چاہے کسی دروازے سے داخل ہو کر کی جائے۔ شری مرارجی ڈیسائی بھی اقلیتوں کو سمجھتے ہوں گے، لیکن اندرا جی کا سمجھنا اور ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ الہ آباد اور الہ آباد کمشنری کے ایک گاؤں کا مسلمان کیا چاہتا ہے، بنارس اور مرادآباد کا دستکار کیا چاہتا ہے، دلی کی گلیوں میں رہنے والے کس ڈھنگ سے سوچتے ہیں۔

اندرا جی کی وزارت عظمیٰ سے ہمیں بہت بڑی امید یہ ہے کہ وہ سیکولرازم کو صرف ایک نظریہ نہ بنائیں گی، بلکہ انداز زندگی اور طریق زندگی بنائیں گی۔ وزیر اعظم بننے کے بعد انہوں نے جو پہلی تقریر کی، اس میں سوشلزم اور سیکولرازم کے نام ہیں۔ وہ زمانہ ختم ہوا جب نعرے لگانا اور بڑی بڑی اصطلاحوں سے دل بہلانا کافی ہوتا تھا۔ پاکستان بن چکا، پھر

بھی ہم سیکولرازم کو ایک نعرہ ہی سمجھتے ہے۔ حالانکہ سیکولرازم کو نئے ہندوستان کا مستقل رویہ ہونا چاہئے تھا۔ سیکولرازم کا نام آج فرقہ پرست پارٹیاں بھی لینے والی ہیں۔ اس لئے کہ معاملہ اگر نظریات اور دستورِ عمل کا نہ ہو، تو نعرہ مارنے میں کسی کا کیا نقصان ہے۔ شری مرار جی دیسائی نے کبھی فرمایا تھا کہ کانگریس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ جمہوری آئین کی بنیاد اس نے سیکولرازم پر رکھی۔ ان کی بات تو صحیح ہے لیکن سیکولرازم پر جس حد تک عمل ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں فساد بھی ہوتا ہے، مسلمانوں کو جمہوری حقوق بھی نہیں ملتے، مسلم صنائع برباد ہیں، تعلیم گاہوں میں ہندو مسلم سوال پیدا کیا جاتا ہے، سرکاری ملازمتوں تک اقلیتوں کی رسائی کم ہوتی جا رہی ہے اور اردو آج بھی سرکاری زبان تسلیم نہیں کی جاتی۔ سب سے بڑی قیامت یہ ہے کہ اقلیتوں اور ان کے مسائل کا ذکر تک کرنا نامناسب سمجھا جاتا ہے۔

ملک کی سالمیت اور قومی یکجہتی کا نام بہت لیا جاتا ہے لیکن وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے یہ کہنا شاید گناہ نہ ہو کہ ناگالینڈ اور میزو لینڈ کے نعروں کے علاوہ پنجاب کی صوبہ میں وہ لوگ برسر اقتدار آئے ہیں رہ گئی جھینے پہلے کی بات ہے۔ (ک۔ د) جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک بفر اسٹیٹ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مدراس اور کیرالہ میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، اسے اس نگاہ سے دیکھئے کہ جنوبی ہند اور شمالی ہند میں ایک زبردست خلیج حائل ہو رہی ہے اور اگر یہی سیل دنیا رہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ ایک بلاک تیار نہیں ہو رہا ہے جو ہندوستان سے کٹنا چاہتا ہے۔ کیا معلوم کہ کل کلاں کو میسور اور آندھرا پردیش کا رخ کیا ہوگا؟

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں ایک گذارش یہ ہے کہ آزاد ہندوستان کے لیڈروں نے ان عناصر کے ہاتھ پچھلے بیس برسوں میں مضبوط نہیں کئے جو فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کے مقابلہ پر کھلی جنگ کرنا چاہتے تھے۔ اس جنگ کا جو ردعمل ہو سکتا تھا، ہمارے لیڈر اس سے خوف زدہ رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ پرستی نے ترقی پسندوں اور دلیش بھگتوں کو الیکشن میں ننگی کا ناچ نچایا اور آج واقعات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اقلیتیں بھی یہ سوچنے لگی ہیں کہ فرقہ پرستوں سے یارانہ کرنے میں برائی کیا ہے۔ اور ایسا اس لئے ہے کہ سیکولرازم محض ایک نعرہ ہے دستورِ عمل نہیں ہے۔ سیکولرازم اگر یہ ہے کہ اقلیتیں سہمی سہمی رہیں تو فرقہ پرستی اور سیکولرازم میں فرق ہی کیا ہے؟

ایک خرابی یہ بھی ہے کہ کانگریس اور اس کی حکومتوں کے پاس مفکرین یا دانشوروں کا کوئی گروہ نہیں ہے، جو مسائل پر غور کرے، اور ان کے حل تجویز کرے۔ پلاننگ کمیشن ضرور قائم کیا گیا لیکن ہندوستان کو ایک برین ٹرسٹ کی، دانشوروں کی ایک افادہ گاہ کی ضرورت ہے، جو حکومتوں کو، عوام کو، اقلیتوں کو نئی فکر اور نیا پروگرام دے، یہ کام پلاننگ کمیشن نہیں کر سکتا۔

بقیہ پروفیسر عبد الباری

طول و عرض ہندوستان میں ہم نے صرف ایک بہادر انسان دیکھا جس کا نام عبد الباری تھا جس نے ڈنکے کی چوٹ ٹوکی۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرساد سب ہی کو، کبھی نہیں کی بلکہ رو بہ رو جرح کر سکے۔ ان کی حق پرستی کا پورے ہندوستان میں ایک حریف تھا۔ باری کسی مقصد کے علمبردار ہوں تو صفیں برہم ہو جاتی تھیں۔ بھگدڑ مچ جاتی تھی۔

۱۹۳۶ء میں بہار میں کانگریسی وزارت برسر اقتدار آئی۔ جب سے پیش کئے گئے، رد کر دیئے۔ اس زمانے میں ان کے سیاسی دوست سابق وزیر اعلیٰ شری کرشن سنہا مہاشے اور سابق وزیر اعلیٰ پنڈت بنود انند جھا تھے۔ وہ دونوں چونکہ اس زمانے میں پارلیمنٹری سکریٹری تھے، اس لئے اصرار کیا گیا کہ وہ کم سے کم اسمبلی کی ڈپٹی اسپیکری کا عہدہ قبول کریں۔ وہ ڈپٹی اسپیکر (ی) قبول نہ کر سکتے تو دوستوں کی پوزیشن خراب ہوتی، اس لئے ڈپٹی اسپیکر بن گئے لیکن سرکاری کوٹھی قبول نہ کی۔ قدم کنواں کے ایک معمولی مکان میں رہتے، کرایہ ادا کرتے اور رہائش سے ہی کر عوام کے کام کرتے۔ پہنا کرتا ہے جیل ٹوٹی ہے۔ پاجامہ میں پیوند لگے ہیں، باری صاحب پٹنہ کے مخصوص ایکوں پر سوار ہیں۔ دو روز سے فنی سواری اپنے پیسے کرایہ ادا کر رہے ہیں۔ اور اس قلندرانہ شان سے عوام کے کام کر رہے ہیں۔

کانگریسی مسلمانوں کو مسلمانوں کے ایک طبقہ نے ہمیشہ برا سمجھا۔ انہیں نہرو اور ہندو کا غلام کہہ دینا تو آسان بات تھی، اور شاید آج بھی ہے لیکن اس الزام کی فیصلہ کن تردید پروفیسر باری تھے۔ ان کی خودداری نے کبھی دبنا سیکھا نہیں۔ غلط مفاہمتیں کرنا ان کی عادت نہیں تھی، عہدوں کو ٹھکرانا اور عوام کے لئے زندگی وقف کر دینا ان کا مزاج تھا۔

"مرد آہن" کا ذکر ہم نے بہت سنا ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں "مرد آہن" پروفیسر باری تھے۔ ان کی "نہیں اور ہاں" میں مجاہد کی آن تھی۔ آزادی سے کچھ پہلے مرکز میں جب عارضی وزارت بنی تو پروفیسر باری کا نام لیبر وزیر کی حیثیت سے آیا۔ انہوں نے نہیں کی آنا پاکرانے والا دنیا میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان کی رائے تھی کہ شری جگ جیون رام کو اس وزارت میں آنا چاہئے۔ اس رائے پر وہ قائم رہے، اور شری جگ جیون رام آخر بہار سے دلی آئے۔ وہ زندہ ہوتے تو آل انڈیا کانگریس کے صدر بھی بن سکتے تھے۔ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کی صدارت پر تو ان کا حق تھا۔ وہ ہندوستان کے وزیر داخلہ بھی ہو سکتے تھے۔ اور یہ مسئلہ بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ بہار کے وزیر اعلیٰ وہ ہوں گے — پروفیسر باری وزیر اعلیٰ ہوں ایک ایسے صوبہ کے جہاں ہاریوں اور انصاریوں کی اقلیت تھی۔

رفیع احمد قدوائی صاحب بھی لڑتے تھے لیکن باری صاحب کی لڑائیوں کو بہت گرم، بہت شوخ، بہت بیباک دیکھا۔ قدوائی صاحب مرکزی کابینہ میں اس لئے آ گئے کہ پنڈت نہرو انہیں قریب سے جانتے تھے، اور باری صاحب مرکز میں اس لئے نہ آ سکے کہ وقت سے پہلے شہید کر دیئے گئے۔ مرکز میں آنا انہیں پسند بھی نہ تھا اور بڑی بات یہ تھی کہ بڑے لیڈروں میں انہیں جھکنا نہ تھا، خوف کھاتا تھا۔ قدوائی صاحب کو قابو میں رکھنا آسان تھا۔ باری صاحب کو قابو میں رکھنا بہت زیادہ دشوار تھا۔



شری
چوان

مہاراشٹر کے رہنے والے ہیں، پکے کانگریسی ہیں۔ گاندھی جی کے فلسفۂ سیاست کو سمجھا، اور پنڈت نہرو کی سیکولرازم اور سوشلزم کو اپنا عقیدہ اور ایمان بنایا شری مرارجی ڈیسائی بمبئی کی وزارت اعلیٰ چھوڑ کر جب مرکز میں آئے، تو بمبئی کی وزارت اعلیٰ کے لئے نظر انتخاب ان پر پڑی۔ مسٹر کرشنا مینن جب وزارت دفاع سے الگ ہوئے تو وہ مرکزی کابینہ میں آئے اور وزیر دفاع بنے۔ اور ہندستان کی دفاعی دیوار میں جگہ جگہ جو چھید تھے، انہیں بند کیا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ چونکہ مہاراشٹر کے رہنے والے ہیں، اس لئے فرقہ وار معاملات میں ان کا ذہن صاف نہ ہوگا لیکن تجربوں نے بتایا کہ ان کا مزاج اور کردار سیکولر ہے۔ فرقہ پرستی ان کے نام سے دور بھاگتی ہے۔

وہ آج ہندوستان کے وزیر داخلہ ہیں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ پچھلے بیس برسوں میں وزیر داخلہ ایک سے ایک ہوئے لیکن شری چوان کی ٹکر کا ایک وزیر داخلہ ہندوستان کو نہیں ملا۔ سردار پٹیل یہ گتھی نہ سلجھا سکے کہ فرقہ پرستوں کو کس حد تک دبانا چاہیئے اور کس حد تک اٹھانا چاہیئے، شری راج گوپال اچاریہ پانی کی طرح بہتے رہے پتھر بننا نہیں جانتے، ڈاکٹر کاٹجو گورنر اچھے تھے۔ وزیر داخلہ ناکام تھے۔ پنڈت پنت کی سیاسیات عالیہ وزارت داخلہ کو فیصلہ کن پالیسی نہ دے سکی۔ شری لال بہادر شاستری ٹیڑھی ترچھی راہوں میں کھو گئے۔ شری نندہ اتنے بڑے سادھو ہیں کہ حقیقت پسند وزیر داخلہ نہ ثابت ہو سکے۔ اس لئے ہندوستان کی داخلی زندگی میں جو گھٹا ٹوپ ہونا چاہیئے تھا، نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہرو کی سیکولر پالیسی میں ناکامی کا سب سے بڑا سبب وزارت داخلہ ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ وزیر داخلہ شری چوان میں کیا خوبیاں اور کیا کمیاں ہیں لیکن ہم نے محسوس کیا ہے کہ شری چوان وزیر داخلہ ہوتے تو گورکشا اندولن اس حد تک بے لگام نہ ہوتا جس حد تک ہوا۔ کم سے کم جگت گرو شنکر اچاریہ دریوتا نہ بنتے۔

فرقہ وار فسادات شری چوان کے دور وزارت میں بھی ہوئے۔ لیکن آزاد ہندوستان کی تاریخ میں شاید پہلی بار نظام آباد کے ذمہ دار حکام کا فوری تبادلہ کیا گیا۔ اور مرکزی وزارت داخلہ نے ہدایت کی کہ سماج دشمن عناصر سے کسی قسم کی رعایت نہ کی جائے۔ معتبر ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سہارن پور کے فساد کے سلسلہ میں حکام سے تین تین بار باز پرس کی گئی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ مرکزی وزارت داخلہ نے فسادات کے سلسلہ میں وہ ضروری کارروائیاں کیں جو اسے کرنی چاہیے تھیں۔ لیکن وزیر داخلہ کے رویہ میں کھاؤ ہے ڈھیل نہیں ہے۔

شری چوان پچھلے دنوں وزیر دفاع تھے۔ ایک بہت بڑی فوجی ملازمت کے لئے ایک لائق مسلم نوجوان کی درخواست آئی۔ نوجوان کے اعزا پاکستان میں تھے۔ انتخابی بورڈ نے اسے منتخب کر لیا۔ جب میڈیکل بورڈ کی جانچ کی باری آئی تو نوجوان کا وزن کم تھا۔ معاملہ وزیر دفاع شری چوان سے رجوع کیا گیا۔ ان کے سامنے یہ رپورٹ بھی تھی کہ نوجوان کے اعزا پاکستانی ہیں اور میڈیکل بورڈ کی یہ رپورٹ بھی تھی کہ وزن کم ہے۔

شری چوان نے فیصلہ کیا کہ نوجوان کے اعزا پاکستانی ہیں تو ہوا کریں، وہ خود تو ہندوستانی ہے۔ رہا وزن کا سوال تو یہ نظر انداز کیا جائے۔ یہ نوجوان بیسیوں امیدواروں میں ایک نوجوان تھا جو اونچی سرکاری ملازمت کے لئے لائق ترین امیدوار سمجھا گیا۔ اور اس کا تقرر عمل میں آیا۔

ہم اس رویہ کی قدر کرتے ہیں۔ وزرا اگر فرقہ وارانہ متعلق بحثوں میں نہ پڑیں اور صاف اور سیدھے فیصلے کریں تو مجبوروں کو انصاف مل سکتا ہے۔ بقیہ صفحہ ۴۶



بقیہ حبیب الرحمٰن لدھیانوی

نے شاید ہی کسی لیڈر نے انگریز سامراج کے خلاف وہ مورچہ بندی کی ہو، جو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کی۔ انگریز حکومت اور اس کے پنجابی حلیفوں نے مولانا کو جتنا بڑا باغی، جتنا بڑا غدار سمجھا، شاید مہاتما گاندھی کو بھی نہ سمجھا ہو۔ ایک موقعہ ایسا بھی آیا کہ ہندوستان کے تمام اسیران سیاسی رہا کر دیئے گئے مگر مولانا سے انگریز کو اتنا بڑا خطرہ تھا کہ انہیں رہا نہیں کیا گیا اور رہا بھی کیا تو بادل ناخواستہ کیا۔

ہندوستان کے صف اوّل کے لیڈروں سے مولانا کے گہرے رابطے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو وہ عزیز تھے۔ گاندھی جی ان کے خطوط پر دیر تک غور و فکر کرتے اور اپنے سکریٹریوں کو ہدایت کرتے کہ جواب خط میں کوئی نامناسب لفظ نہ آئے، ورنہ حبیب الرحمٰن ایک ایک لفظ پر مجھ سے برسوں لڑیں گے۔ مولانا کی حق گوئی سے گاندھی جی کے ایک انگریز سکریٹری جلد تنگ آگئے تھے اور انہوں نے کئی بار کوشش فرمائی کہ گاندھی جی اور مولانا حبیب الرحمٰن کی ملاقات نہ ہو۔

مسٹر محمد علی جناح کو مولانا حبیب الرحمٰن سے اور مولانا حبیب الرحمٰن کو مسٹر محمد علی جناح سے سیاسی اختلاف تھا۔ مگر جناح صاحب بھی اختلاف کے باوجود مولانا کی رائے کی قدر کرتے تھے۔

بہت دنوں کی بات ہے کہ مولانا لاہور کے ممتاز ایڈیٹروں سے گفتگو کر رہے تھے۔ ایک ایڈیٹر صاحب نے ان کی انگریز دشمنی پر طنز فرمایا۔ انہوں نے جواب دیا کہ انگریز کی دولت مجھے دلوا دو تو میں تمہاری طرح انگریز کی مداحی کروں گا۔ ایڈیٹر صاحب لاجواب ہو گئے۔ ایک دوسرے ایڈیٹر صاحب نے (جو ہندوستان میں آج بھی موجود ہیں) مولانا سے پوچھا کہ کیا ہندوستان میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جسے انگریز کی دولت نہیں خرید سکتی۔ جواب دیا کہ "صرف تین ہیں۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد جو اصول پسند ہیں، اس لئے انگریز ان کی قیمت ادا نہیں کر سکتا۔ دوسرے مسٹر جناح (اس زمانہ میں مسٹر جناح کا بہت زیادہ نام نہ تھا) جو اتنے شاندار ہیں کہ انگریز کو خاطر میں نہیں لا سکتے۔ تیسرے گاندھی جی جن کی دیانتداری کی قیمت انگریز سامراج کا خزانہ ادا نہیں کر سکتا۔

مولانا بہت اچھے مقرر تھے، تقریر کرتے تو مجمع پر چھا جاتے۔ لیکن بڑی بات یہ تھی کہ وہ دانش وروں کی مجلس میں گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا کہ یہ عوامی جلسوں کے حبیب الرحمٰن نہیں بلکہ سراپا دانش و آگہی ہیں۔

مولانا کا وطن لدھیانہ تھا۔ اس لئے تقسیم ملک کے بعد انھیں اس زمانہ کے مشرقی پنجاب ہی میں رہنا چاہیے تھا۔ اور لدھیانہ کے واقعات ایسے تھے کہ وہ پاکستان جا سکتے تھے، وہاں ان کے رفقا تھے، ان کے خاندان کے ممتاز افراد تھے لدھیانہ کے کانگرسی لیڈر بھی تھے، لیکن کچھ بات ہی ایسی تھی کہ مولانا تقسیم ملک کے بعد دلی آئے اور کوچہ رحمٰن (دلی) میں ایک ایسی مسند لگائی جسے ہم تو رشد و ہدایت کی مسند ہی کہتے ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد دلی میں بعض لیڈروں سے انھیں اختلاف بھی تھا، لیکن اختلاف کے باوجود ان کے انداز میں غیر معمولی توازن تھا۔ انہوں نے ہندی مسلمانوں کو صحیح مشورے دیئے اور سیدھی راہ دکھانے کی کوشش کی۔

عمر نے وفا نہ کی، ورنہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد ان کی جانشینی کا حق ادا کرتے۔ ہندوستان کی تقسیم نہ ہوتی تو مولانا مرکزی وزارت کے مشیر خصوصی ہوتے ارباب سیاست و کشادگی محفل کی رونق ہوتے، لیکن یہ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ہندوستان جب آزاد ہوا تو ہندو اور مسلمان کا سوال ایک پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا اور اس پہاڑ کی اوٹ میں کوچہ رحمٰن کے ایک مکان ہی میں مولانا آباد ہو سکے تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے ایک صاحبزادے مولوی عزیز الرحمٰن ایک ابتدائی اسکول کے معلم اور نگراں ہیں۔ دوسرے صاحبزادے مولانا خلیل الرحمٰن پنجاب ہوڑی کی سیر فرما رہے ہیں۔ تیسرے صاحبزادے لدھیانہ میں ہیں اور کہتے ہیں کہ کامیاب ہیں دو صاحبزادے اور ہیں جو کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ سہاروں کے محتاج نہیں ہیں۔

یہ حال ہے اس خاندان کا جو کم و بیش چار پشتوں سے انگریز کا باغی رہا۔ اور جس کی ایک مستقل تاریخ ہے جس کے فتووں نے ہندوستان کی مشترک تہذیب کو توانائی بخشی۔

بقیہ شری چوان

شری چوان ایک کارگزار اور کارساز وزیر ہیں۔ جسے بڑے افسروں کو جنھیں سکریٹریٹ میں فراعنہ کا درجہ حاصل ہے، ہم نے شری چوان سے مرعوب دیکھا۔ افسروں کا بیان ہے کہ فائلوں پر ان کی نوٹنگ کو رد کر دینا، اور نئی نوٹنگ کرنا شری چوان کے لئے بالکل معمولی بات ہے۔

شاید یہ افشائے راز نہ ہو کہ پچھلے دنوں مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں مرکزی کابینہ کے جس وزیر نے مسلم رائے عامہ کا احترام کیا، وہ مسٹر چوان تھے۔

ہندوستان کے اول درجہ کے سیاستدانوں میں ان کا شمار ہے۔ وہ چاہتے تو وزارت عظمیٰ کے امیدوار بھی ہو سکتے تھے لیکن حق یہ ہے کہ ان کی دیانت کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ مسز اندرا گاندھی ہی وزیر اعظم ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کہ عوام کے بہت بڑے طبقہ کی انھیں تائید حاصل ہے۔ اور اس معاملہ میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ مسٹر چوان کے اس عظیم کردار کی ہمیں داد دینی چاہیے کہ ان کی انا میں کبھی سرکشی نہیں ہوئی۔



انگلینڈ کے بادشاہ چارلس ہشتم کے لئے جب موت کی سزا تجویز کی گئی اور اسے پھانسی کے تختے پر لیا گیا تو سردی کی شدت سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ چارلس نے اپنی آخری خواہش کے طور پر اوڑھنے کے لئے ایک کمبل طلب کیا۔ اس نے کہا "میں قوم کی بھلائی اور بہبودی کی خاطر یہ سزا پا رہا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ لوگ کہیں کہ میں خوف سے کانپ رہا ہوں۔"

مرحوم شاہ نیپال کے داماد رانا شیر جنگ بہادر لندن میں ایک شاہی ضیافت میں مدعو تھے۔ آرکسٹرا اور موسیقی کے بعد ایک شخص نے پوچھا "آپ کو ہماری موسیقی پسند آئی؟" شاہ نے کہا "ہاں" [illegible] "آپ تو ہماری موسیقی سے واقف نہیں" [illegible] "ہاں"

شاہ نیپال نے کہا [illegible] زبان سے واقف [illegible]



قیوم انصاری

صوبہ بہار کی جس مردم خیز زمین نے بڑی بڑی شخصیتوں کو وجود بخشا۔ جس نے عظیم علماء، فضلاء، شعراء، ادباء، فن کار، قانون داں اور لیڈروں کو جنم دیا۔ جس زمین نے دم توڑتی ہوئی اہل حدیث تحریک کو پناہ دی اور حضرت اسمٰعیل شہید کے جھنڈے تلے لڑنے والے جانباز مجاہدوں کا مرکز بنی رہی۔ جس زمین نے فقہ اور حدیث کے ممتاز علماء پیدا کئے۔ جہاں مولانا مظہر الحق۔ شاہ زبیر، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد، پروفیسر عبدالباری، مسٹر علی امام، مسٹر حسن امام، خورشید حسنین، سری کرشن سنہا، بابو انوگرہ نرائن سنہا ہندوستان کے مشہور صحافی عبدالباقی، شاہ عزیر منعمی، اور سید محمد عقیل۔ جیسی شخصیتیں پروان چڑھیں۔ اسی سرزمین نے عبدالقیوم انصاری جیسی شخصیت کو آل انڈیا سطح پر نمایاں کیا۔ قیوم انصاری نے بہار میں آنکھیں کھولیں یہاں کے مذہبی ماحول میں انکی پرورش ہوئی اور خوشحال گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود انہیں ایک مزدور اور فقیر کا سا دل ملا۔ اور یونیورسٹی اور مغربی تعلیمات کی چمک دمک کے باوجود انہیں ہندوستان کی سادہ اور پرکشش کھادی کا لباس پہنا دیا۔ جو شخص برطانوی سامراج کا اعلیٰ آفیسر ہو سکتا تھا۔ اسکے دل کو قومی درد نے تڑپایا۔ اور ملک کی آزادی کیلئے اسے جوش وخروش بخشا۔

قیوم انصاری نے کمر ہمت باندھی اور کردار کی استقامت کے ساتھ سیاسی آندھیوں کے تیز و تند تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کاروان حیات کے ساتھ بڑھتے ہوئے نعرے لگائے۔ تقریریں کیں۔ گالیاں سنی۔ طعنے سہے ۱۹۴۷ کے فسادات سے گزرے۔ لیکن مشترکہ قومی زندگی کا جو کارواں بڑھ رہا تھا اس سے کبھی الگ نہ ہوئے قیوم انصاری کی دیانت داری خلوص مقصد کی بلندی کردار کی پختگی اور عزم و یقین نے انہیں قومی لیڈرشپ کے پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ اور وہ بہار کی سیاست پر چھا گئے۔ اور بہار صوبائی کانگریس کمیٹی کی کرسی صدارت پر جلوہ گر ہوئے۔

قیوم انصاری کیلئے وزارت کی کرسی کوئی آخری منزل نہ تھی بلکہ قومی زندگی کے کاروان کا ایک سفر تھا۔ جسے انہوں نے سادگی خلوص سچائی اور ایمانداری کے ساتھ طے کیا۔ وزارت سے پہلے اور وزارت کے بعد بھی عوام کے ساتھ عوامی تحریکوں میں کام کرتے رہے۔ ہر حالت میں اس مفکر دل سادہ صورت انسان کی جبینِ نیاز ہمیشہ دربار الٰہی کی چوکھٹ پر جھکی رہی۔ تعلیمی اداروں کی سنڈیکیٹ کی مجلس ہوں۔ یا صوبائی کانگریس کا دفتر صداقت آشرم یا کابینہ کی اہم میٹنگ۔ اللہ اکبر کی ایک صدا قیوم صاحب کو قیام وسجود کے لئے کھینچ لاتی ہے۔

قومی زندگی کی ہماہمی میں دلچسپی رکھنے کے باوجود مذاہب کا یہ جوڑ بڑا ہی معنی خیز اور یہ بتاتا ہے کہ انصاری صاحب کا اصل رابطہ کہاں سے ہے۔ وہ عام ملک اور مالک حقیقی سب کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اور کبھی اپنے فرض کی ادائیگی سے پیچھے نہیں لوٹے۔ انکے رویہ کا یہی اعتدال تھا جس نے انہیں بلا امتیاز مذہب وملت اپنوں پرایوں دونوں ہی میں ہر دلعزیز بنا دیا۔

انصاری صاحب نے جہاں بہار کی قومی زندگی سے دلچسپی لی۔ وہاں اچھوتوں کو دیکھے اور انصاری برادری کیلئے مشعل راہ بنے۔ انصاری برادری صدیوں سے پسماندگی کا شکار تھی۔ انصاری صاحب نے برادری کی گرتی ہوئی جھونپڑیوں کو اٹھایا۔ اسے روشنی دی۔ حیات تازہ بخشا اور انکی تاریکیوں میں اجالا کر دیا۔ انصاری برادری کا ایک بڑا طبقہ آج قومی زندگی کے دھارے سے بہت قریب ہے۔ تعلیمی اداروں میں۔ فنی تربیت گاہوں میں۔ سرکاری دفاتر میں۔ میدان سیاست میں اور علم و ادب کی مجالس میں ہر جگہ پر پوری ہماہمی اور جوش وخروش کے ساتھ اس برادری کے لوگ معروف عمل نظر آرہے ہیں۔ مایوسی۔ پست ہمتی اور پسماندگی سے نکال کر روشنی کی طرف انصاری برادری کو لانے میں انصاری صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ کسی چاپلوسی، ملت سے غداری اور مرعوبیت سے نہیں بلکہ خداداد سچائی ایمانداری اور خلوص نیت نے انصاری صاحب کو عوام کا قائد بنایا اور انہیں ہر دلعزیزی عطا کی۔ انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب انصاری صاحب نہ صرف بہار کے قائد رہیں گے بلکہ ملکی سیاست میں بھی ان کا رول نمایاں ہوگا۔ ویسے بھی موصوف آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کے رکن رہ چکے ہیں۔ اور اپنی اہلیت وصلاحیت کا ثبوت بارہا دے چکے ہیں۔

کانگریس کی قومی قیادت میں جو کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ اسکے لئے انصاری صاحب نہایت موزوں ہیں۔

انسان کی خدا ترسی عاجزی۔ انکساری اور دیانت داری کبھی نہ کبھی رنگ لاتی ہے اور اب وقت آچکا ہے کہ یہ بات انصاری صاحب کے حق میں بھی صادق آئے۔ ہماری دعا ہے کہ انصاری صاحب بلا امتیاز مذہب وملت نسل ورنگ فرقہ وبرادری یکساں طور پر قومی قیادت میں آگے بڑھتے رہیں اور ملک کی خدمت انجام دیتے رہیں۔



جب سن شعور کو پہنچا تو کم و بیش پچاس سال تک ناسازگار ماحول میں ایک عقیدہ ایک مسلک کا پابند رہا، اپنی سہتا رہا، دوسروں کی سنتا رہا، اور ان ایسا آدمی جس کے پندار کے بادل جھوم جھوم کر اٹھتے تھے، اور ٹوٹ ٹوٹ کر برستے تھے برشونفاہمت اور مطابقت کی راہیں تلاش کرتا رہا۔

" ہندوستان نے آزادی جیت لی " انگریزی کی تصنیف ہے، تو اس میں ان کے حساس دل نے کبھی کبھی بولنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کی یادداشت کے وہ صفحات جو اب تک ایک بند کتاب کا درجہ رکھتے ہیں، آخر کیا ہوں گے کوئی کوئی بات ہی ہوگی کہ یہ اوراق شائع نہیں کئے گئے۔ لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں اس آزاد کے بول ہوں گے۔ جو ان کی زندگی میں کبھی نہ سنے گئے، وہ بصیرت ہوگی جس نے خود ہی زندگی کو نئے انداز سے سمجھا ہوگا۔

مولانا نے ان سطروں کے لکھنے والے کو ڈانٹا بھی تھا۔ یہ موقع تھا کہ مسلمانوں کے ایک مسئلہ پر نہایت جوشیلی، جذباتی باتیں کہی جارہی تھیں۔ مولانا نے تنک کر فرمایا تھا خاموش رہئے۔ ایسی باتوں کا وقت ابھی نہیں آیا۔ کبھی آئے گا۔ اس ڈانٹ نے مجھے سکھایا تھا کہ باتیں ہمیشہ نہیں کی جاتیں بلکہ ان کا ایک وقت ایک موقعہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف مرحوم ایک بار مولانا سے کمیونزم پر گفتگو کر رہے تھے۔ مولانا نے گریز کی راہ اختیار کرتے ہوئے فرمایا کہ ابھی تو سب بڑی کمیونزم یہ ہے کہ آپ عوام کو سمجھیں اور اگر آپ نے عوام کو سمجھ لیا تو یہ بھی سمجھ لیں گے کہ دھرم اور مذہب کی عوام میں کیا اہمیت ہے۔" اشرف کا بیان ہے کہ مولانا کی تنبیہ کے بعد میری کمیونزم ایک نئے سانچے میں ڈھل گئی۔

کیا قارئین باور کر سکیں گے کہ مولانا سے جو رہنمائی ہندوستان کے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کو ملتی تھی وہ پنڈت نہرو سے بھی نہیں ملتی تھی اور یہ حال تھا اس مولوی کا جسے امام الہند کہا گیا ہے اور جس کی فکر و دانش نے بڑے بڑے مارکسٹوں کو سیدھی راہ دکھائی تھی۔

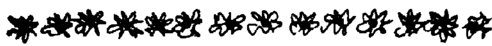
مشہور انقلاب پسند رہنما شہید بھگت سنگھ نے کسی طرح ایک بار مولانا سے ملاقات کی۔ مولانا نے فرمایا کہ عمل کو یوں کا تابع نہ کرو۔ فکر کو یوں کا تابع کرو " بھگت سنگھ کم و بیش ایک سال تک اس فقرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔

مولانا کے جنازہ کا جلوس دھوم دھام سے دلی میں نکلا۔ کاش ان کا مزار پاک کہیں راج گھاٹ میں ہوتا، لیکن اس مسئلہ پر اختلاف رائے ہے۔ جامع مسجد دلی سے ان کا قرب بھی مناسب ہی ہے لیکن جو بات سوچنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا کی وفات حسرت آیات کے بعد کچھ اونچے سیاسی حلقوں میں تدبیریں کی گئیں کہ ہندوستان میں کوئی دوسرا ابوالکلام آزاد نہ پیدا ہو۔ یہاں تک احتیاط کی گئی کہ جب حلقۂ انتخاب کی نامزدگی کرتے تھے۔ وہاں کوئی ایسا شخص کھڑا نہ ہو جو آگے چل کر ابوالکلام کی جانشینی کا دعویٰ کرے، کیا یہ جمہوریت کا ٹھیٹھ اور اچھا نہ تھا۔ ابوالکلام آزاد صدر جمہوریہ نہ ہو سکے انجمن اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر نہ ہو سکے، لیکن کیا یہ بھی ہونا چاہیئے تھا کہ کسی دوسرے ابوالکلام آزاد کے لئے جمہوری ہندوستان کے دروازے بند کئے جائیں۔ کیا کسی کے بند کرنے سے یہ دروازے بند ہو سکتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ مولانا نے ہندی مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کیا، حالانکہ اگر انہوں نے اتنا ہی کیا ہو کہ ہندوستان میں کسی پارٹی کی فرقہ پرستانہ ڈکٹیٹر شپ قائم نہ ہو سکی۔ اور تقسیم ملک کے بعد ہندی مسلمانوں کا وجود کسی حد تک بھی تسلیم کیا گیا تو یہ اتنی بڑی خدمت تھی، جسے آنے والی نسلیں محسوس کریں گی اور آنے والے زمانہ کا مورخ اسے اپنی تاریخ کا عنوان بنائے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد، فخر ملک تھے۔ فخر ملت تھے، فخر عالم تھے اور نئے ہندوستان نے انھیں سمجھنے کی کوشش کی، تو ان کی زندگی اور ان کے رول پر رہتی دنیا تک موٹی موٹی کتابیں لکھی جائیں گی۔ گاندھی جی نے ہندوستان کو وہ فلسفۂ زندگی دیا، جسے شراب کہن مینائے نو " ہی میں کہہ سکتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے سلطانئ جمہور " کے لئے راہیں ہموار کیں، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد مشترک ہندوستان کی بجائے خود ایسی تصنیف تھے۔ جسے شاہکار کہا جا سکتا ہے اور یہ شاہکار صدیوں میں کبھی ایک بار تخلیق کیا جاتا ہے۔ اس شاہکار کے لئے اقلیم فکر و عمل کے شہنشاہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ شہنشاہی مولانا کی میراث تھی۔

سلام: ان کی روح کو ہزار ہزار بار سلام!



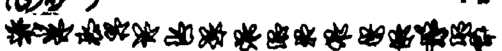
اجمل جینتی

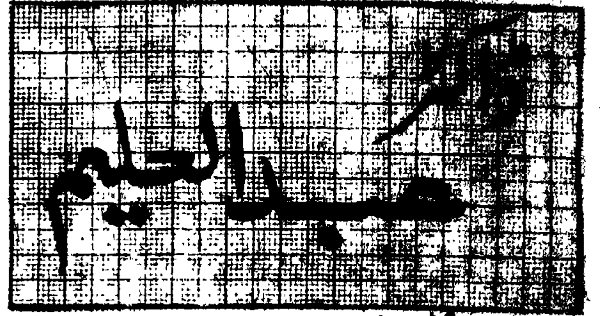
دہلی ۱۹ر جنوری۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم شیدا کی تاریخ پیدائش ۱۷ر شوال ہے، لہٰذا اس سال بھی ہر شہر قصبے اور گاؤں میں ۱۷ر شوال مطابق ۱۸ر جنوری سے ۲۵ر جنوری تک اجمل جینتی منایا گیا۔

آل انڈیا ریڈیو سے ۲۹ر دسمبر ۷۶ء کو مسیح الملک کی یادگار پروگرام نشر کیا گیا۔

اجمل میموریل کمیٹی کے جنرل سکریٹری پروفیسر حکیم مظہر الدین اجمل ایڈیٹر رسالہ مسیح الملک نے اجمل اعظم کے مشن سے فائدہ اٹھانے والوں سے خاص طور پر جینتی منانے کی اپیل کی تھی تاکہ مسیح الملک مرحوم کے مشن قومی اتحاد اور دیسی طریقہ علاج کو ملک میں رائج کر کے ہندوستانی ہیلتھ سدھار کے ذریعہ ملک کو خود کفیل بنایا جائے۔

(سکریٹری)





ڈاکٹر عبدالعلیم کی جنم بھومی غازی پور ہے۔ ۱۹۰۶ء ان کی ولادت کا سنہ ہے۔ پہلے ان کے نام کا ایک جز احراری بھی تھا یعنی ان کا پورا نام عبدالعلیم احراری تھا۔ احراری وہ یوں تھے کہ ملا جامی کے پیر و مرشد خواجہ عبیداللہ احرار کو انکے خاندان سے نسبت تھی۔ خواجہ عبیداللہ کا خاندان وسط ایشیا سے منتقل ہوکر جب ہندوستان آیا تو اس کی ایک شاخ غازیپور میں آباد ہوگئی

عبدالعلیم صاحب نے ابتدائی تعلیم غازیپور میں حاصل کی۔ تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت کا جب دور آیا تو انہوں نے تعلیم ترک کردی۔ بزرگوں نے طعنہ دیا کہ تعلیم سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ اس پر انہوں نے میٹرک کا امتحان دینے کا ارادہ کرلیا اور والد محترم سے یہ شرط منوالی کہ امتحان پاس کرنے کے بعد وہ جس تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں گے، تعلیم حاصل کریں گے۔ میٹرک کا امتحان انہوں نے اول درجہ میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اور انھیں سرکاری وظیفہ بھی ملا۔

امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہوئے، جو اس زمانہ میں علی گڑھ میں تھی۔ عربی ادب کی تعلیم علامہ سورتی سے اور اسلامیات کی تعلیم مولانا اسلم جیراجپوری اور خواجہ عبدالحی فاروقی سے حاصل کی۔ جامعہ سے بی۔اے آنرز کیا۔ وہ ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے۔ جامعہ کے "فرسٹ الیون" میں ان کا شمار تھا۔ جناب شفیق الرحمن قدوائی مرحوم کی کپتانی میں وہ بہت اچھا کھیلتے تھے۔

بی۔اے آنرز کرنے کے بعد وہ جرمنی تشریف لے گئے۔ اور مشہور مستشرق بیکر کی نگرانی میں اسلامی علوم وفنون پر ریسرچ اور ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی کیا۔ ان کی تحقیق کا موضوع "اعجاز قران کی تاریخ" تھا۔ جرمنی سے واپس آئے تو جامعہ کی "اردو اکادمی" میں کام کرنے لگے۔ اکاڈمی میں ان کے دوسرے رفیق پروفیسر سعید انصاری ایم۔اے (کولمبیا) تھے۔ جنہوں نے جان اسٹوریٹ مل کی تصنیف "لبرٹی" کا اردو میں ترجمہ کیا اور ڈاکٹر علیم صاحب نے ربانی اور خطابی کے دو عربی رسالے اڈیٹ کئے۔ دو سال رسالہ جامعہ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ۱۹۳۴ء سے الگ علی گڑھ یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ اور ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۰ء تک لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسری کی۔ اور ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ واپس آگئے، ۱۹۴۱ء میں انگریز

سرکار نے انھیں اس شبہ میں نظر بند کرلیا کہ وہ کانگرس کی "انفرادی سول نافرمانی" کی امداد کرتے ہیں۔ ایک سال تک وہ نظر بند رہے۔ لکھنؤ میں وہ اردو کے جریدہ "ہندوستان" کے مینیجنگ اڈیٹر بھی تھے۔ جس کے اڈیٹر جناب حیات اللہ انصاری ایم۔پی تھے۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے وہ جنرل سکریٹری بھی تھے۔ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ دینیات و اسلامیات کے ہیڈ مقرر کئے گئے، ۱۹۵۴ء میں ان کی نگرانی میں ایک نیا شعبہ قائم کیا گیا، جس کا نام ہے سنٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز۔

ڈاکٹر علیم نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا۔ جس میں اسلامی علوم وفنون پر ۲۵ ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں۔ مخطوطات تو کئی کتب خانوں میں ہیں، لیکن اسلامی وعلوم وفنون پر مطبوعہ کتابوں کا اتنا بڑا کتب خانہ ہندوستان میں کہیں نہیں ہے۔ ایک سہ ماہی رسالہ بھی ان کی نگرانی میں نکلتا ہے جس کا نام مجلہ علوم اسلامیہ ہے۔

جامعہ ملیہ میں اونچی جماعتوں کے طلباء کی ایک انجمن اتحاد تھی، جس کے وہ نائب صدر بھی منتخب کئے گئے۔ یہ انجمن کی نائب صدارت کسی طالبعلم کے لئے سب سے بڑا اعزاز تھی۔ انجمن کی نائب صدارت جناب شفیق الرحمن قدوائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ رانا جنگ بہادر، ڈاکٹر محمود حسین خاں (وزیر امور کشمیر، پاکستان) نے بھی کی تھی۔ اور ڈاکٹر اشرف کی خطابت انجمن اتحاد ہی کی آغوش میں پلی تھی۔

جامعہ کے اساتذہ میں ایک بزرگ تھے، جو اگرچہ سائنس اور ریاضی کے استاد تھے مگر پھبتیاں کہنے اور فقرے چست کرنے میں بھی استاد تھے ڈاکٹر علیم سے نہ رہا گیا۔ اس لئے علامہ منطقی کے عنوان سے انہوں نے ایک مضمون لکھا، جسے جامعہ والوں کی ادبی و علمی تخلیقات میں طنزیات کی حد تک شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ عربی ادب کے نصاب میں "طقطقہ" کا نام تھا جسے علیم صاحب نے اپنے مطلب کے لئے استعمال کیا تھا۔ کہ فقرہ باز استاد نے اس کے بعد اعتدال کی راہ اختیار کرلی۔

ڈاکٹر علیم تحریک آزادی کا نتیجہ ہیں۔ ان کی ترقی پسندی میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ جرمنی جانے سے پہلے وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، جرمنی سے واپس آئے تو ان پر تشکیک کا ایک عالم طاری تھا، کہ کون کیا ہے اور کہاں ہے؟ اسی سلسلہ میں انہیں کمیونزم سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ لیکن جوں جوں پختہ کاری آئی ان میں فکری توازن قائم ہوگیا۔ اور آج وہ ہندوستان کے ان چند مسلم دانشوروں میں ہیں جن کی بیدار روشنی سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔ ان پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ وقت کے سیلاب کو تھام کر، وہ اسلام، مسلمانوں اور ہندوستان کی خدمات انجام دیں گے۔

جب یہ خبریں آنے لگیں کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے والے ہیں، تو مختلف حلقوں نے مسرت کا اظہار کیا۔

دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے ذمہ داروں نے انہیں مبارک باد دی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی شرافت، سمجھ داری اور اونچے کردار کو سراہا۔ وہ یقین ہے کہ اکثر مذہبی اہم مذہبی حلقے وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کے تقرر کا خیرمقدم کریں گے۔

"کاروانِ وطن" نے ایک خبر شائع کی تھی، جس میں کہا تھا کہ یونیورسٹی کے اسٹاف سے ڈاکٹر ضیاءالدین کے بعد ڈاکٹر عبدالعلیم کا دوسرا تقرر ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ضیاءالدین کا تقرر بھی براہِ راست اسٹاف سے نہیں تھا۔ وہ پہلے اسٹاف میں، پھر کالج کے پرنسپل ہوئے اس کے بعد ابراہیم رحمت اللہ کمیٹی نے رپورٹ پیش کی، پرو وائس چانسلری سے مستعفی ہوئے، اس کے بعد وائس چانسلر مقرر کئے گئے۔ ان کے مقابلہ میں ڈاکٹر علیم کا براہِ راست اور فی الفور اسٹاف سے ہوا ہے۔

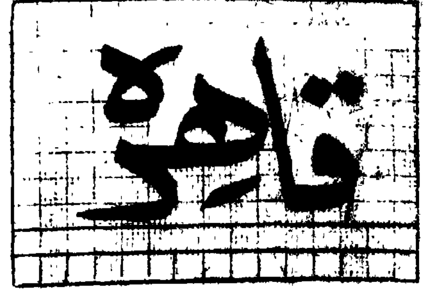
مسلم یونیورسٹی میں جس شعبہ کے وہ صدر تھے، اس کا انتظام بہت اچھا کیا۔ سیاسی و مذہبی وابستگیوں میں فرق کئے بغیر انہوں نے جمعیت علما، جماعت اسلامی، کانگرس اور کمیونسٹوں کے افراد تمندوں کو خدمت کا پورا موقع دیا یہ اچھا ہوا یا برا لیکن کسی یونیورسٹی کے لئے نہایت مناسب طریق کار ہے یونیورسٹیاں اس لئے نہیں ہیں کہ سیاسی صف آرائیاں کریں بلکہ اس لئے ہیں کہ مختلف نظریات کے ٹکراؤ سے ایک صالح زندگی پیدا کریں جو معاشرہ اور ملک و ملت کے کام آئے

وائس چانسلر کی حیثیت سے ڈاکٹر عبدالعلیم کے تقرر کا مسلم یونیورسٹی میں ردعمل ہے کہ انصاف کیا جائے گا۔ اور ہم ڈاکٹر علیم کو ۲۰ سال کی لمبی مدت میں جس حد تک سمجھ سکے ہیں، اس کا نچوڑ یہ ہے کہ واقعی انصاف ہوگا، اور مسلم یونیورسٹی کی فضا صحیح تعلیم کے سازگار ہوگی۔ سابق وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ کے بھی ہم قدردان ہیں، لیکن سفارتی خدمات نے انہیں سو فیصدی ڈپلومیٹ بنا دیا ہے۔ اور ایک ڈپلومیٹ کی خوبی یہ ہے کہ معاملات کو صاف نہیں کرتا، بلکہ مبہم اور "گول" رکھتا ہے۔ یقین ہے کہ ڈاکٹر علیم معاملات صاف کریں گے اور سب سے انصاف کریں گے

امید ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ و طلبا یونیورسٹی کو صرف وائس چانسلر کا معاملہ نہیں سمجھیں گے بلکہ مل جل، مشترک ذمہ داریوں کی اہمیت محسوس کریں گے۔

ہم ایک مفکر، ایک دانشور، بالغ النظر ایڈمنسٹریٹر کی وائس چانسلری کا مخلصانہ خیرمقدم کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین ایک معلم، ایک مفکر ایک ایڈمنسٹریٹر تھے۔ ان کے بعد ڈاکٹر علیم آئے ہیں، جن کی وائس چانسلری "بجوکور" اور رہبر خانہ کے خلا کو پر کرنے والی ہوگی۔

●



قاہرہ کی ایک شام

عتیق صدّیقی

"ایک انٹروڈکشن کلب کی ہم نے داغ بیل ڈالی ہے" عادل ثابت نے ایک دن مجھے بھی شرکت کی دعوت دیتے ہوئے کہا " اس کے تین چار جلسے بھی ہو چکے ہیں۔ اگلے جلسہ میں آپ بھی آیئے"

"شکریہ، میں ضرور آؤں گا"

"تو پرسوں سنیچر کی شام کے آٹھ بجے آجایئے میرے گھر"

یہ قصہ اکتوبر ۱۹۶۴ء کی ایک شام کا ہے۔

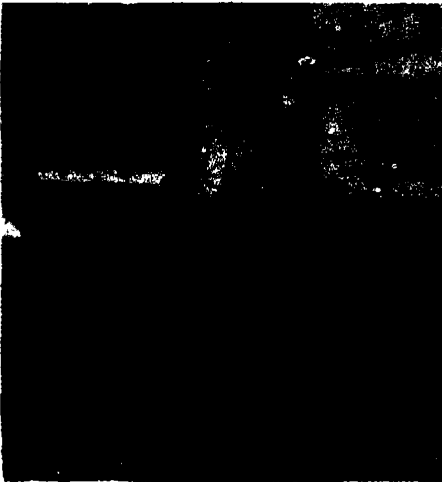
اس کلب کی نوعیت وغایت یہ تھی کہ کچھ دوست، بلا تفریق جنس مہینے میں ایک دو بار سنیچر کی رات کو نیل کی سطح پر مل بیٹھتے، گاتے بجاتے، خوش گپیاں کرتے، کھاتے پیتے، کھاتے کم پیتے زیادہ، اور پھر علمی، ادبی، جنسی اور دنیا بھر کے مسائل پر کبھی سنجیدہ اور کبھی غیر سنجیدہ انداز میں تبادلۂ خیال کرتے۔ نئے نئے ہم خبروں کو خاص طور سے دعوت دی جاتی تاکہ تعلقات کا دائرہ وسیع ہو۔

سنیچر کی رات کو مقررہ وقت پر عادل کے گھر پہنچا تو ایک ہندستانی دوست قیوم اور ان کی بیوی سکندرہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ قیوم دہلی کے رہنے والے اور قاہرہ میں فری پریس جرنل (بمبئی) کے خصوصی نمائندے تھے۔ میں نے عرب لیگ میں کام شروع کیا، تو اس کے چند ہی ہفتے بعد قیوم بھی قاہرہ پہنچے۔ عزام پاشا سے ملنے کی فکر میں ایک دن عرب لیگ کے دفتر آئے تو انھیں میرے پاس بھیج دیا گیا

پہلی ہی ملاقات کے بعد ایک دوسرے کے ذہن کا ہمیں بہ خوبی اندازہ ہو گیا۔ ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا کہ قیوم اپنے لیگی رجحان پر پردہ ڈالنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن ذہنی بُعد کے باوجود ہم دوست بن گئے، اور یہ دوستی آخر وقت تک نبھتی بھی رہی جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں میں، غیر محسوس طور پر، یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ ہندستان کے سیاسی مسائل پر ہم بحث نہ کریں گے۔ قاہرہ میں دو ڈھائی مہینے رہ کر قیوم شادی کرنے ہندستان گئے، اور پندرہ بیس دن بعد جب وہ لوٹے تو ان کی بیوی سکندرہ ان کے ساتھ تھیں۔ یہ میجر عارف کی بہن نکلیں، جو بغداد میں انڈین آرمی پبلک ریلیشنز ڈائرکٹریٹ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر، یا اس دفتر کے افسر اعلیٰ تھے۔ بغداد میں ان کے ماتحت میں نے کام کیا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر جلد ہی سکندرہ سے بھی میری بے تکلفی ہو گئی۔

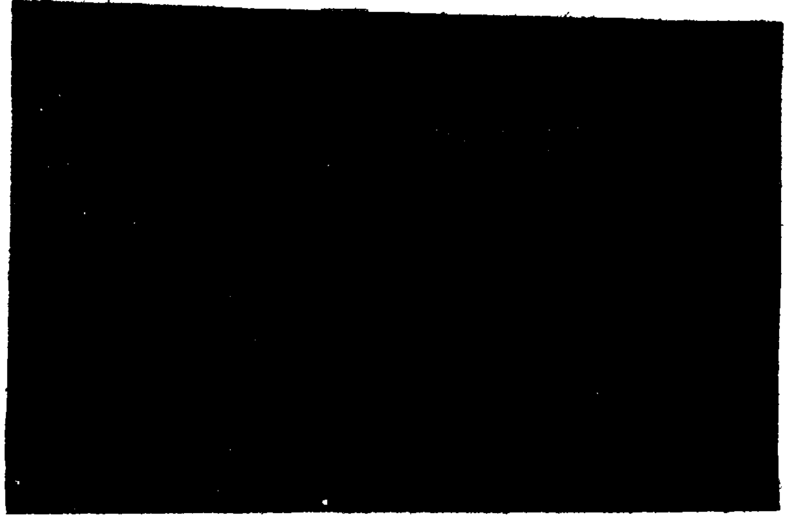
ہم تینوں عادل کے گھر پہنچے تو بزم بے تکلف کے پندرہ بیس ممبر وہاں موجود تھے۔ کچھ تو جانے والے ہی نکلے، اور کچھ سے تعارف ہوا۔ یہ قافلہ ٹیکسیوں اور موٹروں میں نیل کے کنارہ پہنچا، تو چاند ان سربہ فلک عمارتوں کی آڑ سے سر نکال رہا تھا، جن کا سلسلہ نیل کے کنارے کنارے دور تک چلا جاتا ہے۔ اس ابھرتے ہوئے چاند کو دیکھ کر مجاز کی نظم "آوارہ" کا یہ بند، نہ جانے کیوں، بے اختیار یاد آگیا:

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں



عتیق صدیقی عربی لباس میں

نیل کے کنارے
پیاسٹو گارڈن
ایک منظر



مجھے یاد آیا کہ دو ڈھائی سال پہلے میں اور مجاز دہلی کی جامع مسجد کے علاقہ سے گذر رہے تھے، تو چاند مکت مینار کے پیچھے سے آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجاز نے بتایا تھا کہ چھ سات سال قبل اسی جگہ اور اسی طرح چاند کو ابھرتے دیکھ کر یہ مصرعے بے ارادہ موزوں ہو گئے تھے۔ یہی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں ایڈورڈ پارک میں چلے گئے۔ جسے دہلی کے کرخندار گھوڑا پارک کہتے ہیں۔ اس کے ایک ایسے گوشے میں بیٹھ کر جہاں ہمیں کوئی نہ دیکھ سکے ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے ہمارے سامنے شاہجہاں کا سنگین قلعہ تھا، اور پشت پر اسی کی بنوائی ہوئی بلند و بالا جامع مسجد۔۔ اور اسی سے چند گز کے فاصلے پر سرمد شہید کا مزار، جس کی درویشانہ سادگی ان عمارتوں کے شاہانہ شکوہ کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اسی جگہ مجاز نے ساغر و مینا کو سامنے رکھ کر اپنے مخصوص انداز مگر وحشیانہ لہجے میں نظم کی شان نزول کے ساتھ تو اس کی تلمیحوں اور کنایوں کی وضاحت بھی کی تھی۔

ان سب باتوں کے یاد آتے ہی اس ابھرتے ہوئے چاند کو میں نے غور سے دیکھا جو جلتی ہوئی دلی کے کسی بوسیدہ محل کی آڑ سے نہیں، بلکہ ترقی پذیر قاہرہ کی آسمان سے سرگوشیاں کرنے والی جدید ترین عمارتوں کی اوٹ سے نکل رہا تھا۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ مجاز نے جس چاند کو دیکھ کر اتنی سوگوار نظم کہی تھی، وہ یقیناً اس سے مختلف رہا ہوگا۔ یہ چاند جو اس وقت میرے سامنے ہے، نہ تو کسی ملا کا میلا کچیلا عمامہ معلوم ہوتا ہے اور نہ کسی بنئے کی پھیلی ہوئی بہی۔ اسے نہ تو مفلس کی جوانی سے کوئی نسبت ہے اور نہ بیوہ کے شباب سے کوئی مناسبت۔ اس میں تو کسی بنت النیل کی اٹھتی جوانی کا نکھار، کسی نو عروس کی حسین ملکہ کے تاج کا وقار، کسی زلیخا کے جذبۂ پرستش کی پاکیزگی، اور کسی قلوپطرا کے شباب کی رعنائیاں ہیں۔

ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی ہونے کے باوجود موسم نہایت خوش گوار تھا۔ مجھے نیل اور اس کے گرد و پیش کی فضا نے اور بھی نکھار دیا تھا۔ ابھرتے ہوئے چاند کی سنہری کرنیں نیل کی متحرک روپہلی سطح سے ہم آغوش ہو کر، اس کی رواں دواں لہروں کو گنگا جمنی بنا رہی تھیں، اور اس نے ماحول کی رومان انگیزی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس طرب انگیز فضا اور اس سے بار ماحول میں چار بڑی بڑی کشتیاں ایک ساتھ جکڑ دی گئی تھیں، جن پر گدے اور قالین لگے تھے۔ ایک درمیانی کشتی میں ایک سرے پر قیوم سکندر رہ میں گم تھے اور دوسرے پر میں بیٹھا تھا۔ ہماری کشتی میں نشست کی خود رو بے ترتیبی نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ بیشتر مرد ایک طرف اور عورتیں دوسری طرف تھیں۔

"خواتین و حضرات" کسی نے بلند آواز سے کہا "نشست کی یہ ترتیب کچھ نامناسب سی ہے"

"آپ چاہتے کیا ہیں" ایک خاتون نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے سوال کیا۔

"مرد ایک طرف ہیں اور عورتیں دوسری طرف" میں نے تجویز کی وضاحت کی "جیسے دو ٹیمیں مقابلے کے لئے صف آرا ہوں" ایک دبلی پتلی سی نوجوان خاتون نے جواب دیا۔

"اور آپ کو خطرہ ہے کہ مقابلہ ہو گیا تو آپ ہی کی ٹیم ہار سے گی" ایک دبلی پتلی سی نوجوان خاتون نے جواب دیا، جس کا نام مجھے جولیہ بتایا گیا تھا۔

ماموزیل جولیا! نوجوان خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے کہا "ہماری ٹیم اگر ہاری، تو تاریخ آج پہلی بار اپنے کو نہ دہرائے گی۔ آدم کے وقت سے لے کر آج تک یہی ہوتا رہا ہے لیکن اس وقت تو ہم مصر کے بازار میں ہیں جہاں یوسف کو خریدنے کے بعد خود زلیخا اس کے ہاتھوں بک گئی تھی"

"یہ واقعہ یا ریخی ہو یا تلمیحی" جولیہ نے مسکرا کر طنزیہ لہجے میں کہا "مصر کے بازار کا تو آج بھی یہی حال ہے یہاں اکثر زلیخائیں کسی یوسف کو اسی لئے خریدتی ہیں کہ وہ خود

دم نکلا ہاتھوں بک جائیں"

"میں اس بیان کے خلاف احتجاج کرتی ہوں" ایک خاتون چیخ کر کہا

"تم مصری ہوتیں تو ہرگز نہ کہتیں" ایک دوسری خاتون نے احتجاج کی تائید کی۔

"محترم خواتین! ایسا احتجاج کا نہیں ترمیم کا محل ہے" معاملہ کو رفع دفع کرتے ہوئے میں نے کہا "اس بیان میں مصر کی تخصیص ہونا صحیح نہیں ہے۔ انسانی زندگی کے بازار کا یہی چلن ہے، جہاں ہر چیز کسی نہ کسی قیمت کا اسی طرح پاتی ہے کہ وہ خود بھی بک ہو رہے"۔

"یہ بحث خطرناک رخ اختیار کرتی جا رہی ہے" عادل نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"اور اس بحث میں اصل تجویز ہی گم ہو گئی" کسی دوسرے صاحب نے کہا "ہر چیز مقابلہ کا خطرہ تھا وہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے" "اجتماعی یا انفرادی جنگ شروع ہونے سے پہلے صورت حال پر قابو پا لیا جائے تو اچھا ہے" میں نے تائید کی۔

"اچھا سب کھڑے ہوں" عادل نے جرنیلی حکم صادر کیا "اور آنکھ بند کر کے نہیں بلکہ آنکھ کھول کر اپنی اپنی نشستیں بدل لیں"

"نشستوں کے انتخاب کا یہ حق عورتوں کو ملنا چاہیے" مصری تحریک نسواں کی ایک علم بردار خاتون نے کہا۔

"ایک طرف تو مردوں کے مساوی حقوق آپ مانگتی ہیں" کسی نے ان پر چوٹ کی "اور دوسری طرف عورتوں کے لئے ترجیحی سلوک کا بھی مطالبہ کرتی ہیں"

"ہمیں آپ کی تجویز منظور ہے" ایک صاحب نے خاتون کے مطالبے کی حمایت کی۔

"ہاں ہاں!" سب نے اس کی تائید کی۔

"میں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟" میرے مقابل بیٹھنے والی خاتون جولیہ نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے مجھ سے انگریزی میں سوال کیا۔

"اہلاً وسہلاً! مرحبا!" اپنی جگہ سے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے عربی میں ان کا استقبال کیا۔ اس وقت چاندنی کی اور خنک روشنی میں جولیہ کی نازک نازک صورت بہت دلفریب معلوم ہو رہی تھی

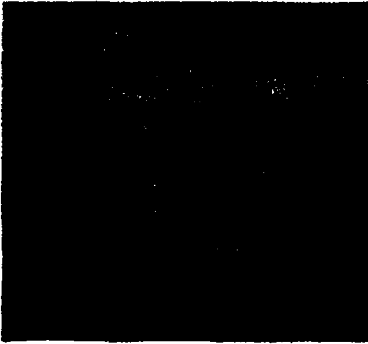
"اہلاً وسہلاً!" خاتون نے بھی عربی قاعدے کے مطابق استقبالیہ کلمات کو دہراتے ہوئے بتلایا "میں مصری نہیں ترک ہوں"

"یہ تو میں اس وقت کی جھڑپ سے سمجھ گیا تھا کہ آپ مصری نہیں ہیں، لیکن آپ کو ترک عیسائی نہیں، بلکہ لبنانی یا فلسطینی عیسائی سمجھتا تھا"

"آپ پھر غلطی کر رہے ہیں" خاتون نے ہنس کر کہا "میں عیسائی نہیں مسلمان ہوں"

"معاف کیجئے" میں نے معذرت کی "عادل نے تعارف کراتے ہوئے جب آپ کا نام جولیہ بتایا تو مجھے گمان ہوا کہ آپ عیسائی ہیں"

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ملاحوں نے ان بندھنوں کو کھول دیا جنھوں نے ہماری کشتیوں کے چھوٹے سے قافلہ کو پابند ساحل کر رکھا تھا۔ اسی کے ساتھ ہی کنارِ نیل کی شوخ و



قاہرہ — میدان محمد علی پاشا

پرجوش موجوں نے ہوئے ہوئے ان کا رخ منجدھار کی طرف موڑ کر انھیں تیز رو دھاروں کے حوالے کر دیا۔ اب ملاحوں نے جو کشتی میں دس بارہ تھے، لے سے لے ملا کر مدھم سروں میں کوئی گیت گایا جس نے سمجھ میں نہ آنے کے باوجود کانوں کی راہوں سے روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر دل و دماغ کی گزرگاہوں میں "چراغاں" کر دیا۔ سحرِ نغمہ سے زیادہ شاید نوجوان ترک خاتون کے قرب کے اعجاز کو اس میں دخل تھا۔ غالب نے شاید کبھی ایسے ہی ماحول سے دوچار ہو کر کہا تھا:

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

مصری دوستوں نے بھی نغمہ سرائی میں ملاحوں سے سر ملایا اور لے نے بڑھتے بڑھتے کورس کی شکل اختیار کر لی، جس نے گرد و پیش کی فضا کو سرشاری و سرمستی سے سرشار کر دیا، اور ایسا لگتا تھا کہ اس تختِ رواں کے پر لگ گئے ہیں، اور اب یہ اڑنے ہی والا ہے۔ پھر نغمے کا تار ٹوٹ گیا، آوازیں آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو گئیں، اور ہر طرف سکوت مکمل اور ایسا سکوت چھا گیا۔ کچھ دیر بعد ہوا کے تیز جھونکے نے نیل کی موجوں کے ساتھ ساتھ ہمارے تختِ رواں کو بھی زیر و زبر کر کے اس سحرِ نغمہ کو درہم برہم کر دیا جس نے سب کو مبہوت کر رکھا تھا۔

"ترکوں کی طرح آپ کے کانوں کو بھی موسیقی سے خاص ربط معلوم ہوتا ہے" جولیہ نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا

"ترک تو موسیقی کے رسیا ہیں" میں نے جواب دیا "لیکن میرے کانوں کو موسیقی سے کوئی خاص ربط نہیں ہے۔ مگر یہ نغمہ تھا ہی اتنا دل کش۔ پھر گرد و پیش کے ماحول نے، اور سب سے بڑھ کر آپ کے قرب نے دو آتشہ بنا دیا تھا"

"آپ شاعر بھی معلوم ہوتے ہیں"

"دیکھئے! مہربانی کرکے یہ تہمت مجھ پر نہ لگائیے، شعر موزوں کرنا تو درکنار میں شعر موزوں پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اپنے شاعر نہ ہونے کا مجھے کبھی افسوس نہیں ہوا۔ مگر آج آپ سے مل کر اور آپ کو اپنے سے اتنا قریب پاکر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کاش میں بھی شاعر ہوتا"

"شعر کو اوزان کا پابند بنانا شعر کی توہین ہے۔ آپ میری اس رائے سے اگر متفق ہوں تو میں کہوں گی کہ آپ نے جو کچھ ابھی کہا ہے وہ خیال آرائی کی اچھی مثال ہے"

"شکریہ آپ کا" خاتون سے قریب تر ہوتے ہوئے میں نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو ترکوں سے دلی لگاؤ ہے۔ اور شاید میرا یہی قلبی تعلق آپ کو کھینچ کر میرے پاس لایا ہے"۔

"آپ کے بیان کا پہلا ٹکڑا تو یقیناً صحیح ہے، اور ممکن ہے کہ دوسرا بھی غلط نہ ہو"

"فارسی میں ترک کا لفظ" میں نے کہا "ترکی کے رہنے والوں کے معنی سے ہٹ کر ایک اور معنی میں مستعمل ہے۔ اور وہیں سے ہماری زبان اردو میں آگیا ہے"

"فارسی سے مجھے بھی کچھ لگاؤ ہے، اور تھوڑی سی مجھے آتی بھی ہے" خاتون نے جواب دیا "آپ نے جو بات کہی ہے، اس کا مجھے علم ہے۔ لیکن مجھے ایک اور دلچسپ بات بھی معلوم ہے، اور وہ یہ ہے کہ فارسی میں ہندو بھی اسی معنی میں مستعمل ہے جس معنی میں ترک"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں" خاتون کے بیان کو تسلیم کرتے ہوئے میں نے کہا "ایران کے مشہور شاعر حافظ نے ترک اور ہندو دونوں کا ایک ہی شعر میں ذکر کیا ہے:

"اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را"
"بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را"

"یہ شعر میرے حافظے میں بھی محفوظ ہے"

"آپ کو شاید یہ نہ معلوم ہو" میں نے کہا "فارسی میں ہندو ڈاکو کو بھی کہتے ہیں"

"اس میں تعجب کی کون سی بات ہے" خاتون نے جواب دیا "دونوں معنوں میں تضاد نہیں، بلکہ قریبی ربط ہے"

"آپ خطرناک حد تک ذہین اور حاضر جواب ہیں" میں نے کہا "اچھا شاید آپکو یہ نہ معلوم ہوگا کہ ہم ہندوستانی ترکوں کا رشتہ کوہ قاف میں رہنے والی خیالی پریوں سے جوڑتے ہیں۔ لیکن آپ کو دیکھ محسوس ہو رہا ہے کہ حقیقت بھی یہی ہے"

"اس حسن ظن کے لئے شکریہ" خاتون نے قریب تر ہوتے ہوئے کہا "ہم ترکوں کے دلوں میں بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک خاص جگہ ہے، لیکن اس کے وہ رومانی اسباب نہیں ہیں، جو آپ نے ترکوں سے منسوب کئے ہیں۔ بلکہ وہ انسانی قدروں اور ٹھوس حقائق پر مبنی ہیں"

"ہمارے اور اپنے مذہبی رشتے کی طرف شاید آپ اشارہ کر رہی ہیں"

"نہیں، ایسا مذہبی رشتہ تو عرب اور افریقہ کے تمام ملکوں کے مسلمانوں کے ساتھ ہے" جولیہ نے کہا "لیکن ہندوستان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہم ترکوں کو دنیا کے دو ملکوں کے مسلمانوں سے دلی تعلق ہے۔ ہندوستان کے اور پولینڈ کے مسلمانوں سے۔ جنھوں نے ہمیشہ ترکوں کا ساتھ دیا ہے اور ہر آڑے وقت میں ہماری مدد کی ہے"

"کیا پولینڈ میں بھی مسلمان ہیں؟"

"ہاں پولینڈ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے" جولیہ نے پر خلوص نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور وہ بھی اتنے ہی اچھے مسلمان ہیں، جتنے ہندوستان کے"

پھر ہم ترکی ادب، ترکی رسم خط، ترکی سیاست اور ترکوں کے اسلامی تصورات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اسی سلسلے میں جولیہ نے ترکی اور مصری اسلامی زندگی کا بڑے دلچسپ انداز میں موازنہ کیا، جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ مصریوں کے متعلق ان کی رائے اچھی نہیں ہے۔ میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ مصریوں کے باب میں ترکوں کا عام ذہن یہی ہے، اور اس کے نفسیاتی اور سیاسی اسباب ہیں۔ ان اسباب پر بھی نوجوان ترک خاتون نے روشنی ڈالی۔

"خواتین و حضرات! اب رات کے ڈھائی بجنے والے ہیں" عامل نے اعلان کیا "اگر آپ کی اجازت ہو تو آج کی صحبت آپ کے شکریے کے ساتھ ختم کیجائے۔"

"ارے!" اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے میں نے کہا "یہ تو واقعی ڈھائی بجے ہیں"

"باتوں میں اسی طرح وقت کے پر لگ جاتے ہیں" خاتون نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا

"کاش وقت کی رفتار کو ہم روک سکتے!" میں نے بجھے ہوئے سے من جواب دیا

نوجوان ترک خاتون جولیہ کی باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ دنیا کے اس حصہ میں یہ پہلی ایشیائی نوجوان خاتون مجھے ملی تھیں، جن کی باتوں میں فکر کی گہرائی تھی، اور جنھیں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے پر بھی قدرت حاصل تھی۔

"پرسوں میری چوبیسویں سال گرہ ہے" کشتی سے اترتے ہوئے جولیہ نے مجھ سے کہا "آپ بھی ضرور تشریف لائیے۔ میری والدہ بھی آپ سے مل کر خوش ہونگی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے باب میں ان کے جذبات بھی وہی ہیں جو میرے ہیں بلکہ مجھے تو یہ ان ہی سے ورثے میں ملے ہیں"

"میں ضرور آؤں گا" وعدہ کرتے ہوئے میں نے کہا "ایک بار آپ سے ملنے کے بعد دوسری بار پھر ملنے کی خواہش قدرتی بات ہے۔ بڑی مبارک ہے آپکی سالگرہ کی یہ تقریب جس نے اتنی جلد اس آرزو کی تکمیل کا موقع فراہم کردیا ہے"

"میں ضرور آؤں گا۔"

"شکریہ آپ سے مجھے امید بھی یہی تھی" پھر کچھ رک کر جولیہ نے کہا "اچھا تو آپ ہی مجھے گھر تک پہنچا دیجئے تاکہ آپ جگہ بھی دیکھ لیں، اور پرسوں آپ کو وہاں پہنچنے میں دقت نہ ہو۔"

قیوم میاں بیوی بھی ہماری ہی ٹیکسی میں آ گئے۔ راستے میں جولیہ نے ان کو بھی ان کے گھر اتارتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک بڑی سی عمارت کے سامنے جولیہ نے ٹیکسی رکوائی۔ خدا حافظ کہنے کے لئے میں بھی گاڑی سے باہر نکلا۔

"دیکھئے نا آپ ضرور آئیں گے" جولیہ نے ہاتھ ملاتے ہوئے تاکید کی "اسی عمارت کی چوتھی منزل پر ہمارا فلیٹ ہے۔ لفٹ سے نکلنے کے بعد داہنی طرف آپ گھومیں گے تو بائیں ہاتھ کو جو پہلا دروازہ ملے گا۔ وہی ہمارے فلیٹ کا دروازہ ہے۔ پرسوں جب وہاں پہنچیں گے تو وہ دروازہ آپ کو کھلا ملیگا"

تین بجے گھر پہنچا تو تھکن سے چور تھا۔ لیٹتے ہی سو گیا۔ دوسرے دن دیر سے آنکھ کھلی، نہا دھو کر ناشتہ کرنے بیٹھا، تو ناشتہ کا نہیں بلکہ کھانے کا وقت تھا۔ چنانچہ ناشتہ کھانے ہی کی طرح کیا، اور اخبار پڑھتے پڑھتے پھر سو گیا۔ پانچ بجے کے قریب گھر سے نکلا، اور یونین کے دفتر جاتے ہوئے، قیوم کے یہاں بھی چلا گیا۔

"کہئے، رات نیند آئی تھی" سکندرہ نے صاحب سلامت کے بعد سوال کیا۔

"رات بھی خوب سویا، اور آج دن بھر گھوڑے بیچ کر سوتا رہا"

"غالب نے ان ہی کے لئے کہا تھا" قیوم نے میرا جواب سن کر کہا:

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

"تم لوگوں کو رات نیند نہیں آئی؟" میں نے پوچھا "دماغ پر شاید اسی کا ہے"

"تمہارا معاملا تو ہم لوگوں سے مختلف تھا" قیوم نے کہا "رات تو تم جولیہ میں ایسے کھوئے۔"

"اور وہ بھی ان میں ایسی گم ہوئیں کہ دنیا و مافیہا کی ہی خبر نہ رہی" سکندرہ نے میاں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کے دماغ پر بلا وجہ میرا اور جولیہ کا بھوت مسلط ہے" میں نے کہا "مجھے تو کل سے اس وقت تک اس کا خیال بھی نہ آیا — یار تم تو کمال کرتے ہو"

دوشنبہ کو حسب معمول دفتر گیا۔ دوپہر کے قریب عادل آ گئے۔

"کہئے! پرسوں شام کی محفل کیسی رہی۔؟"

"بہت اچھی، بہت دلچسپ اور بہت کامیاب، مبارک ہو آپ کو"

"اس کی کامیابی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ دو روحیں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئیں"۔

"کون دو روحیں؟" میں نے گھبرا کر کہا "یہ اشارہ اگر میرے اور جولیہ کی طرف ہے تو یہ صحیح نہیں ہے"

"ابھی ابھی جولیہ کا ٹیلیفون آیا تھا" میرے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے عادل نے کہا۔ "آج اس کی سالگرہ ہے آپ کو اس نے خاص طور سے دعوت دی ہے۔"

"مجھ سے تو پرسوں ہی اس نے کہا تھا اور وعدہ بھی لے لیا تھا" میں نے جواب دیا "میں جاؤں گا بھی"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں" عادل نے ہنس کر کہا "اور اسی سے آپ انکار کر رہے تھے۔ اچھا تو پھر شام کو ساتھ چلیں گے"

"مجھے قیوم اور ان کی بیوی کو بھی لینا ہے۔" میں نے جواب دیا "اور پھر کسی جگہ وقت پر پہنچنا آپ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں"

"اور جناب تو وہاں جانے کے لئے ابھی سے بیتاب ہوں گے۔"

عادل کے جانے کے بعد پہلی بار میں نے پرسوں رات کی باتوں پر قیوم و سکندرہ اور عادل کے اظہار خیال کی روشنی میں غور کیا۔ یہ سب باتیں مجھے لغو معلوم ہوئیں، لیکن دل کی انتہائی گہرائیوں میں یہ خدشہ بھی چھپا تھا کہ زبان خلق کہیں نقارۂ خدا نہ بن جائے۔ میں نے سوچا کہ آج جولیہ کی سالگرہ میں نہ جاؤں تو اچھا ہے۔ بڑی دیر تک اپنے دل کو ٹٹولتا رہا، اور بالآخر فیصلہ بھی کر لیا۔ پھر میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے اس فیصلہ کی اسے اطلاع دے دوں۔ میں نے ٹیلیفون کیا:

"میں آج نہ آ سکوں گا، اس لئے ٹیلیفون ہی پر میری مبارک باد قبول کیجئے"

"کیوں؟ آپ نے تو پکا وعدہ کیا تھا۔"



میدان مصطفیٰ کامل — مصطفیٰ کامل پاشا کا مجسمہ

حمدِ ناتمام

مہدی نظمی

باری تعالیٰ کی جناب میں مہدی نظمی نے جو زبان درازی کی ہے، یقین ہے کہ غفور الرحیم اسے معاف کرے گا، اور اس لئے بھی معاف کرے گا کہ انداز پیارا ہے۔ شکوہ علامہ اقبال نے بھی کیا تھا، مگر مہدی نظمی کی حمدِ ناتمام نئی ہے۔ (ک۔ د)

اے خدا جگ کے خدا ہر شئے ممکن کے خدا
آدم و حور و ملائک کے خدا جن کے خدا
دیر و مسجد کے خدا کافر و مومن کے خدا
ظلمت ایجاد اندھیروں کے خدا دن کے خدا

تجھ سے کیا کیجئے شکایت یہ تماشہ کیا ہے
بے خبر تو بھی نہیں ہے تیری دنیا کیا ہے

دہر اسٹیج ہے اور خالق کردار ہے تو
تجھ کو بھاتے ہیں یتیموں کے چھلکتے آنسو
تجھ کو مرغوب ہیں بیواؤں کے بکھرے گیسو
تیری آنکھوں کو بھلا لگتا ہے انسان کا لہو

ورنہ کیا بات ہے دنیا یہ طربناک نہیں
زندگی دردِ مسلسل کے سوا خاک نہیں

بخشا انساں کو کیوں خلعتِ عظمت تو نے
پیکرِ خاک کو کیوں سونپی نبوت تو نے
کیوں دی آدم کو ملائک پہ فضیلت تو نے
کیوں نہ ابلیس کو دی اپنی خلافت تو نے

خلشِ حرص نہ ہوتی دلِ ناکام کے ساتھ
آدمی کرتا عبادت تری آرام کے ساتھ

راستہ عشق و تمنا کا دکھایا کس نے
فکر و اندیشۂ فردا سے ڈرایا کس نے
نور کو پردۂ ظلمت میں چھپایا کس نے
جھولا اوہام و تذبذب میں جھلایا کس نے

وسوسے شرک کے سب قلبِ حزیں تک پہونچے
کانٹے تشکیک کے دامانِ یقیں تک پہونچے

کس نے فردوس سے آدم کو نکالا یارب
کس نے آراستہ کی محفلِ دنیا یارب
کس نے انساں کو دیا عشق کا سودا یارب
کس نے آباد کیا شہرِ تمنا یارب

ترکِ اولیٰ پئے تخلیق جہاں کام آیا
گیہوں آدم پہ مگر کھانے کا الزام آیا

خونِ ہابیل میں ڈوبا ہوا پہلا منظر
شدتِ غم میں تڑپتا ہوا آدم کا جگر
دل کو تھامے ہوئے حوا ہیں سرِ لاشِ پسر
اس نظارہ میں مگر کھوئی ہوئی تیری نظر

یہ ہے آغاز تو پھر قصۂ دنیا یارب
ہے تیری یاس پسندی کا تماشا یارب

خاک پر نوح کا طوفان اٹھایا کس نے
دیکھا غرقابیٔ دنیا کا تماشا کس نے
قطع بیٹے سے کیا باپ کا رشتہ کس نے
آگ پانی سے لگا دی مرے مولا کس نے

کون لیتا ہے دلِ خانماں برباد سے لطف
غرق ہوتے ہوئے انسانوں کی فریاد سے لطف

کس نے یوسفؑ کو دیا حسنِ دل آرا یارب
کس نے پلٹائی جوانیٔ زلیخا یارب
بیار ہیں کشمکشِ یاس و تمنا یارب
کس نے دیکھا ہے محبت کا تماشا یارب

چاہ میں یوسفِ کنعاں کو گرایا کس نے
حسن بازار میں نیلام کرایا کس نے

تو ہے گا؟ تیرے افسانے کے اسلوب کہوں؟
تیرے کردار کہ جن کو تیرا محبوب کہوں؟
تیرے رسوا ہوئے کتنے ہوئے مصلوب کہوں؟
ذکرِ ایوب کروں قصۂ یعقوب کہوں؟

داستانِ خلیل اللہ ہمہ حسنِ عمل
پھر بھی اک سنسنی، ہیجان، تلاطم، ہلچل

سر پہ یحییٰ کے وہ چلتا ہوا آرا توبہ
ایسی پیتا کہ نہیں صبر کا یارا توبہ
اور وہ چشمِ مشیت کا اشارا توبہ
خونِ ناحق کا ابلتا ہوا دھارا توبہ

بطنِ ماہی میں وہ یونس کا تڑپنا یارب
جیسے ویرانے میں رقصاں ہو بگولا یارب

رام سے چودہ برس کے لئے دنیا چھوٹے
شہرِ دلدار چھٹے ملک تمنا چھوٹے
گھر چھٹے باپ چھٹے ماں چھٹے کنبہ چھوٹے
اور جنگل میں یہ بپتا پڑے سیتا چھوٹے

شعلۂ آتشِ غیرت سے یہ دنیا جلتی؟
تو لنکا نا نہ اگر آگ تو لنکا جلتی؟

ایک صندوق میں ماں لختِ جگر کو رکھ کر
ڈال دے نیل کی امواج میں بے خوف و خطر
وسوسے دل میں مگر تیری مشیت پہ نظر
مثلِ طوفاں وہ دھڑکتا ہوا قلبِ مادر

خوف و اندیشہ و ہیجان کہاں تک پہونچا
بچہ صندوق میں اک دشمنِ جاں تک پہونچا

کس کو معلوم تھا یہ موسیٰ عمراں ہوگا
خانۂ شرک میں موجود مسلماں ہوگا
کفر کے گھر کے اندھیرے میں چراغاں ہوگا
دستِ مظلوم میں ظالم کا گریباں ہوگا

سنسنی پھیل گئی جب یدِ بیضا چمکا
دل دھڑک اٹھے سرِ طور جو شعلہ چمکا

یہ ترے ذہن کی ایجاد یہ ندرت یارب
بے پدر حضرتِ عیسیٰ کی ولادت یارب
طنزِ دنیا کے سہے پیکرِ عصمت یارب
ماں کی تقدیس پہ بچے کی شہادت یارب

حیرت و خوف سے دل ہول رہا ہے اب تک
جیسے عیسیٰ کا لہو کھول رہا ہے اب تک

بدر و طائف میں محمدؐ پہ عجب گزری ہے
غم میں دن بیتے ہیں آفات میں شب گزری ہے
عمر در در وزہ پیمبرؐ کی غضب گزری ہے
جو مصیبت بھی ہے دنیا میں وہ سب گزری ہے

ظلمِ اعدا سے نبی اپنے وطن سے نکلا
کانٹے گلشن میں رہے پھول چمن سے نکلا

وہ مدینے سے پیمبرؐ کے نواسے کا سفر
جیسے طوفان سے پہلے کسی طوفاں کی خبر
فکر و اندیشہ و ہیجان غم و خوف و خطر
جیسے دل دھلے دھلتی ہوئی ہر راہگزر

درد کی موج رواں قلبِ حزیں کے نیچے
دل محمدؐ کا دھڑکتا ہے زمیں کے نیچے

باغ زہراؑ کا تراشا گیا ویرانوں سے
لٹ گیا خانۂ مظلوم بیابانوں سے
بچے شبیرؑ کے گھٹ گھٹ گئے زندانوں میں
سرخیاں لگتی گئیں صبر کے افسانوں میں

درد میں ڈوبے ہوئے گونج رہے ہیں نالے
یک بیک جیسے مسل جائیں جگر کے چھالے

تو نے جب موڑ فسانے میں دیا ہے یارب
زہر سقراط نے زنداں میں پیا ہے یارب
آدمی موت کے جھولے میں جیا ہے یارب
بدلہ کیا لغزشِ آدم کا لیا ہے یارب

ہے یہ تفصیلِ مشقت، خطِ تقدیر نہیں
آدمی قید ہے گو پاؤں میں زنجیر نہیں

اے خدا زخم دل رنج براں ہے روٹی
گھر میں مزدور کے فاقہ ہے کہاں ہے روٹی
بھوک کی آگ دہکتی ہے دھواں ہے روٹی
گولیاں سستے کی سستی ہیں گراں ہے روٹی

خون مزدور کا گو یہیں برس جاتا ہے
دانے دانے کو بشر اب بھی ترس جاتا ہے

درد کی ٹیس سے جب دل بیٹھیں سینے دھڑکیں
بچے جب گود میں ماں باپ کی غم سے بھڑکیں
خون کے اشکوں میں جب ڈوب رہی ہوں پلکیں
آدمی کیا کرے جب بھوک کے شعلے بھڑکیں

خودکشی کرنا خطا زہر کا پینا ہے گناہ
مرنا مفلس کا گوارہ نہیں جینا ہے گناہ

نصف عالم میں اگر بھوک رہے گی یارب
دنیا افسانۂ بیداد کہے گی یارب
ذوقِ تعمیر میں تخریب سہے گی یارب
خاک پر خون کی اک نہر بہے گی یارب

سرخیاں آگ اگل دیں نہ فسانے کی کہیں
اینٹ سے اینٹ نہ بج جائے زمانے کی کہیں

خون میں ڈوبی ہوئی کونسی تصویر نہیں
کون دل ناوکِ الام سے نخچیر نہیں
زندگی خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں
جشنِ انجام میں تخریب ہے تعمیر نہیں

زندگی نام ہے بس موت کی تیاری کا
ناحق الزام ہے مجبوروں پہ مختاری کا

اہل دانش میں کشاکش ہے قیادت کیلئے
سازشیں کھیل ہیں ارباب سیاست کیلئے
نو بہ نو ڈھلتے ہیں ہتھیار ہلاکت کیلئے
فتنے بھر جاگنے والے ہیں قیامت کیلئے

ایٹمی جنگ کا ساماں ہوا جاتا ہے
آدمی خوف سے ہلکان ہوا جاتا ہے

نقش تہذیب و تمدن کا مٹانے والے
بستیاں بم کے دھماکوں سے اڑانے والے
خون سے خاک کو زرخیز بنانے والے
اک نئی جنگ کا اسٹیج سجانے والے

کیا غرض ان کو، جہاں نذرِ ہلاکت ہو جائے
ان کے ہتھیار بکیں چاہے قیامت ہو جائے

جن کی محنت ہے انہیں پھل نہیں ملتا یارب
اشک پیتا ہے بشر، جل نہیں ملتا یارب
چین انسان کو کسی پل نہیں ملتا یارب
تیری دنیا کا تجھے حل نہیں ملتا یارب

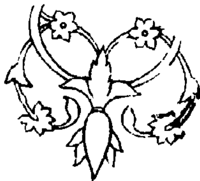
سر پہ مظلوم کے چل جاتی ہے تلوار ابھی
عصمتیں بکتی ہیں یارب سرِ بازار ابھی

منزلِ امن کہاں مہلت آرام کہاں
آدمی ڈھونڈھتا پھرتا ہے حقیقت کا نشاں
علم و حکمت سے ہے تسخیر فلک کا ساماں
ہے مگر خوف سے انساں کے انساں لرزاں

رنگِ خوں آنکھ کے اشکوں میں بھرا جاتا ہے
آدمی اپنے ہی سائے سے ڈرا جاتا ہے

جبر کا نام ہے دنیا میں عدالت مولا
مکر کی راہ پر چلتی ہے سیاست مولا
آج ہوتی ہے ضمیروں کی تجارت مولا
اور کیا اس سے سوا ہوگی ہلاکت مولا

خوف امروز و غم دوش سے فرصت دیدے
اب تو ابلیس کو دنیا کی حکومت دیدے



خلافت راشدہ

آسمانی بادشاہت ارضِ آدم پر

سید عبدالحق اصلاحی

قرونِ اولیٰ کے بارے میں کچھ واضح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ کسی مذہبی قیادت کے تحت خیر و شر کی کشمکش میں گزرتا رحضرت آدمؑ کی اولاد آسمانی بادشاہت کے خواب کی تعبیر کس حد تک پورا کر سکی۔ جہاں تک مصری تہذیب، چینی و ہند کے سماج، سوپوٹامیہ اور ایران کی تہذیبوں کے بارے میں ہمیں واقفیت حاصل ہے۔ اس سے کسی مثالی اور یادگار خلافت کے طرز کی تہذیب اور فرمانروائی کا پتہ نہیں چلتا۔ روم و یونان کی جس مثالی جمہوریت کا درس آج مشرق و مغرب کی تعلیم گاہوں میں دیا جاتا ہے۔ وہ فروتنی انکساری خدا ترسی اور کسی مذہبی تصور کی نشاندہی نہیں کرتی۔ روم و یونان کی جمہوریت چند مصلحین اور سیاسی مفکرین کے فکر کا نتیجہ تھی جسے ہم کسی صحیفہ آسمانی کی نمائندہ تہذیب نہیں کہہ سکتے۔

قرونِ وسطیٰ میں بابل ایران اور شام کی تہذیبیں نسلی اور خاندانی تاناشاہی، اور قبائلی شان و شوکت کا شکار رہیں۔ رام راج کا جو تصور ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ بھی ایک گرامی قدر شخصیت سے منسوب ہے اور اس کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس حد تک آسمانی ہدایت و صحیفہ کے مطابق اس دور میں عمل ہو سکا۔

جہاں تک مسیحی علماء کا تعلق ہے وہ گرچہ ہر دور میں آسمانی بادشاہت پر زور دیتے رہے لیکن اس کے خواب کی کبھی تکمیل نہ ہو سکی۔ روم میں پاپائے روم کے تحت آج جو فرمانروائی جاری ہے اُسے بھی انجیل کی رہنمائی کا مصداق نہیں کہہ سکتے۔

آسمانی بادشاہت یا صحیفہ آسمانی کی ہدایت و منشا پر قائم ریاست کی عملی تصویر جہاں نظر آتی ہے وہ ہے خلافت راشدہ کا دور جہاں فروتنی، عاجزی انکساری خدا ترسی مساوات اور حقیقی بھائی چارہ کی پوری کارفرمائی ہے۔ خلافت راشدہ شخصی یا نسلی امتیاز سے بہت دور خالص نظریہ اور خالص اصول کی نمائندہ سیاست کہی جا سکتی ہے۔ خلافت راشدہ کو ہم ذاتی پروپگنڈہ شخصی شہرت اور نسل پرستی سے بہت دور خالص فروتنی اور احساس نیابت و ترجمانی پر قائم مثالی دورِ حکومت کہہ سکتے ہیں۔ جہاں اندرون و بیرون مملکت دونوں ہی جگہ بلا امتیاز نسل و رنگ مساوات کی ترازو کو قائم کر کے خالق کائنات کی اصل فرمانروائی کے تحت حکمرانی کی گئی ہو۔ اصول اور نظریہ کی کارفرمائی جس درجہ طاقتور، اور غالب ہمیں خلافت راشدہ میں نظر آتی ہے اُسکی جھلک کہیں اور کسی دور میں دکھائی نہیں دیتی خدا ترسی، خوف آخرت، مواخذہ، محاسبہ نفس عوام کے سامنے جوابدہی عوام کے معاملات میں احتیاط انکے درمیان قیام عدل و قسط کا جو معیار خلفائے راشدین نے قائم کیا وہ انتہائی مثالی ہے۔

مسیحی علماء کی کسی جانبدارانہ ترجمانی اور وضاحت سے الگ ہو کر اگر دورِ خلافت کا ہم حقیقت پسندانہ جائزہ لیں تو ہمیں یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ ۳۰ سالوں کا یہ دور انسانی تاریخ میں بے مثال گذرا جہاں دشمنوں، رقیبوں اور مخالفوں سب سے پورے انصاف اور ایمانداری کا برتاؤ کیا گیا ہو۔ گرچہ دورِ خلافت ۳۰ برسوں سے زیادہ مدت تک قائم نہ رہا اور یہ مثالی دور بھی کچھ بجمیت کچھ اہل کتاب کی منظم سازش کچھ منافقین کی ریشہ دوانیوں اور کچھ آپس کی غلط فہمیوں کا کسی حد تک شکار رہا۔ پھر بھی اس دور نے مالک حقیقی کی فرمانروائی کا وہ نمونہ چھوڑا ہے جس پر جتنا کچھ لکھا جائے کم ہے۔

نفس اور ذات کی قربانی سخت ترین مذہبی غلبہ کے دور میں بھی انتہائی جانکاہ ثابت ہوتی ہے اسکے باوجود اس دور کے ہیرو سو فیصدی اس صفت سے آراستہ نظر آتے ہیں۔ دورِ خلافت کے انتخابات اور نامزدگیاں جمہوری اور عوامی تھیں، اسے عوام کے جذبات و خواہشات کا صحیح نمائندہ ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اس لئے بھی کہ فرمانرواکے انتخاب میں جہاں کہیں خدا ترسی، عاقبت اندیشی اور آخرت کو اہمیت دینے والے حضرات کا ہاتھ ہو وہاں دوست اور دشمن سب کے ساتھ انصاف لازمی طور پر مدِ نظر ہوا کرتا ہے۔

دورِ خلافت کے ہیرو اور رہنما کی حیثیت سے حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی عظیم

آخرت اور انکساری کیلئے حضرت عثمان غنی رضؓ کی شخصیت بے مثال ہے۔ آپکے دورِ خلافت میں منافقین کی ریشہ دوانیاں بہت بڑھ چکی تھیں اور حق و انصاف کا تقاضہ تھا کہ انکی گردنیں ناپی جاتیں لیکن حضرت عثمان غنی رضؓ نے عفو و درگذر سے کام لیا اور دشمنوں کو معاف کیا۔

دورِ خلافت کی آخری کڑی حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں جو قریش کی عظیم طاقت و حمایت کے باوجود حضرت ابوبکر رضؓ کی خلافت پر صابر رہے اور اس سوال پر کبھی لب کشائی نہ کی اور اپنا حق نہ جتایا خاندانِ رسالت سے بہت قریب ہونے کے باوجود تینوں خلفائے کی اطاعت کی اور خلافت پر آنچ نہ آنے دی اور عوام کو بھی تصورات سے باز رکھتے رہے۔ حضرت علیؓ نے زہد و تقویٰ اور خدا ترسی کا ایک عدیم المثال ریکارڈ قائم کیا کہ اہل تصوف آج بھی تصوف کا حضرت علی کو مرکز سمجھتے ہیں۔

عجمی تصورات، اہل کتاب کی ڈپلومیسی اور منافقین کی ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں کنبہ پروری کی کچھ جو حضرت عثمانؓ کے دور ہی سے آنے لگی تھی لیکن حضرت علی نے تحاد و اتفاق کے جس جذبہ کے ساتھ خیبر کے قلعہ کی دیواریں ہلا دیں تھیں اسی طرح اپنے ماننے والوں خوارج کی بھی پوری سرکوبی کرائی اور نہروان میں انکا قتل عام کرایا اور کنبہ پروری کے جراثیم کو مٹا دینا چاہا۔

خود اپنے ماننے والوں کے خلاف اسقدر سخت اور فیصلہ کن قدم اٹھانے کا جو مثالی نمونہ آپ نے چھوڑا وہ کہیں کہیں اور نہیں ملتا۔ جنگ صفین کا واقعہ جانبین کی غلط فہمی کا نتیجہ تھا پھر بھی اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ جانبین اپنے آپکو صحیح موقف پر سمجھتے ہوئے اپنی جگہ پر قائم اور حق و انصاف کیلئے زبردست کشمکش کا سامنا کیا جسمیں ذات اور ذاتی اغراض کے مقابلہ میں ہمیں اصول اور نظریہ کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔

خلافت راشدہ دراصل منکسر مزاج، خدا ترس فروتن اور نفس اور ذات سے بالاتر عظیم ہستیوں کے مثالی دور کی ایک یادگار ریاست ہے جو گرچہ بہت جلد ختم ہوگئی۔ پھر بھی اس سرزمین پر جہاں انسان شیاطین کی عظیم اور بے پناہ ریشہ دوانیوں اور فتنوں کا شکار رہے۔ آسمانی ہدایت و منشا کے مطابق نیابت و خلافت کا ایک مثالی نمونہ بھی چھوڑ گئی جسمیں ریاست، عوام اور فرمانروا کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آتی ہے جہاں سرمایہ، ظاہرداری، ذاتی ہیکڑی، نسل و خون کے امتیازات سے بہت دور ہمیں احساس فرض، خدا ترسی اور بے نفسی کا درس ملتا ہے۔

خلافت راشدہ کا مثالی دور ہماری رئیس مملکت اور عوام کے درمیان صحیح رشتہ اور پوزیشن کی وضاحت کرتا ہے۔

خلافت راشدہ نے ایک اصول ایک نظریہ اور ایک فرمانروا کے تحت عوام کو زندگی گزارنے کا ایک مثالی نمونہ دیا۔ خلافت راشدہ نے قرون حاضرہ کے خلایان سیاست و فلسفہ کو بتایا کہ حقیقی سوشلزم کیا ہے، عوامی فلاح پر قائم ریاست کسے کہہ سکتے ہیں۔ صحیح جمہوریت کیا ہو سکتی ہے۔ انصاف برابری، صحیح بھائی چارہ کو عملی طور پر کس طرح کار فرما بنایا جا سکتا ہے۔ رئیس مملکت کی طاقت کیا ہونی چاہیئے۔ عوام کتنے با اختیار ہو سکتے ہیں۔ عوام کی اصل پوزیشن کیا ہوتی ہے، عوام اور رئیس مملکت کے درمیان کیا رشتہ ہوا کرتا ہے۔ رئیس مملکت کی داخلہ اور خارجہ پالیسی کیا ہونی چاہیئے۔ خوشحالی فلاح کاری اور مساوات کو پروان چڑھانے میں کتنے سخت قدم اٹھانے پڑتے ہیں۔ ریاست کا عہدہ اپنوں اور پرایوں کو کس حد تک تسلیم کرتا ہے۔ قسط و عدل کا قائم رکھنا کتنا ضروری ہے۔ فتوحات اور سیاسی کامرانیوں کے موقع پر غیر ممالک کی املاک و جائداد سے کس قدر دور رہنا چاہیئے۔ مذہبی رواداری کسے کہتے ہیں۔ مراعات اور درگذر کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

خلافت راشدہ نے ایک بین الاقوامی سیاست بین الاقوامی طرز زندگی کی داغ بیل ڈالی اور دنیا کے سامنے ایک نمونہ پیش کیا کہ متضاد نظریہ رکھنے والے عوام آپس میں کس طرح امن و امان خوشحالی، اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ ہم رشتہ رہ سکتے ہیں قومی منافرت کشیدگی، فرقہ پرستی، تنگ نظری کیلئے خلافت راشدہ جیسی سیاست میں کوئی جگہ نہیں۔ خلافت راشدہ کے جھنڈے تلے سارے انسان بھائی بھائی ہیں، کسی عربی کو عجمی اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں، دوسروں کی عزت و آبرو، مال و متاع اور جائیداد حرام ہے۔ خلافت راشدہ جیسی طرز سیاست میں رئیس مملکت پہلے بھوکا رہ سکتا ہے پھر اس ریاست کے عوام۔ خلافت راشدہ اندرون و بیرون مملکت میں دو متضاد پالیسیوں کے سخت خلاف ہے۔ خلافت راشدہ جیسی طرز حکومت میں انفرادی ملکیت کو باقی رکھتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظریہ کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں ایسے بینک نہیں قائم کئے جا سکتے جنکی بنیاد منافع خوری اور سود خوری پر ہو۔ خلافت راشدہ جیسی طرز حکومت میں ایسی درآمد کیلئے کوئی گنجائش نہیں جسمیں اقتصادی ناکہ بندی، کسی مخصوص مملکت کی پیداوار کو اٹھالنے، بازار کی اندھا دھند دوڑ میں بازی پانے جیسی کوئی بات

[illegible] سامنے آتی ہیں جو اگرچہ خاندان قریش [illegible] تعلق رکھتی تھیں پھر بھی عہد خلافت میں ان عظیم [illegible] جانبداری، گروہ بندی، خاندان پرستی اور برادری و قوم [illegible] کوئی جگہ باقی نہیں رکھی، اور خود خلافت کے کبھی [illegible] اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس وقت [illegible] تیار ہوئے جب کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ ان عظیم [illegible] خلافت میں ذاتی سرمایہ پرستی، ذاتی ملکیت، اور ذات [illegible] سرمایہ کی فراہمی اور ذخیرہ اندوزی کی کوئی روایت نہیں ملتی [illegible] زندگی اور انکی موت کو ہم خالص خدا پرستی، اور محاسبہ نفس پر قائم کہہ سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جب کسی اصول اور نظریہ کیلئے ذاتی سرمایہ کی قربانی کا سوال اٹھا تو ان عظیم شخصیتوں میں سے ہر شخصیت نے ایک دوسرے پر سبقت کرنی چاہی اور سب کچھ تیاگ دیا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سرور کائنات صلعم کی معیت میں مثالی رفاقت کا ثبوت دیا اور مال و متاع کی عظیم قربانی کے بعد بھی جب جہاد کے ایک موقع پر چندہ کی فراہمی کی ضرورت آن پڑی تو سب کچھ خدا اور اسکے رسول کی راہ میں نچھاور کر دیا جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے تو اپنے سرمایہ کا نصف حصہ گھر والوں کیلئے چھوڑ رکھا تھا لیکن آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ حضرت ابو بکر مجھ سے سبقت لے گئے۔ ان عظیم شخصیتوں نے اپنی ذات اور مال و متاع کو خائندہ اور مثالی خلافت کیلئے وقف رکھا اور اپنی آل و اولاد کے لئے ریاست سے حاصل کیا ہوا کوئی سرمایہ نہیں چھوڑا اور نہ اعزہ و اقربا کو ریاست کے کلیدی مناصب پر مسلط کیا۔ خلافت راشدہ سو فیصدی عوام کے مفاد اور حق میں تھی اور یہاں کسی کے لئے کوئی معافی نہ تھی، تعزیرات کا قیام پوری طرح کامیابی کے ساتھ عمل میں لایا گیا۔ انسداد جرائم کے سوال پر خلفائے راشدین بہت سخت رہے۔ مقدمات کے فیصلوں میں خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں کسی طرح کی جانبداری نہیں برتی گئی۔ خارجہ پالیسی انتہائی منصفانہ اور اعتدال پسندی پر قائم رکھی گئی۔ اگر سختی برتی گئی تو باغیوں کے ساتھ بھی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں واقعہ مشہور ہے کہ آپ نے کہا کہ اگر لوگ زکوٰۃ کی جائز رقم میں ایک رسی دینے میں بھی پس و پیش کریں گے تو میں جہاد کرونگا۔

مجاہدین اسلام کو جہاد کے موقعہ پر سختی کے ساتھ ہدایت دی گئی کہ وہ غنیم کے ملک سے گذرتے ہوئے جائیداد مویشی مکانات اور املاک کو تباہ و برباد نہ کریں اور جو لوگ عبادت گاہوں میں اپنے طرز سے عبادت جاری رکھنا چاہتے ہوں انہیں اسی حال میں چھوڑ دیا جائے اور ان سے چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔

حاکم و محکوم غلام و آقا کے درمیان مساوات کی بنیاد پر قائم ایک مثالی ریکارڈ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قائم رکھا جسکی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ قبلہ اول کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے حضرت فاروق کے غلام کی باری تھی کہ وہ اونٹ پر سوار ہوں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے کارواں کی رہنمائی کرتے نظر آئے جس پر مسیحی علماء نے انجیل کی پیشگوئی کا اندازہ کرتے ہوئے بیت المقدس کی کلید بے چون و چرا پیش کر دی اور کہا کہ ہماری کتاب میں کسی ایسے ہی فرمانروا کی پیشن گوئی کی گئی تھی۔

آج ذاتی پروپیگنڈہ کی ایک قیامت خیز مسموم تیز آندھی چلی ہوئی ہے جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فروتنی اور خدا ترسی دیکھئے کہ ایک شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کاش میں تنکا ہوتا تاکہ روز قیامت مجھے باز پرس کا سامنا نہ کرنا پڑتا اور عوام کی اتنی بڑی جواب دہی کا مجھے سامنا نہ ہوتا۔

قومی سرمایہ اور بیت المال سے کفالت کے معاملہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس درجہ محتاط نظر آتے ہیں کہ ایک روز جب آپ کے سامنے حلوہ پیش کیا گیا تو پوچھا کہ فالتو آٹا کہاں سے آیا۔ دوسرے روز اپنے راشن سے اتنی مقدار کا آٹا کم کرا دیا تاکہ عوامی ملکیت کی چیز کا سرف بیجا نہ ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور فتوحات کیلئے مشہور رہے پھر بھی اس بات کی سخت تاکید کر دی گئی تھی کہ عوامی ملکیت پر مجاہدین ہرگز ہاتھ نہ ڈالیں اور اس سے بہت دور رہنے کی کوشش کریں۔

عوام کی صحیح معاشی، اخلاقی اور سماجی زندگی کے جائزہ کیلئے کسی انٹیلیجنس ادارہ پر بھروسہ رکھنے کی جگہ اس فریضہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود انجام دینے کی کوشش کی اور راتوں کو جاگ کر پہرے دیئے۔ کسی افسر کے بارے میں اگر کوئی شکایت موصول ہوئی تو فوراً کارروائی کی اور اسے عہدہ سے برخاست کیا۔ کسی شہری پر زیادتی کی گئی ہو تو اسکی شکایت دور کی اور اسمیں کسی تاخیر و وقت کو حائل نہ ہونے دیا۔

دور خلافت کی تیسری عظیم شخصیت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ [illegible] ملاطفت، رواداری، مراعات بے مثال کہی جاتی ہیں۔ گرچہ یہ مراعات خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں مفید ثابت نہ ہوئی۔ پھر بھی ذاتی تحفظ داماں کیلئے آپ نے عربوں کی خونریزی نہ ہونے دی۔ خدا ترسی خوف

خلافت راشدہ نے ایک اصول ایک نظریہ اور ایک فرمانروا کے تحت عوام کو زندگی گذارنے کا ایک مثالی نمونہ دیا۔ خلافت راشدہ نے قرون حاضرہ کے جدید ریاست و فلسفہ کو بتایا کہ حقیقی سوشلزم کیا ہے، عوامی فلاح پر قائم ریاست کسے کہتے ہیں۔ صحیح جمہوریت کیا ہو سکتی ہے۔ انصاف برابری صحیح بھائی چارہ کو عملی طور پر کس طرح کارفرما بنایا جاتا ہے۔ رئیس مملکت کی حیثیت کیا ہونی چاہیئے۔ عوام کتنے با اختیار ہوا کرتے ہیں۔ عوام اور رئیس مملکت کے درمیان کیا رشتہ ہوا کرتا ہے۔ رئیس مملکت کی داخلہ اور خارجہ پالیسی کیا ہونی چاہیئے۔ خوشحالی فلاح کاری اور مساوات کی راہ پر کیسے بڑھا جاتا ہے۔ کیسے قدم اٹھانے پڑتے ہیں۔ ریاست کا عہدہ ایوانوں اور پڑاٹیوں کو کس حد تک پھیلایا جاتا ہے۔ [illegible] فتوحات اور سیاسی کامیابیوں کے موقع پر غیر ممالک کی املاک [illegible] رواداری کسے کہتے ہیں مراعات اور در گذر کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

ہو۔ دفاع اور دفاعی اسلحہ کی پیداوار ہیں اس طرز کی سیاست میں ایسی پیداوار کی اجازت نہیں دی جا سکتی جو نسل انسانی کے لئے ہلاکت خیز ہو۔ خلافت راشدہ میں نسل خون رنگ اور زبان کی بالادستی کی جگہ اصول اور نظریہ کی بالادستی تسلیم کی گئی ہے۔ یہاں کسی قومی اور بین الملی ناکہ بندی کی اجازت نہیں دی جا سکتی جس سے کسی ایک ملک کی فرمانروائی اور برتری کا اظہار ہو اور دوسروں کا گلا کٹے۔ نسل قوم خون زبان اور سیاست کی بنیاد پر یہاں ایک شہری کو حق شہریت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ کسی مخصوص نسل والی قوم کو نسل کشی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسی سازش کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ایسے سیاسی ادارے نہیں قائم کئے جا سکتے جیسے کسی ایک طبقہ اور ملک کے لوگوں کو برتری حاصل ہو۔

خلافت راشدہ سیاسی سازش، توڑ جوڑ، نسلی امتیاز، جغرافیائی ترجیح، خصوصیت امتیاز نا برابری فرق نسل و خون سے بہت دور صحیح بھائی چارہ مساوات جمہوریت سوشلزم اور غیر مذہبی خصوصیات پر قائم ریاست کے تصور کا نام ہے جہاں خدا ترسی فروتنی قربانی محاسبہ نفس، مواخذہ اور جوابدہی کے تصورات کی کارفرمائی اور غلبہ ہو۔

خلافت راشدہ فتوحات اسلامی، مملکت اسلامیہ کے پھیلاؤ و وسعت، عوامی خوشحالی، دولت کی فراوانی، آبادکاری نئی کالونیاں اور شہروں کے قیام، اسلامی نظریہ کی توسیع اور عرب قوم کی مقبولیت کا دور ہے۔ وہی جو علم و فلسفہ سے دور تھے۔ دور خلافت میں اہل علم و فلسفہ پر چھا گئے۔ مصر و شام اور روم و ایران میں کلمہ توحید کا نعرہ بلند کیا۔ شجاعت اور بہادری کا بے مثال ریکارڈ قائم کیا۔ یورپ کے فلسفیوں سے نظریاتی ٹکر لی اور اسلام کے نظریہ کو حاوی کیا۔

خلافت راشدہ سے پہلے ریاست کا جو تصور ہمیں ملتا ہے اسمیں انفرادیت، نسل و خون اور کنبہ و گھرانہ کا غلبہ نظر آتا ہے لیکن اصول و نظریہ کی جو کارفرمائی ہمیں یہاں ملتی ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتی۔ فتوحات مصر و شام کو مجاہدین اسلام نے ذاتی مفاد اور ذاتی ملکیت و سرمایہ کیلئے استعمال نہیں کیا بلکہ نظریہ لا الہ کی توسیع اور پھیلاؤ کا اسے بہترین ذریعہ سمجھا۔ خلافت راشدہ کے دور کے فتوحات کسی گندہ سیاست کو لیکر سامنے نہیں آئے بلکہ ان کے پس پردہ یہ تصور تھا کہ جس انسانی فرمانروائی سے لوگ گھبرا چکے انکی گھبراہٹ دور کی جائے انہیں انصاف برابری اور عدل و قسط قائم کیا جائے۔ انکی معاشیات سیاست سماج اور مذہب کو صحیفہ آسمانی کی ہدایت و منشا کے مطابق ڈھالا جائے۔ نسلی اور قومی جنگوں کا خاتمہ کیا جائے۔ جاہلیت تعصب فرقہ پرستی اور کشیدگی کو دور کر کے زندگی اور موت کے مقصد کو خالصتہً توجہ اللہ قرار دیا جائے۔ سب کو بھائی بھائی سمجھا جائے۔ جہاں مراعات کی ضرورت پیش آئے وہاں مراعات دی جائے اور جہاں سخت گیری کی ضرورت ہو وہاں سخت گیری سے کام لیا جائے۔

خلافت راشدہ آج سے ۱۴ سو سال پہلے بین الاقوامی سیاست معاشیات اور ایک رشتہ میں جڑے ہوئے سماج کی بنیاد رکھ چکی تھی۔ فتوحات کا مسلسل سلسلہ جاری تھا پھر بھی اس وقت اس ڈھنگ کا کوئی نظریہ کارفرما نہ تھا کہ ایک بین الاقوامی انجمن بنائی جائے جسکی ہم ترتیب ہو، مختلف ڈھنگ کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی دباؤ کا شکار بنایا جائے، سازشیں کرائی جائیں، منافقت پھیلائی جائے، توڑ پھوڑ اور تخریبی نظریوں کیلئے مختلف ادارے قائم کرائے جا

۱۹۶۷ء میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل

عبداللطیف اعظمی

آزادی کے بعد ــــــ یا بہ الفاظِ دیگر تقسیم ملک کے سبب ــــــ ہندوستانی مسلمانوں کو بہت سی مشکلات اور بہت سے مصائب سے دوچار ہونا پڑا، مگر ۱۹۶۷ء ان کے لیے جتنا سخت اور بے رحم ثابت ہوا، میرے خیال میں پچھلے بیس سال کی طویل مدت میں کوئی اور سال اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ویسے تو ہندوستانی مسلمان جن مسائل سے دوچار ہیں، وہ نئے نہیں ہیں اور پچھلے سال (۱۹۶۷ء) میں کوئی خاص نیا مسئلہ پیدا نہیں ہوا، مگر بحیثیت مجموعی یہ سال مسلمانوں کو راس نہ آیا۔ اور گذشتہ برسوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی قسمت کے فیصلے ہمارے خلاف رہے۔

۱۹۶۷ء صرف مسلمانوں کے مسائل کے نقطۂ نظر سے ہی نہیں، عام حالات اور مسائل کے لحاظ سے بھی آزادی کے بعد یہ سب سے خراب سال گذرا ہے۔ قوم و ملک کو اس سال جن مشکلات اور پریشانیوں سے سابقہ پڑا، اس کی آزادی کے دور میں کوئی نظیر ملنا مشکل ہے اور جب پورے ملک و قوم کی یہ حالت رہی ہے تو مسلم اقلیت اس سے کیونکر محفوظ رہ سکتی تھی۔ مگر چونکہ ہماری گفتگو کا موضوع صرف ہندوستانی مسلمان ہیں۔ اس لیے اس مضمون میں ہم صرف ان ہی کے مسائل اور مشکلات کا ذکر کریں گے۔

ان مسائل اور مشکلات پر، جو گذشتہ سال ہندوستانی مسلمانوں کو پیش آئیں، تفصیل سے گفتگو کرنے سے قبل، بہتر ہوگا اگر میں یہ عرض کردوں کہ میرے نزدیک ان کے اہم مسائل کیا ہیں۔ میرے خیال میں وہ مسائل جن سے ہندوستانی مسلمانوں کا ذہن پریشان رہتا ہے اور جن کو حل کرنے کے لیے وہ بیتاب ہیں ــ حسب ذیل ہیں:ــ

۱۔ آئے دن کے فسادات۔
۲۔ مذہبی اور تہذیبی اقدار کا تحفظ ــ مسلم پرسنل لا
۳۔ اردو کا دستوری حق
۴۔ تعلیمی آزادی ــ مسلم یونیورسٹی کی خود مختاری
۵۔ کشمیر کا متنازعہ مسئلہ

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان میں سے دو مسئلے ــ اردو اور کشمیر مسلمانوں سے خاص طور پر تعلق نہیں رکھتے، ملک کے عام مسائل میں سے ہیں۔ یہ بات ایک حد تک صحیح ہے اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ان کو فرقہ پرستی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ان مسائل میں ہیں جن سے اوروں کے مقابلے میں مسلمان زیادہ متاثر اور پریشان ہیں۔ اس لیے ان کو بھی میں مسلمانوں کے اہم مسائل میں شمار کرتا ہوں۔ اب آیئے ان پر ذرا تفصیل سے باتیں کرلیں:ــ

ہندو مسلم فسادات ہندو مسلم فسادات کی روایات کی بنیاد برطانوی دورِ حکومت میں پڑی تھی۔ خیال تھا کہ پاکستان کے قیام سے جہاں ملک کے اور فرقہ وارانہ مسئلے حل ہو جائیں گے یہ بھی ختم ہو جائے گا۔ مگر عین آزادی کے زمانے میں یعنی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے کچھ عرصہ پہلے نئے انداز سے فسادات کی جو ابتدا ہوئی، اس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں اب بھی جاری ہے۔ خاص طور پر اسی کو حل کرنے کے لیے مجلس مشاورت کی بنیاد پڑی جس میں قوم پرست مسلمانوں کے علاوہ ــــ الّا ماشاء اللہ ــــ مسلمانوں کی تقریباً سب ہی جماعتیں شریک ہوئیں۔ ایک تو اس کی بنیاد ہی فرقہ پرستی تھی، مگر بعد میں جمعیۃ العلماء کے لوگ الگ ہو گئے تو اس میں صرف وہی لوگ رہ گئے جن کی قوم پرستی یا سیکولرزم مشتبہ ہے۔ اس کے صدر اور نائب صدر ــــ ممکن ہے ان جیسے دو ایک اور ہوں ــــ کا ماضی بلاشبہہ فرقہ پرستی سے پاک رہا ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیکولر اور قومی تحریکوں سے ان کا رشتہ اور تعلق ویسا مضبوط نہیں رہا، جیسا پہلے تھا۔ یہ جماعت بھی، جس کا بڑا مقصد ہندو مسلم فسادات کی روک تھام تھا، قطعاً ناکام رہی، نہ صرف یہ کہ آئے دن کے فسادات کو روک نہ سکی، سب سے زیادہ افسوس ناک بات ہے کہ وہ کوئی اسکیم یا فارمولا بھی پیش کرنے سے قاصر رہی جس سے اس کی روک تھام ہو سکے یا اس میں قابلِ لحاظ کمی ہو سکے۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں مجلس مشاورت نے ایک خاص انداز سے شرکت کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں نے اس کے مشورے پر عمل کیا تو فسادات پر بھی قابو حاصل کیا جا سکے گا اور دوسرے مسائل بھی حل ہو سکیں گے۔ مجلس کے دعوے کے مطابق مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے اس کے مشوروں کو قبول کیا۔ اور اس کے نمائندوں کو کامیاب بنایا، مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اسی سال جب مجلس مشاورت کے نمائندے اسمبلیوں میں پہنچے اور متعدد صوبوں میں غیر کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں، جن میں وہ جماعتیں اور اشخاص بھی شامل تھے جن کو کامیاب بنانے میں مجلس نے شاندار کارنامے انجام دیئے تھے، سب سے زیادہ فسادات ہوئے۔

مسلم مجلس مشاورت کی اس ناکامی کے بعد ضرورت ہے کہ اس مسئلے

پر از سر نو غور کریں اور نئے طریقے آزمائیں۔ سیکولر اور قوم پرور مسلمانوں نے مجلس کے قیام کے وقت جو کچھ کہا تھا یعنی یہ کہ صرف مسلمانوں کی جماعت اتنے بڑے اور مشکل مسئلے کو حل نہ کر سکے گی، حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا ہے۔ بہتر ہوگا اگر قوم پرور عناصر کی مدد سے — جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہوں — اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

مذہبی اور تہذیبی اقدار کا تحفظ — مسلم پرسنل لا ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی اقدار کے مسئلے پر صرف فرقہ وارانہ نقطۂ نظر ہی سے غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ زمانے کے حالات اور تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ یعنی ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ مسلمان ہندوستان میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں ہندو فرقہ پرست جماعتیں بالخصوص جن سنگھ ان کی سخت دشمن ہے، وہ اپنی مذہبی اور تہذیبی قدروں کو کس طرح محفوظ رکھیں؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں وہ کس پر اور کس حد تک زور دیں؟

مسلمانوں کے اس دستوری اور ملی حق سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انھیں مکمل طور پر مذہبی اور تہذیبی خود مختاری حاصل ہے اور وہ اپنی اس خود مختاری کو ہر حالت میں اور ہر قیمت پر برقرار رکھیں گے۔ مگر اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حالات کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی محض مقصد اور نصب العین کی خاطر حالات سے مجھوتہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں میں کوئی مرکزی قیادت نہیں ہے جو صحیح رہنمائی کے فرائض انجام دے سکے۔ اس کی وجہ سے عام مسلمان حالات کے تقاضوں کو سمجھنے سے قطعاً قاصر رہتے ہیں اور کبھی کبھی محض جذبات میں غلط اقدام کر بیٹھتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلم پرسنل کو لیجئے۔ ہم جب بھی اس کا ذکر کرتے ہیں تو خالص جذباتی انداز میں۔ ہم میں سے کوئی شخص یا کوئی اخبار یہ بتلانے کی کوشش نہیں کرتا کہ مسلم پرسنل کے نام سے انگریزی حکومت نے جو قانون بنایا تھا اور جس میں عدالتی فیصلوں کے ذریعے بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں، ان میں کتنی چیزیں اسلامی ہیں اور کتنی غیر اسلامی۔ کافی عرصہ ہوا ایک مذہبی ماہنامہ نے مسلم پرسنل لا نمبر نکالنے کا اعلان کیا تھا۔ میں نے مدیر محترم سے گذارش کی تھی کہ وہ یہ ضرور بتلائیں کہ مسلم پرسنل لا کیا ہے اور یہ بھی بتلائیں کہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق سماجی معاملات اور مسائل میں کیا تبدیلیاں کرنا ضروری ہیں اور یہ تبدیلیاں کون کرے۔ یہ خاص نمبر نہیں نکل سکا اور جب میں نے ان کو خط لکھ کر معلوم کیا تو ان کا جواب یہ تھا کہ انھیں اس کے لئے مضامین نہیں مل سکے۔ یہ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ اس موضوع پر مسلمانوں میں بہت کم لوگ ہیں جو لکھ سکیں اور جو لوگ لکھ سکتے ہیں، ان کی مسلمانوں میں کوئی سننے والا نہیں ہے اور علماء میں تو شاید ایک شخص بھی نہیں ہے جو اس معاملے میں ذرا بھی رہنمائی کر سکے۔ ... دار العلوم ندوۃ العلماء کے ارباب حل و عقد نے اس غرض سے ایک مجلس قائم کی تھی، جو ان اسلامی قواعد و قوانین یا مسائل پر غور کرے گی جو زمانے کی تبدیلی اور اس کے تقاضوں کی بنا پر نظر ثانی کے محتاج ہیں، مگر افسوس کہ ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اس نے اب تک کچھ نہیں کیا۔ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ہندوستانی پارلیمنٹ کو مسلم پرسنل لا میں کسی قسم کی تبدیلی کا حق نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں کا شخصی اور جماعتی مسئلہ ہے، جو کچھ تبدیلی کرنی ہوگی وہ خود کریں گے۔ لیکن چونکہ وہ خود کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے زمانہ ان کے انتظار میں رکا نہیں رہے گا۔ یہ صحیح ہے کہ زیر تبصرہ سال میں۔ ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لا یا مسلمانوں کے کسی بنیادی مذہبی اور تہذیبی معاملہ میں حکومت کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت نہیں کی گئی ہے، مگر ایسی تجویزیں پارلیمنٹ یا ریاستی اسمبلیوں میں ضرور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جن سے مسلم اخبارات میں تشویش کا اظہار کیا گیا۔ اگر مسلمانوں نے سول قوانین پر نظر ثانی نہ کی اور ضروری تبدیلیاں نہ کیں تو زمانہ بہر حال انتظار نہیں کرے گا۔ اور سیاسی جماعتیں اپنی سمجھ بوجھ اور سیاسی مصلحتوں کے مطابق کارروائیاں کریں گے۔

اُردو کا دستوری حق اُردو کو اس کا دستوری حق دلانے کے لئے ایک طویل عرصے سے جد و جہد جاری ہے۔ مختلف حالات میں اس کو مختلف قسم کی سہولتیں دی گئیں، مگر اردو والوں کا مطالبہ تھا کہ شمالی ہند میں اسے دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے، اسے اب تک تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ کا خیال تھا کہ اس سلسلہ میں جب تک شدت سے کام نہیں لیا جائے گا اس وقت تک کام نہیں چلے گا۔ ان لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ کانگریس نے اپنے بیس سالہ دور حکومت میں اردو کو تسلیم نہیں کیا، اس لئے دوسری سیاسی جماعتوں سے معاملہ کیا جائے۔ الکشن کے زمانے میں ہر جماعت کو مسلمانوں کے ووٹوں کی ضرورت تھی، اس لئے انھوں نے بڑھ بڑھ کر وعدے کئے اور سادہ لوح مسلمانوں نے ان وعدوں پر اعتماد کر لیا، چنانچہ جمعیۃ العلماء کے علاوہ تمام مسلمان جماعتوں نے کانگریس کے مخالفین کی کھل کر امداد کی اور انھیں انتخابات میں کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ بہار اور یوپی میں غیر کانگریسی وزارتیں بنیں تو انھوں نے اپنے مشترک پروگرام میں اردو کو بھی شامل کیا اور وعدہ کیا کہ اسے دستوری لحاظ سے تسلیم کیا جائے گا۔ مگر جب عمل کا وقت آیا تو انھوں نے اتنی ہی صفائی کے ساتھ انکار کر دیا جتنی صفائی سے اس کے لئے وعدہ کیا تھا۔
اردو کے کچھ حلقوں نے سیاسی دباؤ اور احتجاج کے طریقے بھی اپنائے

ہندوستانی گھروں کے لباس

[illegible] آج بھی غریب اور امیر
[illegible] پسند کرتی ہیں۔
[illegible] پوشاک کسی فرقہ کے لئے
[illegible]۔

راجستھانی دُلھن جو گھرا رنگین
لباس تو پہنتی ہے مگر اس میں
غضب کا سلیقہ ہوتا ہے۔





کشمیر کی
کنواریاں

شادی کے
موقع پر

گئے، مگر اس ہنگامہ سے نہ صرف یہ کہ کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا، بلکہ مسلمانوں کو بعض علاقوں میں اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ خاص طور پر رانچی میں مسلمانوں کو جو جانی اور مالی نقصان ہوا، اس کی مثال لسانی تنازعات کی تاریخ میں نہیں مل سکے گی۔

غرض ۱۹۶۷ء میں اردو کی جدوجہد کو جو ناکامی ہوئی ہے، اس کی بنا پر اب اس کی کامیابی کی امیدیں بالکل موہوم ہو گئی ہیں اور آیندہ کے لئے کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ میرے نزدیک صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ اردو والے حکومت سے تمام امیدیں منقطع کر کے خود اپنی کوششوں پر بھروسا کریں اور وہ اجتماعی طور پر ایسے طریقے سوچیں اور اسکیمیں بنائیں جو اردو کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس وقت صرف انجمن ترقی اردو ایک ایسی انجمن ہے جو اردو والوں کو اجتماعی کوششوں کا مرکز بن سکتی ہے، مگر اسے فی الحال عوامی امداد پوری طرح حاصل نہیں ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اپنے تعاون سے اس کو مضبوط بنائیں اور اس کے سالانہ اجلاس کے انعقاد پر زور دیں۔ جو کئی سال سے واجب ہے اور اس اجلاس میں پوری سنجیدگی کے ساتھ اردو کو کم سے کم زندہ رکھنے کے طریقے پر غور کریں۔ ہم دوسروں کا شکوہ کیا کریں جب ہم اردو والے خود کچھ نہیں کرتے۔

تعلیمی آزادی — مسلم یونیورسٹی کی خود مختاری مسلم یونیورسٹی کی خود مختاری کا مسئلہ ۱۹۶۵ء میں جب طالب علموں کی حماقت کی وجہ سے حکومت کو مداخلت کا موقع ملا، ابھر کر سامنے آیا۔ اُس وقت سے مسلمان اخبارات اس سلسلے میں برابر لکھ رہے ہیں اور اس وقت سے مسلمان عوام میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ کچھ مسلمانوں نے جن کی پشت پناہی جماعت اسلامی کر رہی تھی، عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) میں ایک رٹ بھی داخل کی تھی جو نامنظور ہو گئی۔ اس فیصلے سے مسلمانوں کے ایک مخصوص حلقے کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اپریل ۱۹۶۵ء کے افسوس ناک واقعہ کے بعد مسلم اخبارات میں مسلم یونیورسٹی کے متعلق جس طرح لکھا جا رہا ہے اور مسلمان عوام کو جو تاثر دیا جا رہا ہے، ان سب پر ملک کے موجودہ حالات اور دستور کی روشنی میں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ افسوس کہ اس خالص تعلیمی مسئلے کو سیاسی مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔ جس سے نہ تو مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچے گا اور نہ یونیورسٹی کو۔ ۱۹۶۷ء تو یونیورسٹی کو راس نہیں آیا، مگر خوشی کی بات ہے کہ ۱۹۶۸ء میں ایک مبارک فیصلہ ہوا ہے۔ یونیورسٹی کے ایک سینیر استاد کو اس کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ایک لحاظ سے یہ پہلی مثال ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس مبارک فیصلہ سے مسلمان اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور کارکن فائدہ اٹھائیں گے۔ اور یونیورسٹی کو سیاسی اکھاڑے سے نکال کر اس میں تعلیمی فضا پیدا کریں گے۔

کشمیر کا مسئلہ — شیخ عبداللہ کی رہائی ۱۹۶۵ء میں کشمیر کے مسئلے نے جو ایک نئی صورت اختیار کی، اس کے اثرات ۱۹۶۷ء میں بھی باقی رہے۔ مگر سال کے اختتام کے قریب حکومت کی پالیسی میں نمایاں تبدیلی شروع ہوئی اور شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں پر سے پابندیاں رفتہ رفتہ کم کی جانے لگیں۔ مرزا افضل بیگ کو ۱۹۶۷ء میں ہی رہا کر دیا گیا، البتہ شیخ عبداللہ کو مکمل طور پر ۲ جنوری (۱۹۶۸ء) کو رہا کیا گیا، مگر پھر بھی اس اہم واقعہ کو زیر تبصرہ سال ہی میں شمار کرنا چاہئے۔ اس لحاظ سے ۱۹۶۷ء مبارک ثابت ہوا، خدا کرے کہ ۱۹۶۸ء اس سے زیادہ مبارک ثابت ہو۔ اور کشمیر کے مسئلہ کا جو ہندوستان اور پاکستان کے لئے تشویش و اضطراب کا سبب بنا ہوا ہے، کوئی ایسا حل تلاش کر لیا جائے جو وہ تینوں عناصر — ہندوستان، پاکستان اور کشمیر — کے لئے اطمینان اور سکون کا باعث ہو اور ہندوستانی مسلمانوں کا اضطراب دور ہو۔ شیخ عبداللہ کے ابتدائی بیانات حوصلہ افزا ہیں، خدا کرے کہ وہ جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے، حالات کی پیچیدگی اور سنگینی کے پیش نظر صبر و تحمل سے کام لیں اور حسن تدبر کا ثبوت دیں۔

غرض ۱۹۶۷ء بحیثیت مجموعی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اچھا ثابت نہیں ہوا۔ مگر اسی سال کے اندر بعض ایسے تجربات یا واقعات ہوئے ہیں جن سے امید ہے کہ مسلمان سبق لیں گے اور ۱۹۶۸ء میں ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً یہ تجربہ ہوا کہ کانگریس کے علاوہ دوسری جماعتوں سے مسلمانوں نے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ صحیح ثابت نہیں ہوئیں۔ کانگریس سے مسلمانوں کو بہت سی بجا شکایتیں ہیں، مگر بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر کوئی جماعت نہیں ہے۔ مسلم مجلس مشاورت کے ذریعہ مسلمانوں کے مسائل حل نہیں کئے جا سکتے، ان کے لئے کوئی ایسی ہی جماعت مفید اور کارآمد ہو سکتی ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوں۔ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی رہا کر دیئے گئے ہیں، یہ ان کے حسن تدبر کی آزمائش ہے کہ وہ کہاں تک کشمیر کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر خود اس کے اساتذہ میں سے ایک ایسا شخص مقرر کیا گیا جس پر وہاں کے لوگوں کو بھروسا ہے۔ اگر اب بھی یونیورسٹی کی فضا بہتر نہیں ہوتی اور اس سے مسلمانوں کی شکایات بدستور باقی رہتی ہیں، تو اس میں خود مسلمانوں کی شکست ہے اور ان کو حق نہیں ہے کہ حکومت یا کسی اور کو الزام دیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کیلئے ایک لمحہ فکریہ

عبید الحق اصلاحی

مسلمانوں نے ہندوستان میں ڈچ فرانسیسیوں، پرتگالیوں اور انگریزوں کی طرح علیحدہ کالونیاں اور شہر نہیں بسائے، تجارتی مفاد کے پیش نظر منڈیاں نہیں قائم کیں، فوجی کارروائی کے لئے زمین دوز قلعے تعمیر نہیں کئے۔ نسلی امتیاز کی بنیاد پر ملک والوں سے اونچ نیچ کا برتاؤ نہیں کیا بلکہ شہروں قصبوں اور گاؤں دیہاتوں میں پھیلے اور یہاں کی قومی زندگی سے قدم ملا کے چلے غنیم کو غنیم نہیں سمجھا بلکہ پاس پڑوسی کے رسم و رواج کو اپنایا۔ ہندوستانی لباس اور کھانوں کو ترقی دی، ملک کی صنعت تجارت، علوم و فنون مصنوعات ٹکنالوجی، سائنس فن تعمیرات کو مٹانے کی جگہ اسے پروان چڑھایا۔ ملک کے ذرائع و وسائل کو اپنے محبوب وطن کیلئے مخصوص رکھا اور کوئی ایسی انڈسٹری نہیں قائم کی جسے قائم کرنے کا اوروں کو حق حاصل نہ ہو۔ اور عرب ممالک سے کسی مخصوص سامان کی درآمد پر زور نہیں دیا۔

ہندوستان کے فن موسیقی، ادب و کلچر، رسم رواج اور فن حرب کو بڑھاوا دیا، یہاں کی مذہبی زندگی سے دلچسپی لی اور پوری رواداری کے ساتھ مذہبی فلسفہ میں اضافہ کیا۔

کسی سکندر اعظم کی طرح منظم فوج لے کر وہ ملک پر حملہ آور نہ ہوئے اور ایرانی، ترکستانی یا عرب کا ایک حصہ بنا کر نہیں چھوڑا بلکہ اسی ملک میں صدیاں گذاریں، یہاں کی مسرتوں میں شریک ہوئے اور ہم وطنوں اور قومی بھائیوں کے دکھ درد میں برابر کا حصہ لیا۔

گیارہ سو سال کی تاریخ شاہد ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کا پھیلاؤ وطنی بھائیوں کی ہمت افزائی اور پسند کا نتیجہ ہے۔ طاقت اور فرمانروائی کے سہارے دنیا کی کوئی قوم ایک طویل مدت تک کسی ملک میں امن و سلامتی کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتی۔ انگریزوں کی مثال سامنے ہے جو ہندوستان صرف اقتصادی و سیاسی منفعت کے لئے آئے۔ اور سو سال بھی امن و سلامتی کے ساتھ اس ملک میں نہ ٹھہر سکے۔ انگریزوں کے سیاسی غلبہ کے ابتدائی دور سے ہی یہاں کے حریت پسند اور قوم پسند عناصر نے انکا دیس نکالا چاہا۔ آزادی کی جنگیں ہوتی رہیں۔ توڑ پھوڑ کا سلسلہ قائم رہا اور بالآخر ۴۷ء میں انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ دینا پڑا۔

اس کے بالکل برعکس ملک   نے مسلمانوں کو گلے لگایا، اس ملک میں انکے قدم جمائے، یہاں کے قومی وسائل و ذرائع کے استعمال کا انہیں موقع دیا انہیں اس قابل سمجھا کہ اپنی مذہبی قومی ملی اور سماجی زندگی میں مسلمانوں کا تعاون حاصل کریں اور انکے نظریات سے فائدہ اٹھائیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا پھیلاؤ ایک طرف اگر یہاں کی بسنے والی قوم کی غیر معمولی ہمت افزائی اور پسندیدگی کا نتیجہ ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کی زندگی کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ انکے سامنے اصل مقصد کیا تھا۔

نظریات کی تبدیلی کچھ اتنی آسان نہیں جتنا بتایا جاتا ہے لیکن.. تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کے ہر حصہ میں مسلم نظریات نے مقبولیت کی سند حاصل کی، اور بلا امتیاز مذہب و ملت انہیں تسلیم کیا۔ گاؤں اور دیہی علاقوں میں شکستہ مسجدوں کے ٹوٹے مینار اور اللہ اکبر کی اذانیں آج بھی اس بات کی شاہد ہیں کہ مسلم نظریات کو اس ملک میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ آج کے مسلمان اگر اپنے اسلاف کے کارناموں پر غور کریں تو شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں مجاہدین اسلام صوفیا کرام اولیاء اللہ کے مزارات نہ ملیں۔ آج بھی ان پر عقیدت کے پھول چڑھائے جاتے ہیں، اور پھول چڑھانے والوں میں غیر مسلم بھی ہیں۔

آج ہم شکوہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں پر ظلم کئے جاتے ہیں اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہم سے پہلے بھی اسی دنیا میں قومیں تھیں جو کتاب اللہ سے بے پرواہ ہوئیں اور اسکے نتیجہ میں انہیں ہولناک اور فیصلہ کن صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ آج کے ہندوستانی مسلمان یہودیوں کے دل سے پوچھیں کہ ان پر کیا گذری۔

آج کے مسلمانوں کا گلہ و شکوہ اپنی ذات اور اپنے اعمال پر ہونا چاہیے۔ یہ سرزمین اولادِ آدم کا حصہ ہے اور آدمؑ کے سبھی بیٹے اسکے حق دار ہیں۔ خدائے وحدہٗ لاشریک ہم سب کا خالق و مالک ہے اور وہ سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ اسکے عدل و انصاف پر لب کشائی کرنے والے سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔

آج کے ہندوستانی مسلمان اگر ہندوستان پر اسکے قومی ذرائع و وسائل یہاں کی دولت صنعت تجارت، فن اور ٹکنالوجی پر اپنا حق سمجھتے

ہیں تو یہ غلطی ہے۔ سب کی باری آتی ہے اور سب کو مواقع میسر آنے چاہئیں ہمیں صبر خاموشی اور توکل کے ساتھ اصلاح حال کی طرف مڑنا چاہیئے۔ اسلئے کہ ابھی بھی ہم مواخذہ سے بہت دور ہیں ورنہ اگر ہم سے مواخذہ ہوگیا تو بہت برا ہوگا۔

مسلمانوں نے قرآن اور آخری صحیفہ آسمانی سے صرف معمولی درجہ کی نسبت کو خلافت فی الارض اور مخلوق خدا کی سیاسی معاشی اور سماجی رہنمائی کیلئے کافی سمجھا حالانکہ صحیفہ آسمانی سے آج کی نسبت صرف روایتی بن کر رہ گئی ہے۔

مسلمان سوچیں کہ وہ اپنی داخلی عائیلی سماجی زندگی میں کس درجہ کتاب وسنت کے تابع ہیں۔ وہ تجارت میں کس درجہ ایمانداری کا ثبوت دیتے ہیں۔ حلال روزیاں انہیں کتنی حاصل ہوتی ہیں۔ وہ کس حد تک سچ بولتے ہیں اور عہد وپیماں کے کتنے پابند ہیں۔ ان میں خوف خدا کتنا ہے، اور انکے ظاہر وباطن میں کس درجہ مطابقت ہے۔

اسلام کوئی جاگیر نہیں جو کسی کو عطا کر دی جائے بلکہ رب السموات والارض کا ایک عام عطیہ ہے جسکے مستحق سب ہی اولاد آدم ہیں۔ اس نظریہ کو جس نے اپنایا۔ عملی زندگی میں برتا۔ حالات کا مقابلہ کیا، قربانیاں دیں اور اپنی زندگی موت مال ومتاع سب کو خدا اور اسکے رسول کیلئے مخصوص سمجھا وہی دراصل اسکے حقدار ہیں اور صرف انہیں ہر طرح کی مراعات حاصل ہونی چاہیئے۔

کتاب اللہ کی ذمہ داری اٹھا کر مسلمان خدا اور اسکے بندوں دونوں کے سامنے یکساں طور پر جوابدہ ہیں اور انکی اصل پوزیشن دراصل ایک سپاہی مجاہد، خادم ورکر اور پاسباں کی ہے نہ کہ حاکم وفرمانروا کی۔

فرمانروائی کے احساس نے مسلمانوں کو ہمیشہ پیچھے کیطرف دھکیلا انکا قتل عام ہوا۔ وطن سے نکالے گئے۔ مسجدیں شہید کی گئیں۔ معصوم بچوں کا قتل ہوا اور عورتوں کی بے آبروئی ہوئی۔ آج کے مسلمان یہود ونصاریٰ سے سبق حاصل کریں جن پر خدا کا غیض وغضب اور گمراہی کی لعنت مسلط ہے اور جو تاریخ کے ہر دور میں دنیا کے سامنے ایک الجھن بنکر سامنے آئے۔ مسلمان شکر ادا کریں کہ وہ یہاں بس گئے انکے قدم چومے گئے۔ انہیں بسایا گیا ان پر بھروسہ رکھا گیا۔ انہیں امین سمجھا گیا اور انکی قیادت قبول کی گئی۔

آج کے مسلمان مذہبی اور سیاسی گروہ بندیوں کے شکار ہیں۔ کتاب وسنت سے انہوں نے اپنا رشتہ کاٹ لیا ہے۔ اپنی اجتماعی زندگی ختم کر دی ہے اور احساس برتری کے شکار ہیں۔ جنت کو اپنے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔ خدا انکے لئے ہے۔ دنیاوی ذرائع ووسائل پر کارفرمائی کا صرف انہیں حق حاصل ہے۔ جسطرح آج سے بہت پہلے یہود ونصاریٰ نے کہا تھا ہمیں خدا کے چہیتے اور برگزیدہ لوگ ہیں اگر کوئی جنت میں جا سکتا ہے تو صرف یہود ونصاریٰ۔ جسکے جواب میں کہا گیا کہ خدا کی لعنت اور پھٹکار ہے اس قوم پر جس نے انبیاء کا قتل کیا، عہد وپیمان توڑے، سرکشی کی، کتاب اللہ کی بیع وشرا کی، آیات کی تحریف کی، اخراج وطن کرتے رہے۔ جرائم کو پروان چڑھایا۔ حلال کو حرام اور حرام کو اپنے اوپر حلال کیا۔

کلام پاک نے قوم عاد وثمود، قوم لوط، قوم انرر وفرعون کے انجام سے ہمیں آگاہ کیا اور بارہا جھنجھوڑا کہ ہم پچھلی گمراہ وتباہ شدہ قوموں کی اتباع نہ کریں۔

آج کے ہندوستانی مسلمان قرآن وسنت سے بہت دور جا چکے ہیں اور انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان مراعات کا مطالبہ کریں جو ایک صاحب کتاب قوم کو حاصل ہونی چاہیئے۔

اس مذہبی زبوں حالی کیطرف علمائے اہل حدیث، علمائے دیوبند علمائے ندوۃ العلماء، علمائے مدرسۃ الاصلاح، شعراء فلسفی فنکار، سیاسی رہنما سبھی متوجہ رہے لیکن ہم نے کسی ایک کی نہ سنی۔ دلی کا محدث گھرانہ حالی شبلی، اقبال، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد احیائے ملت کے لئے قوم کو جھنجھوڑتے رہے لیکن ہم نے روحانی زندگی کو تیاگا اور مادی زندگی سے چمٹے رہے۔

اسکے بالکل برخلاف اگر ہندوستانی مسلمان ہندوستان میں اپنے ماضی کا جائزہ لیں تو ہمالیہ کی چوٹیوں سے لیکر جنوبی ساحل اور خلیج بنگال سے لیکر بحیرۂ عرب تک اسلاف کی یادگاریں آج بھی اس شاندار ماضی کی ایک تلخ یاد دلا رہی ہیں۔ شکستہ حال مسجدیں، مقبرے، خانقاہیں۔ درگاہیں، قلعے، تاریخی یادگاریں۔ سرائیں، تالاب کنوئیں اور سڑکیں گذرے ہوئے کارواں کو آواز دے رہی ہیں۔

ماضی میں مسلمانوں کا دور حکمرانی مذہبی رواداری، مراعات، قومی یکجہتی، انصاف، برابری بھائی چارہ خوشحال فراوانی، امن وامان بیرونی حملوں سے ملک کی حفاظت کی ایک تلخ یاد ہے۔ جو نشتر کی طرح دل پر اثر کرتی ہے۔

لال قلعہ، پرانا قلعہ، قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ، صفدر جنگ آگرہ فورٹ، فتح پور سکری، تاج محل، دلی کی شاہی مسجد، قوت الاسلام کے گرتے ہوئے در وبام، شیر شاہ کا قلعہ، مقبرہ شیر شاہ، پٹھان اور مغل عہد کی عمارتیں، جاگریں سرائیں، شہر فصیل، شاہی دروازے ماضی کی تلخ یادیں ہیں جنھیں آج کے مسلمان فراموش نہیں کر سکتے۔

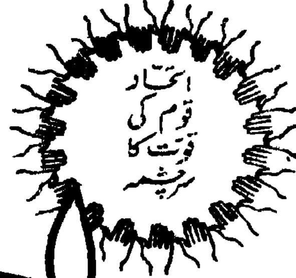
حضرت معین الدین چشتی، حضرت بختیار کاکی، حضرت نظام الدین اولیاء حضرت چراغ دلی، پاک پٹن شریف، مہرولی میں اولیاء اللہ کے مزارات، مسجد اولیاء آج کے ہندی مسلمانوں کے لئے ایک سوالیہ بنے

بقیہ ص ۸۲

مِل جُل کر
منانے والا دن

آج ہماری جمہوریہ کی اٹھارہویں سالگرہ ہے، آج
کے دن ہم پھر اِعلان کرتے ہیں کہ ہم اپنے
عظیم مُلک پر نازاں ہیں اور اِس کے عظیم مستقبل پر بھروسہ رکھتے ہیں۔
اِس موقع پر ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اتحاد ہماری قوت ہے۔
اتحاد کے بل بوتے پر ہی ہم
امن اور خوشحالی کی
من چاہی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔
آئیے، ہم مِل جُل کر خود کو اس کام کی تکمیل کے لئے پھر سے
وقف کر دیں، جس سے ہمارا مُلک اور ہماری قوم بنیں گے

ایک عظیم مُلک ، ایک عظیم قوم





پاکستان ... ایوب خان کے
سیاسی سوانح حیات پر ایک نظر

خود نوشت سوانح۔ خواہ کسی کے بھی ہوں، دل چسپی سے پڑھے جاتے ہیں اگر یہ کسی سربراہ ملک کے ہوں تو اور زیادہ دل چسپی و اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ صدر پاکستان محمد ایوب خاں کے "سیاسی سوانح حیات" بھی اسی آخری ضمن کی کتاب ہے، جو حال ہی میں "آقا نہیں دوست" یا "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" کے نام سے انگریزی اور اردو میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ہمارے لئے یوں بھی اور زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ یہ ایک ایسے سربراہ ملک کی سرگزشت ہے جو ہمارا قریب ترین ہمسایہ ہے۔ پچھلے بیس برسوں میں پاکستان کے ساتھ ہمارے تعلقات کی جو نوعیت رہی ہے، اس کے پیش نظر اس کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر اردو ترجمہ ہے جو جناب غلام عباس نے کیا ہے۔

کتاب کے نام "آقا نہیں دوست" یا "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" سے گمان تھا کہ اس کا اصل مخاطب امریکہ ہے۔ سرورق کی یہ عبارت بھی اسی خیال کی غمازی کرتی ہے، جو جلی قلم سے لکھی گئی ہے۔

> "ترقی پذیر ممالک کے باشندے دوستوں کی اعانت کے ضرورتمند ہیں، لیکن ایسی اعانت — جو باہمی عزو وقار کی بنیاد پر استوار ہو۔ وہ دوستی چاہتے ہیں — کسی کی بالادستی تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔"

لیکن کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اس خیال کو مرکزی نہیں بلکہ ثانوی حیثیت حاصل ہے، اور مصنف کا بنیادی مقصد ہندستان و پاکستان کے تعلقات کے بارے میں پاکستانی موقف کی وضاحت کرنا اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرنا ہے کہ ہندستان پاکستان کا دشمن نمبر ایک ہے چنانچہ کتاب کا ایک چوتھائی سے زیادہ حصہ اسی کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ اور:۔

گرچہ۔ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ

کتاب کے ۱۱۴ صفحات میں سے ۱۲۰ صفحات پر ہندستان کا ذکر ملتا ہے، جن میں طرح طرح سے اسی کی تکرار کی گئی ہے کہ:۔

> "ہندستان کا رویہ شروع ہی سے دشمنی کا تھا، اور اس میں کوئی کمی نہ آئی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ پاکستان کو وجود میں آتے ہی اپاہج کر کے رکھ دیا جائے۔ اس نے مالیات میں ہمارے حصے سے ہمیں محروم رکھا اور اس تمام قول و قرار سے پھر گیا، جو رسد اور ساز و سامان میں ہمارے حصے کی بابت اس نے بہ ظاہر بڑے صدق دل سے کئے تھے۔ اس کے بعد ہندستان نے ہمیں کشمیر کی لڑائی میں الجھا دیا، جنگ بندی کے اعلان کے بعد ہمیں ایک بڑے کٹھن علاقے میں پانسو میل لمبے محاذ کی رکھوالی کرنی پڑی ۔ ۔ ۔ ۔" (ص ۸۱)

عتیق صدیقی

سے غرض نہ تھی۔ وزیراعظم کو اس بات کی بڑی تشویش تھی کہ واپسی پر ان کا کیا حشر ہوگا۔ میں نے بڑی مشکل سے انھیں سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ وطن واپس چلنے پر تیار کیا۔ وہ بار بار مجھ سے یہی سوال کرتے تھے — کیا تم اس بات کی ضمانت دے سکتے ہو کہ واپس پہنچنے پر مجھے گرفتار نہیں کیا جائے گا . . . .

"راستے میں میں نے اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی سے کہا کہ کراچی پہنچتے ہی وزیراعظم کو گورنر جنرل کے پاس لے جانا سخت خلاف مصلحت ہوگا . . . . آخر یہ طے پایا کہ ہم میں سے کچھ کو گورنر جنرل کی کوٹھی پر جانا چاہیئے . . . . اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی اور میں، ہم تینوں گورنر جنرل کی کوٹھی پر پہنچے۔ اور وزیراعظم چند آدمیوں کے ہمراہ اپنے بنگلے کو روانہ ہوئے۔

"گورنر جنرل اوپر کی منزل میں اپنی خواب گاہ میں لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے خون کا دباؤ بہت بڑھ گیا تھا، اور پیٹھ میں بڑی سخت تکلیف تھی۔ جس کی وجہ سے وہ سیدھے ایک تختہ پر چاروں شانے چت لیٹے تھے۔ وہ غصہ سے آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ اور گالیوں کی بوچھاڑ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ گالیاں کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ چودھری محمد علی نے جراُت کر کے کچھ کہا۔ اس کے جواب میں ان پر بوچھاڑ پڑی . . . . انھوں نے غصے میں غرا کر کہا — جاؤ، جاؤ، دور ہو جاؤ — . . . وہ بس ہمیں بھگا دینا چاہتے تھے۔ ہم ایک کے پیچھے ایک ان کی خواب گاہ سے نکلے۔ آگے آگے اسکندر مرزا، ان کے پیچھے چودھری محمد علی، اور سب کے پیچھے میں۔ میں کمرے سے باہر قدم رکھنے ہی کو تھا کہ اس نرس نے جو ان کی خدمت پر مامور تھی، میرا کوٹ پکڑ کر کھینچا۔ میں پلٹا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میں ایک بالکل مختلف آدمی سے دوچار ہوں یہی ہمارے بیمار اور بوڑھے گورنر جنرل، جو لمحہ بھر پہلے غصے سے دیوانے ہو رہے تھے، اب ان کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا تھا، اور وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا۔ آپ بھی بڑے حضرت ہیں۔ انھوں نے ایک خاص مسرت کی چمک آنکھوں میں لئے مجھے اشارہ کیا کہ مسہری پر بیٹھ جاؤ۔

"اس کے بعد انھوں نے تکیے کے نیچے سے دو دستاویزیں



نکالیں۔ ان میں سے ایک پر کچھ اس قسم کی عبارت تھی —
میں غلام محمد فلاں فلاں وجوہ کی بنا پر فلاں فلاں اختیارات جنرل ایوب خان کو سونپتا ہوں اور انھیں حکم دیتا ہوں کہ وہ تین ماہ کے اندر اندر آئین تیار کریں۔ دوسری دستاویز کچھ اس قسم کی تھی کہ میں نے اس پیش کش کو قبول کر لیا ہے۔

"میں نے کہا — آپ جلدبازی سے کام لے رہے ہیں۔ . . . میں فوج کی تعمیر میں مصروف ہوں۔ ہمارا ایک دشمن ہے ہندوستان، جس کو رام کرنا بڑا دشوار ہے۔ ہم ہزار چاہیں کہ وہ ہمیں دشمن نہ سمجھے، مگر وہ دشمن سمجھنے پر تلا ہے۔ میں اپنے پیشہ میں رہ کر ملک کی بہتر خدمت کر سکتا ہوں"۔ (ص ۸۴ تا ۸۹)

غلام محمد کے بعد وزیراعظم چودھری محمد علی نے بھی جنرل ایوب خان سے کہا۔

"تم یہ کام کیوں نہیں سنبھال لیتے، اور مجھے چھٹکارا کیوں نہیں دلا دیتے" (۹۲)۔

سر آغا خان نے بھی جنرل ایوب کو بلا کر یہی مشورہ دیا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"مجھے آغا خان مرحوم سے اپنی ایک دلچسپ ملاقات اب تک یاد ہے، جو لیاقت علی خان کے قتل کے کچھ ہی دن بعد ہوئی تھی۔ . . . انھوں نے کہا . . . کہ اگر آپ نے پارلیمانی نظام اختیار کیا تو اس سے [پاکستان سے] ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ دراصل میں نے یہی بتانے کے لئے تمہیں یہاں بلوایا ہے۔ اور تنہا تم ہی وہ شخص ہو جو پاکستان کو بچا سکتے ہو۔ . . . اس نظام

بقیہ صـــ ۱۱۹ ـــ پر



سلطان علاء الدین خلجی کا نظامِ سلطنت

تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود علاء الدین خلجی نے غیر یقینی حالات میں اپنی انتظامی صلاحیتوں اور مضبوط ارادوں سے ملک کو داخلی اور خارجی استحکام بخشا۔ وہ جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور داماد تھا۔ اسکی بیوی اور ساس کی رعونت نے اپنی سسرال کی طرف سے اسکے دل میں انتقامی جذبہ پیدا کر دیا۔ اسی احساس نے سب سے پہلے اسے ایک ناقابلِ شکست جنرل بنا دیا اس نے جلال الدین خلجی کے سامنے ہی نہ صرف اپنے صوبہ کا بہترین انتظام کیا بلکہ جس مقامی ریاست پر بھی ہاتھ ڈالا فتح و نصرت نے اس کے قدم چومے اور بے شمار دولت حاصل ہوئی۔ اور وہ اپنے خسر کو قتل کرا کے سلطنت پر قابض ہو گیا اور بہت جلد دشمنوں کو بھی دوست بنانے میں کامیاب ہوا۔

شمال مغرب میں دریائے سندھ اسکی سلطنت کی حد تھی۔ سندھ اور پنجاب دونوں اسکی سلطنت کا جزو تھے۔ گجرات، موجودہ یو۔ پی۔ مالوہ، وسط ہند، اور راجپوتانہ پر اسکا براہِ راست قبضہ تھا۔ دکن میں نربدا ندی تک کی ریاستیں اسکی خراج گذار تھیں۔ ان فتوحات نے اسے اتنا زعم اور اعتماد بخشا کہ وہ سکندر ثانی کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگا۔ اس کے ہم عصر مورخ اور عالم مثلاً امیر خسرو اسے خلیفہ وقت کے نام سے معنون کرتے ہیں۔ اس کا ہم عصر مورخ برنی لکھتا ہے کہ اسکی غیر معمولی کامیابیوں نے اسے کچھ ناممکن العمل منصوبے بنانے پر مجبور کیا۔ اس نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالنے اور دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ لیکن عین الملک ملتانی اور قاضی مغیث الدین اور کوتوالِ شہر قاضی علاء الملک نے اسے اسکے منصوبوں میں اعتدال پیدا کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے ان صاحب الرائے مشیروں نے اسے نیا مذہب قائم کرنے سے باز رکھا اور دنیا کو فتح کرنے سے پہلے اپنے ملک کے تمام حصوں کو اپنے قبضہ میں لا کر داخلی امن و امان اور خوشحالی پیدا کرنے کا مشورہ دیا۔ علاء الدین خلجی نے ان مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ملک کو خارجی اور داخلی عافیت دی۔ منگولوں کے متواتر حملوں نے ملک کا امن و امان برباد کر رکھا تھا اس نے اپنی فوجی قوت اور مدبرانہ حکمت عملیوں سے ان کا قلع قمع کیا۔ ملک کے اکثر و بیشتر حصہ کو اپنی سلطنت کا زیرنگیں کیا۔ راجپوتوں اور دوسری طاقتوں کو اپنا وفادار بنا لیا۔ فوجی اصلاحیں کیں، زراعتی اور اقتصادی اصلاحوں کی بدولت عوام و خواص کی ہمدردیاں حاصل کیں اور اپنے عہد اور حالات کے لحاظ سے پوری دنیا میں ایک کامیاب اور فیض رساں حکمراں ثابت ہوا معلوم ہوتا ہے۔ شیر شاہ سوری اور اکبر اعظم جیسے عظیم منتظم شہنشاہوں نے اسی کی بنیاد پر اپنی حکمت عملیوں کی عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ اکبر نے اس سے آگے قدم بڑھا کر "دینِ الٰہی" کی بنیاد بھی ڈال دی جو ملک کے ایک معقول طبقہ کی ناراضگی کا سبب بنی چونکہ قاضی علاؤالملک اور قاضی مغیث الدین کے مقابلہ میں شیخ مبارک، ابوالفضل اور فیضی نے اکبر کو غلط مشورے دیئے تھے۔

علاءالدین خلجی کے مشیروں نے اسے آگاہ کر دیا تھا کہ مذہب کی بنیاد ڈالنا حکمرانوں کا نہیں بلکہ پیغمبروں کا کام ہے۔ مذہب منصوبوں اور طاقت سے نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی اقدار سے وجود میں آتا ہے۔ حکمراں کا فرض جہانداری اور جہانبانی تو ہو سکتا ہے، مذہبی سرداری حاصل کرنا نہیں۔ لہٰذا علاءالدین خلجی نے مذہبی رہنماؤں کی ہمدردیاں بھی حاصل کریں راجپوتوں اور ہندوؤں سے مناسب سلوک کر کے ایک سیکولر طرز حکومت کی بنیاد ڈال دی اس نے سوچا کہ ہندوؤں سے عموماً اور راجپوتوں سے خصوصاً اچھے تعلقات پیدا کر کے ہی وہ آرام کی نیند سو سکتا ہے۔ اس نے اپنی اور ولی عہد کی شادی راجپوت راجکماریوں سے کی۔ اور انہیں حرم میں داخل کر کے ذاتی آزادی بخشی۔ اسکی اس پالیسی کے نتیجہ میں راجپوت صوبیدار اسکی طرفداری میں راجپوتوں سے لڑے اور ہمیشہ اسکے وفادار رہے۔ اس نے ترکوں اور دوسرے غیر ملکی امرا کے مقابلہ میں ہندوستانی اور نومسلم امرا کو عہدے دیئے۔ ایک طرف ترکوں کی اجارہ داری ہمیشہ کے لئے ختم کر دی اور دوسری طرف ملک کافور جیسے نومسلم کو اعلیٰ ترین مقام دے کر مقامی باشندوں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ اس نے مسلم امراء، ہندو زمینداروں، اور مقامی عہدیداروں، دولت مند تجاروں اور صنعت کاروں، مذہبی ٹھیکداروں غرض سوسائٹی کے ہر قسم کے اجارہ داروں کو سرکاری احکام پر سختی سے عمل کرنے پر مجبور کیا وہ مجرموں اور ملزموں کو سخت سے سخت سزا دینے میں کبھی نہیں ہچکچایا۔ حتیٰ کہ ثبوت ملنے پر اپنے بیٹے کو بھی جیل میں ڈال دیا۔ اسے جاگیرداریوں کی بجائے نقد تنخواہیں مقرر کیں مقدموں، چودھریوں کھوٹوں اور بلھاریوں کی بالادستی سے عوام کو نجات دلائی۔

علاءالدین خلجی نے عدل و انصاف کی طرف خاص توجہ دی۔ اس سے پہلے مسلم سلطنت کی بنیاد شریعت پر قائم تھی اس نے شریعت سے بھی سرمو انحراف نہیں کیا لیکن حالات اور ضرورت کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے اجتہاد کی بنیاد ڈالی۔ ہر شہر میں لازمی طور سے کوتوال مقرر کئے اور ایک معقول پولیس اسکی مدد کے لئے متعین کی معقول تعداد میں جاسوسوں کا جال بچھا دیا۔ وہ معمولی سے معمولی واقعہ کی اطلاع بہم پہنچاتے تھے۔ مجرموں کے لئے اس نے   سے بھی زیادہ غضبناک سزائیں مقرر کی تھیں۔

اس نے فوجی اصلاحوں پر کافی زور دیا۔ اسکی فوج بھی پیدل، سوار اور ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ سوار فوج کا حصہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے اسے ہر لحاظ سے مضبوط اور مکمل بنانے کی کوشش کی۔ اس نے اچھی سے اچھی نسل کے گھوڑے دوسرے ملکوں سے درآمد کئے۔ منگولوں سے چھینے ہوئے گھوڑوں کو محفوظ رکھا اور دکن کی معارکات کے دوران وہاں سے بہترین گھوڑے اور ہاتھی اپنی فوج کیلئے جمع کراتا رہا۔ اس نے اچھے گھوڑوں کی افزائش نسل کا بھی ایک محکمہ قائم کیا سپاہی گھوڑے خریدنے کی قوت کم ہی رکھتے تھے اور ادل بدل کرنے کے بھی امکانات رہتے تھے اس نے سرکار کی طرف سے گھوڑے مہیا کر کے انہیں داغنے کا رواج دیا تاکہ گھوڑے تبدیل نہ کئے جا سکیں اپنا گھوڑا رکھنے والے سپاہی کی زیادہ تنخواہ مقرر کی ایک سے زیادہ گھوڑا رکھنے والے کو مزید تنخواہ ملتی تھی۔ اس نے فوج کو براہ راست اپنے چارج میں لے لیا اور فوجیوں کی حاضری کا طریقہ ایجاد کیا۔ وہ تمام تقرر اور ترقیاں بذات خود منظور کرتا تھا اور فوج کو سرکاری خزانے سے نقد اور وقت پر تنخواہ دلاتا تھا۔ صرف وہی لوگ فوج میں بھرتی ہو سکتے تھے جو گھوڑسواری [illegible] ازی اور ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت رکھتے ہوں۔ فوج میں پریڈ کا رواج تو نہیں تھا لیکن اس نے فوج کو کبھی آرام سے نہیں سونے دیا۔ اگر وہ معارکات سے فارغ رہتی تو اسے شکار وغیرہ میں مصروف رکھتا تھا۔ پیدل سپاہی کی تنخواہ ۷۸ تنکہ تھی۔ گھڑ سواری کی تنخواہ ۱۵۶ تنکہ اور ایک گھوڑا اپنا رکھنے والے سپاہی کی تنخواہ ۲۳۴ تنکہ تھی۔ دوسرا گھوڑا رکھنے والے سپاہی کو ۷۸ تنکہ مزید ملتے تھے۔

قاضی حمیدالدین ملتانی نے اپنی خیرالمجالس میں لکھا ہے کہ ایک روز انہوں نے سلطان کو ایک چھوٹے سے تخت پر ننگے سر بیٹھے ہوئے پیروں کو زمین پر رگڑتے ہوئے کچھ بڑبڑاتے دیکھا۔ انہوں نے باہر آ کر فوراً ملک قرابیگ کو یہ ماجرا سنایا اور قاضی موصوف نے ہمت کر کے سلطان کی خدمت پہنچکر اس کا سبب معلوم کیا سلطان نے جواب دیا کہ خدا نے مجھے سب کچھ دیا میں نے اس کی مخلوق کیلئے کیا کیا۔ مجھے یہ فکر ستاتی ہے اگر میں اپنا سارا خزانہ یا اس سے دس گنا خزانہ اور تمام دیہات اور ولائتیں بھی لٹا دوں تو بھی خدا کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی ہے کہ ضروریات زندگی کی نرخ مقرر کر کے ان پر کنٹرول کر دوں تو شاید خلق خدا کی میں کچھ خدمت کر سکوں۔ اس کے اس مفاد عامہ کے احساس کے علاوہ اپنے فوجی نظام اور ملکی انتظام کو زیادہ سے زیادہ استحکام دینے کی اسے ہر وقت فکر رہتی تھی وہ سرکاری ملازمین

فوجیوں اور اپنے عوام و مخلص کو زیادہ سے زیادہ خوشحال دیکھنا چاہتا تھا۔ ملازمین کی تنخواہیں بڑھانا خارج از بحث تھا لہٰذا اس نے قیمتوں کو کنٹرول میں رکھنے کا باقاعدہ منصوبہ بنایا اور اس پر سختی سے عمل کرانے کے لئے سخت انتظامات کئے۔ معمولی سے معمولی فرو گذاشت پر سخت سزائیں مقرر کیں۔ سارے ملک میں جاسوسی کا جال بچھا دیا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے اس نے یعقوب نام کے ایک زبردست منتظم کو دیوان ریاست مقرر کیا۔ ہر ایک صنعت کے لئے ایک علیحدہ شحنہ مقرر کیا۔ ملک قبول کو شحنۂ غلہ مقرر کیا۔ یعقوب نے شحنہ ملبوسات کا چارج اپنے ہاتھ میں لیا۔ اسی طرح شحنۂ فرس شحنہ مویشیاں وغیرہ کے علیحدہ علیحدہ شحنہ مقرر ہوئے شحناؤں کے تحت بہت سے برید مقرر ہوئے۔ جو قیمتیں، وزن اور ناپ تول وغیرہ پر نظر رکھنے کے علاوہ بازاروں پر پوری نگرانی رکھتے تھے اور تفصیلی رپورٹ سلطان کو پہنچاتے تھے۔ منہیا یا خفیہ پولیس والے براہ راست سلطان کو اطلاعیں پہنچاتے تھے۔ اگرچہ ہر بازار کے اپنے مسائل تھے لیکن کچھ مسئلے تمام بازاروں کے لئے یکساں تھے۔ مثلاً چونکہ سلطان نے ہر چیز کے دام کم کر دیئے تھے یہ ممکن تھا کہ تھوک فروش یا تجار چیزوں کو سٹاک کرلیں اور ان نرخوں پر چیزیں بیچنے سے انکار کر دیں یا مصنوعی قلت پیدا کر کے عوام کے لئے دقتیں پیدا کر دیں۔ اور پورا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔ سلطان نے سب سے پہلے دلالوں کا صفایا کیا۔ وہ فروشندہ اور خریدار دونوں سے اپنا کمیشن وصول کرتے تھے۔ قحط، خشک سالی یا درآمد کی کمی بھی ہو سکتی تھی۔ تجار اور دکاندار ناپ تول وزن میں بڑھیا چیز کے مقابلہ میں گھٹیا چیز دے کر بھی گڑبڑ کر سکتے تھے۔ ان تمام امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے علاءالدین خلجی نے مارکیٹ کے اصول و قوانین وضع کئے۔ تجاروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ۱۔ درآمد کرنے والے تجار ۲۔ اور تھوک فروش اور خردہ فروش تجار ہر قسم کی مارکیٹ کیلئے دونوں قسم کے تجاروں کو لائسنس دیکر ان کی فہرست تیار کی گئی۔ ان سے باقاعدہ اقرار کرایا گیا کہ وہ ضرورت کے مطابق مقررہ قیمتوں پر اور وقت پر چیزیں مہیا کرتے رہیں گے۔ ان کے بیوی بچوں کو بھی شہر میں لاکر ساتھ رکھنے کا حکم دیا گیا تاکہ اگر وہ انفرادی یا مجموعی طور پر کسی جرم کے مرتکب ہوں تو انہیں بیوی بچوں کے ساتھ سزا کا مرتکب گردانا جائے۔ تجاروں کی

معمولی غفلت لاکھوں عوام پر اثر انداز ہو سکتی تھی لہٰذا انہیں پوری ذمہ داری کا احساس دلانے کیلئے انہیں سخت سزاؤں کا موجب قرار دیا گیا جس کے نتیجے میں معمولی سے معمولی چیز کی قلت یا نایابی سننے میں نہیں آتی تھی۔ بازاروں میں یا انکے قریب کہیں بھی دلالوں کا وجود بھی دکھائی نہیں دے سکتا تھا بڑھیا سلک، اونی اور ریشمی کپڑے، اور آرائشی سامان جیسی نادرات دیوان ریاست کو پیش درخواست دیکر ضرورت ثابت کر کے پرمٹ سے حاصل ہو سکتی تھیں۔ اسکے بعد پوری تحقیق کی جاتی تھی کہ وہ شخص ان چیزوں کے استعمال کا اہل اور ضرورت مند بھی ہے یا نہیں۔

جھوٹا پرمٹ حاصل کرنے والے کو سخت سزا دی جاتی تھی قحط، خشک سالی اور کمیابی کے پیش نظر غلہ سرکاری سٹوروں میں جمع رکھا جاتا تھا اور ضرورت پڑنے پر تجاروں کو مقررہ نرخ پر دیدیا جاتا تھا۔ ایسے ناگہانی موقعوں پر کوئی شخص ایک وقت میں چھ سات سیر سے زیادہ غلہ نہیں خرید سکتا تھا سر بازار گھٹیا ٹھوکریں لگانا یا وزن کی برابر تجار کے جسم سے گوشت کاٹ لینا جیسی کم تولنے والے یا دوسری بے ایمانیاں کرنے والوں کیلئے سزائیں تھیں۔ اسی طرح علاءالدین خلجی نے تجاروں کے مفادات بھی پیش نظر رکھے قیمتیں مقرر ہو جانے سے ان کے منافع کی شرحیں تو کم ہو گئیں لیکن نقصانات کے امکانات بھی کم ہو گئے۔ ضرورت پڑنے پر سرکاری خزانے سے قرضوں کی پیش کش کی گئی اگر کسی چیز کی قوتِ خرید قوتِ فروخت سے زیادہ آ پڑی تو تجار کو کچھ نہ کچھ کمیشن وضع کرنے کا اختیار دیا گیا اور اس نقصان کا خمیازہ خریدار نہیں بلکہ سرکار کو بھگتنا پڑتا تھا۔ سرکاری حکام دیہات اور قصبات سے براہِ راست سامان خرید کر تجاروں کو سپلائی کرتے تھے۔ تجار اس ذمہ داری سے قطعی بری الذمہ تھے۔ قیمتوں کے نرخوں کی فہرستیں دیوان ریاست، شحنہ، برید اور تجار سب کے پاس رہتی تھیں۔ تجاروں کو مول تول وغیرہ میں اپنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سلطان نے غلہ کی قیمتیں یہ مقرر کی تھیں۔

گندم ۷ ½ جیتل فی من — ایک من آجکل کے بارہ تیرہ سیر کے برابر تھا۔ اور ایک تنکہ

جَو ۴ جیتل فی من

چنا، چاول، ارد وغیرہ ۵ جیتل فی من — جسکے ہیں ۴۸ جیتل ہوتے تھے۔

غلہ کی تجارت کرنے والوں کے نام ملک قبول کے پاس محفوظ رہتے تھے۔ دہلی کو غلہ سپلائی کرنے والے بیانہ اور دوآبہ

سے غلہ خرید کرلاتے تھے۔ مقامی حکام کاشتکاروں کو محکوم کرتے
تھے کہ وہ ضرورت سے زیادہ غلہ فصل اٹھاتے ہی ان تجاروں کو
فروخت کردیں۔ تجاروں کے نام اور قیمتیں بھی اس فرمان میں
مندرج ہوتی تھیں۔ پہلے انہیں اخلاقی طور پر محکوم کیا جاتا تھا۔
خلاف ورزی کرنے والے کا غلہ ضبط کرکے قرار واقعی سزا دی
جاتی تھی۔ سرکاری غلہ کے سٹور کو بھرپور رکھنے کیلئے دوآبہ کی مال
گذاری نقدی کی بجائے جنس کی شکل میں وصول کی جاتی تھی۔
تاکہ بوقت ضرورت تجاروں کے ذریعہ عوام میں فوراً غلہ پہنچ
جائے۔ ان پابندیوں کے تحت علاءالدین خلجی کے عہد حکومت
میں کبھی غذائی مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ شہروں کے علاوہ دیہات
کے باشندے بھی شہروں کی دکانوں سے غلہ خرید کر اپنا گذارہ
بخوبی کرتے تھے۔

ملبوسات مقابلتاً کمیاب تھے۔ اگر بزاز مقررہ قیمتوں پر
فروخت کرتے تھے تو وہ نقصان میں رہتے تھے۔ لہٰذا کوئی شخص
کپڑے کا لائسنس لینے کیلئے آمادہ نہ ہوتا تھا۔ سلطان نے اس
تجارت کو ملتانیوں کے سپرد کیا۔ انہوں نے سرکاری ایجنٹ کے
طور پر یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک خاص کمیشن لیکر
فروخت کرنا شروع کیا۔ انہوں نے سرکاری خزانے سے قرض لیا
اور مقررہ قیمتوں پر کپڑے فروخت کرکے کل روپیہ بغیر کسی نفع
نقصان کے سرکاری خزانے میں داخل کردیا اور سرکار سے اپنا
کمیشن وصول کرلیا۔ لہٰذا اس طرح سرکار نے خود کپڑے کی سرکاری
تجارت شروع کردی۔ معمولی یا گھٹیا کپڑا تو کافی سستا تھا لیکن
سلک اور بڑھیا کپڑا کافی مہنگا تھا۔ برنی نے ملبوسات کے یہ نرخ لکھے
ہیں:۔

دلی کی سلک	۱۶ تنکہ فی تھان
سلہٹی فائن	۶ 〃 〃
اوسط درجہ کی	۴ 〃 〃
معمولی	۲ 〃 〃
صافہ کا بڑھیا کپڑا	۱ 〃 ۲۰ گز
بستر کی چادریں	۱۰ جیتل فی تھان

دیگر اشیاء کی خرید و فروخت کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا
گیا تھا۔ ان میں سے کچھ کے نرخ اسطرح تھے۔

گھوڑا عمدہ نسل	۱۰۰ سے ۱۲۰ تنکہ
〃 دوسرے درجہ کا	۸۰ سے ۹۰ تنکہ
گھوڑا تیسرے درجہ کا	۶۵ سے ۷۰ تنکہ
گائے درجہ اول	۱۰ سے ۱۲ تنکہ
〃 معمولی	۳ سے ۴ 〃
خچر	۱۰ سے ۲۵ 〃
نوکرانی قبول صورت	۲۰ سے ۴۰ تنکہ
〃 معمولی	۵ سے ۱۲ تنکہ
لڑکے	۲۰ سے ۳۰ تنکہ

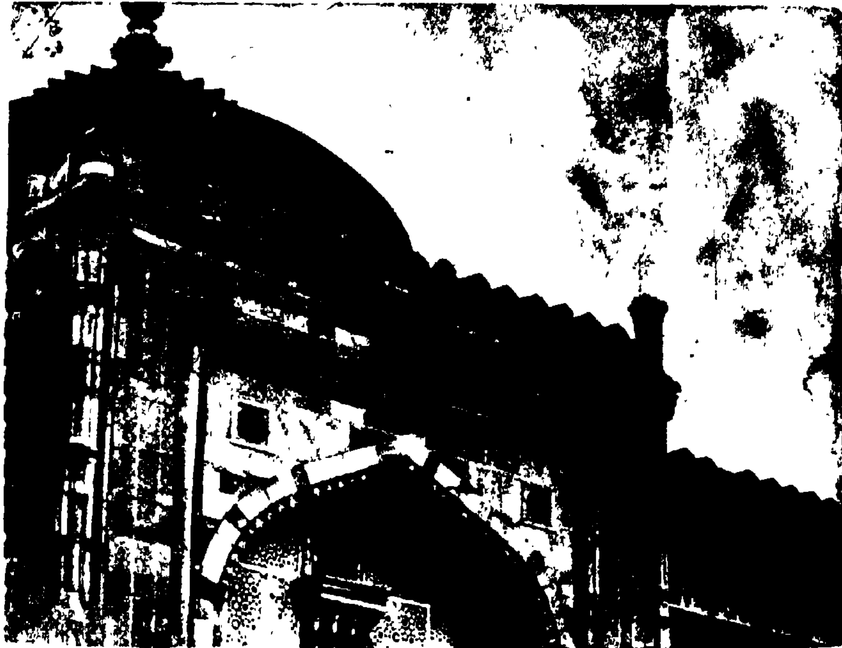
سرکاری حکام کچھ تو اپنے کردار کی بدولت اور کچھ سزاؤں
کے خوف سے اپنی ذمہ داریاں ایمانداری سے سرانجام دیتے
تھے۔ سلطان چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے ذریعہ سودا منگواکر تلواتا
تھا فرق پڑنے پر دیوانِ ریاست کے ذریعہ مجرم کو سزا دی جاتی
تھی ملک مقبول بھی معتوب ہونے سے نہ بچا۔

سلطان کے ان احکامات اور ان پر سختی سے عمل کرانے
کی بدولت، امراء، دولت مند تجاروں، سرکاری ملازمین اور
عوام الناس غرض ہر ایک طبقہ پر اثر پڑا۔ انہیں جائز طور پر
زندگی گذارنے کے مواقع ملے۔ لہٰذا زمینداروں اور کاشتکاروں
کی حالت سے بھی سلطان بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے
اس میدان میں بھی کچھ انقلاب آفریں قدم اٹھائے۔ اس نے
دیکھا زمیندار طبقہ بغیر کسی محنت کے زیادہ سے زیادہ مالدار
ہوتا جا رہا ہے۔ وہ سرکاری احکام اور مقامی افسروں کی بہت
کم پرواہ کرتے تھے۔ اگر انہیں کوئی سزا دی جاتی تو انکی طرف
سے بغاوت کا خدشہ تھا۔ اس نے سلطنت کی تمام زمین کو خالصہ
(براہ راست سلطان کی مملکت) کی شکل دیدی۔ انعام، ملک
اور وقف وغیرہ کی شکلیں ختم کردیں۔ کوئی زمیندار اپنی ذاتی ملکیت
کا مالک نہ رہا۔ سرکاری زمینوں کے جملہ حقوق سے محروم کردیا
گیا۔ مسلم زمینداروں کے علاوہ مقامی مقدم، چودھری، کھوٹ
وغیرہ کسانوں سے مالیانہ وصول کرکے سرکاری خزانے میں داخل
کراتے تھے اور کافی اس میں سے خرد برد کرتے تھے۔ اور نہ بھی
کرتے تھے تو کاشتکاروں سے نقد اور بیگار وصول کرتے تھے۔ ان
میں سے اکثر نے اپنے ذاتی مویشیوں کے نام سے چراگاہیں محفوظ
کر رکھی تھیں۔ ان مویشیوں سے وہ کافی کماتے تھے پھر بھی اس زمین
پر کوئی محصول ادا نہ کرتے تھے۔ لہٰذا وہ کافی مالدار تھے وہ بڑھیا
ملبوسات، سنہری زیورات سے مزین رہتے تھے پان چباتے
تھے۔ اور شہسواری کرتے پھرتے تھے اور سلطنت کی رسی ڈھیل

تے ہی اسے محصول تک نہ پہنچاتے تھے۔ اور مقامی امرا کے بغاوتوں کے موقعوں پر ان کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ سلطان ان سب باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے سرکاری واجبات مطالبہ کیا۔ ذاتی ملکیت کا تخمینہ لگانے کے لئے پٹواریوں کے غذات کی جانچ پڑتال کرائی۔ ان درمیانی کارندوں کی ذاتی ملکیتوں صول عائد کئے۔ مویشیوں کی تعداد کے حساب سے چراگاہوں زمینوں پر بھی ٹیکس مقرر کئے۔ عاملوں کو سختی سے محکوم کیا گیا کہ وہ اریوں اور ان درمیانی ایجنٹوں کو آپس میں نہ ملنے دیں اور کاشت روں کو پریشان نہ ہونے دیں لہذا مقامی زمین دار بھی سرکار ہ وفادار اور مطیع ہو گئے اور بقول برنی کے کچھ دنوں میں ہی وہ شتکاروں کے رتبہ کو پہنچ گئے۔

سلطان نے اپنے پیش رو سلطانوں کے مقابلہ میں علماء کا ر بھی کم کر دیا۔ اس سے پہلے ملک کی سیاست میں وہ کافی دخیل ہتے تھے اب صرف عدالتی اور مذہبی تقرران کے مشوروں سے تے تھے دوسرے معاملات میں ان کا دخل نہیں رہا۔ سلطان نے کچھ دوسری سماجی اصلاحیں بھی کیں۔ شراب کی کشید اور استعمال دنوں پر پابندیاں لگا دیں۔ قمار بازوں کیلئے سخت سزائیں تجویز یں۔ غلط اعتقادات کی تشہیر کرنے والوں، جادوگروں کو سنگساری ی سزا دلوائی۔ زناکاری کی پاداش موت ہوئی۔ ان اصلاحوں نے علماء اور صوفیوں کی ہمدردیاں بھی حاصل کریں۔

اپنی ان انتظامی صلاحیتوں اور اپنے احکامات کی کامیابیوں کے تحت علاء الدین خلجی مسلم حکمرانوں میں پہلا سلطان ہے جس نے ملک کے اتنے بڑے حصہ کو زیر نگیں لا کر ترکی امراء، علماء، ہندو زمینداروں، راجاؤں، تاجروں، کاشتکاروں اور افسروں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا۔ ایک زبردست فوج تیار کر کے اس سے کام لیا۔ صحیح موقعوں پر صحیح افسروں کا انتخاب کیا۔ اپنی رائے اور اپنے فیصلوں کو منوایا اور ضرورت پڑنے پر اپنے مشیروں کے مشوروں پر بھی عمل کیا۔ کیقباد کی طرح نہ تو وہ جذبات کا غلام تھا نہ بلبن کی طرح منگولوں سے خائف نہ محمد بن تغلق کی طرح ضدی اور خودبین و خود آرا تھا بلکہ وہ شیر شاہ کی طرح معمولی درجہ سے اعلیٰ درجہ تک پہنچا تھا اور عیش میں یادِ خدا اور طیش میں خوفِ خدا رکھتا تھا وہ اکبر اعظم کی طرح جاہل ہوتے ہوئے اپنے ملک اپنی رعایا اور اپنی حکومت سب کے لئے کریم النفس اور فیض رساں ثابت ہوا۔ تغلق، شیر شاہ، اکبر، انگریز اور حتیٰ کہ ہماری آزاد گورنمنٹ نے بھی اس کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کاش اس کی کنٹرول پالیسی پر ہماری حکومت زیادہ توجہ دے اور ہمارے ہم وطن اسی ایمانداری اسی جذبے اور اسی اتحاد کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہو کر ملک کو متحد اور خوشحال بنا لیں۔



کامیاب قیادت

اصول

لیڈر شپ کا سوال

لیڈر شپ کسے کہتے ہیں۔ اسکے لئے کیا خوبیاں چاہئیں۔ یہ خداداد ہے یا لیڈر بنائے بھی جاسکتے ہیں۔ لیڈر بننے میں کن عناصر کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ کامیاب لیڈر بنانے میں کن لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اسکی تربیت کب اور کہاں شروع ہوتی ہے؟

ان سوالات کے جواب میں دوسری جنگ عظیم کے مشہور اتحادی کمانڈر اور کوریا میں اقوام متحدہ کی بھیجی ہوئی فوجوں کے سی این سی جنرل مارک کلارک نے ایک ایڈریس (خطبہ) دیا تھا جس سے ذیل کا اقتباس ماخوذ ہے۔

میں تمام عمر ایک پیچیدہ سوال کے حل میں لگا رہا۔ دنیا کی دوسری قومیں بھی اسکے سلجھانے میں لگی ہوئی ہیں اسلئے کہ یہ بڑائی کی کنجی بھی ہے اور عظمت کا نشان ــــ

اس پیچیدہ سوال کو جو پرانا کشمکش اور دردِ سر دونوں ہی ہے۔ ہم لیڈر شپ کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں۔ انگلستان کے فیلڈ مارشل مانٹ گمری کا خیال ہے کہ لیڈر شپ اس صلاحیت اور اس قوت ارادی کا نام ہے جو بلا امتیاز جنس رنگ و نسل نوع انسان کو مشترکہ مفاد کے ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کرتی ہے۔

بہرنوع۔ لیڈر شپ کی آپ جس ڈھنگ سے بھی تعریف کریں یہ طے ہے کہ لیڈر شپ نام جیسی صلاحیت کمیاب ہے۔

یہ سوچئے کہ کم عمر لڑکوں میں جرائم کہاں جنم لیتے ہیں۔ میرے خیال میں وہیں جہاں گھرانوں میں صحیح لیڈر شپ کی کمی ہوتی ہے۔ وہ خاندان جو صحیح لیڈر شپ سے محروم ہوتے ہیں اپنے بچوں کو جرائم کیطرف بڑھنے سے روکنے میں بھی ناکام ہوا کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ سوچئے کہ عام طور پر تعفن اور گندگی کہاں زیادہ پائی جاتی ہے۔ آپکو اندازہ ہوگا کہ یہ سب کچھ وہیں ہوتا ہے جو علاقے اچھے لیڈروں سے محروم ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کی قوموں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ کونسی سیاسی تنظیمیں اپنا سیاسی وجود کھو بیٹھتی ہیں۔ میرے خیال میں عموماً وہی جنکی قیادت کمزور ہوتی ہے۔

پرانی کہاوت کے بالکل ہی برعکس کہ لیڈر جنم لیتے ہیں، بنائے نہیں جاسکتے میرے خیال میں لیڈر شپ کا فن بخوبی سکھایا جاسکتا ہے اور اس پر پورا عبور بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی صفات ہیں جو بہتر اور کامیاب لیڈر شپ کیلئے درکار ہیں۔

آیئے آپکے سامنے کچھ ایسی بنیادی باتیں پیش کروں جنکی کارفرمائی لیڈر شپ کی تشکیل کیلئے ناگزیر ہے۔

مثال کے طور پر بھروسہ کو لے لیجئے (CONFIDENCE)۔ اگر کوئی لیڈر خود اعتمادی جیسی ناگزیر صفت سے محروم ہے تو عوام کا کوئی فرد اس پر کبھی بھروسہ نہیں کرسکتا۔ رہی یہ بات کہ بھروسا کی صلاحیت کیسے پیدا کی جائے تو اس سلسلہ میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ لگاتار کوشش سے بھروسا جیسی صفت اور صلاحیت خود بخود پیدا ہوجاتی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ تجربہ اور عمل کے ہر مرحلہ پر اعتماد میں اضافہ ہونا چاہیے۔ اگر اعتماد میں کمی ہورہی ہے تو یہ بات انتہائی تشویشناک ہے۔ یہ بھروسا بہتر مقابلہ کی صلاحیت، بہتر تربیت، تجربات اور ندرت بھی مہارت و قدرت سے بڑھتا رہتا ہے۔ مقابلہ بہتر تربیت اور تجربات بھروسا کیلئے ناگزیر بنیادیں ہیں۔

خود اعتمادی اور بھروسے کی ایک مثال ہمیں ہنی بال کے قومی ارادہ سے ملتی ہے۔ آج سے کوئی دو ہزار سال قبل اسکا خیال تھا کہ وہ کوہ ایلپس کی برفانی چوٹیوں سے ساٹھ ہزار فوج اور ہاتھی کے دستوں کو لیکر کامیابی کے ساتھ روم پر چڑھائی کرسکے گا اور ہوا بھی یہی۔ قیامت خیز برفانی ہواؤں کے باوجود ہنی بال اپنی خود اعتمادی پر قائم رہا اور فوج کشی میں کامیاب رہا۔

فوجی تاریخ میں ہنی بال کا یہ کارنامہ انتہائی جرأت مندانہ اور حوصلہ مندانہ سمجھا جاتا ہے۔ ہنی بال کی یہ خود اعتمادی باپ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھی۔ اس کا باپ جنرل ہیملکار تھا۔ اس نے ہنی بال کو فوجی تربیت دی اور جنگی داؤ پیچ میں اس درجہ باکمال بنایا کہ زمانہ قدیم میں اسکا مد مقابل ملنا دشوار ہے۔

قوت عمل (ENERGY) ایک لیڈر جو کچھ اپنے ساتھیوں سے کرانا چاہتا ہے اسے وہ سب کچھ بلکہ کچھ اور بھی خود بخود کرنے کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ ایک لیڈر میں مقابلتاً زیادہ دشوار گذار کاموں کے کرگزرنے کی صلاحیت ہونی چاہئے۔ ثبات قدمی، مزید خطروں کے مقابلہ کی صلاحیت مسافت طے کرنے اور خفت اٹھانے پر قدرت ایک لیڈر کیلئے ناگزیر اوصاف ہیں۔ ایک لیڈر کی قوت عمل اسکی قوت ارادی کا پرتو ہوا کرتی ہے۔ اسلئے قوت ارادی جس درجہ قوی ہوگی کسی لیڈر کی قوت عمل بھی اسی مناسبت سے بڑھی ہوگی۔

وقت کا لحاظ (TIMING) ایک لیڈر کے معمولات کے پس پردہ اس کی فراست، شعور اور دور اندیشی کام کیا کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں سر ونسن وڈ کا مقولہ مشہور ہے "وقت گذر جانے پر سوچنے والا لیڈر کبھی کسی نسل کی صحیح رہنمائی نہیں کر سکتا۔" ولسن کا یہ نظریہ اسکی اپنی ڈرامائی زندگی کی شہادت بھی ہے۔

صاف بینی۔ CLERITY۔ ایک لیڈر اگر منطقیانہ طرز استدلال سے محروم ہے تو وہ کبھی کسی سوال پر لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ اسکے ساتھ ہی اُسے کئی متبادل نظریوں کا مقابلہ بھی کرنا چاہیئے اور پھر کسی فیصلہ پر آنا چاہیئے۔ ان مرحلوں سے گذرنے کے بعد ہی اُسے قومی رہنمائی اور لیڈر شپ کے سوال پر غور کرنا چاہیئے اس سلسلہ میں ممتاز مفکر ۔ ۔ ۔ ۔ کا مقولہ مشہور ہے "جو لیڈر صرف خیالی پلاؤ پکا سکتا ہو اور اُسے یہ نہ معلوم ہو کہ کسی خیال کو کس طرح پیش کیا جائے تو اُسے سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہی سمجھنا چاہیئے۔"

دلیری۔ BRAVERY دلیری اور شجاعت کے بارے میں مشہور ہے کہ بہادر کی موت دیر سے ہوا کرتی ہے۔ ایک لیڈر کو نہ صرف یہ کہ بہادر ہونا چاہیئے بلکہ اُسے اپنے ساتھیوں کو بھی بہادر اور دلیر بنانا چاہیئے۔

شاید ہمارے زمانہ کا عظیم ترین لیڈر سر ونسٹن چرچل ہے جو سنگین صورت حال میں بھی صداقت گوئی سے باز نہیں آیا خصوصاً ایسے موقعوں پر جبکہ صداقت گوئی خوف و ہراس کا دوسرا نام تھی۔ کسی تبصرہ نگار نے چرچل کے بارے میں لکھا ہے "انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا فرد گذرا ہو جس نے ایسی تلخ باتیں کہی ہوں اور اسکے باوجود اپنی قوم کو جرأت فراوانی اور مسرت سے مالامال رکھا ہو۔"

کشش۔ ATTRACTION۔ کسی کامیاب لیڈر کی ذات بذاتِ خود مقناطیس ہے اور کسی بڑی سے بڑی غلط فہمی کے ازالہ کیلئے کافی ہوا کرتی ہے۔ ذاتی کشش ایک ایسا بیش قیمت وصف ہے جو کسی ادنیٰ انسان کو کبھی بھی لیڈر بنا سکتی ہے۔ کشش کی عظیم طاقت عوام کو لیڈر پر بھروسہ کراتی ہے۔ عوام نہ صرف یہ کہ خود بخود لیڈر کیلئے کام کرنے پر تیار رہتے ہیں بلکہ اُسکے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی باز نہیں آتے۔

قوت کشش صرف اچھے ارادہ والی شخصیتوں پر منحصر نہیں۔ کی بھی یہ خوبی تھی جو آگے چل کر تاریخ انسانیت کیلئے ایک عظیم المیہ بنا۔ کشش جب اصحاب کردار میں پائی جائے تو پھر اسکی طاقت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ اس قوت کشش سے متعلق ایک مختصر اور اثر پذیر انجیل کی ایک کہانی مجھے یاد ہے۔

انجیل کی آیات میں کسی جگہ حضرت عیسیٰ مسیح عوام میں نفرت کی نگاہ سے دیکھے جانے والے ایک ٹیکس کلکٹر کو اپنی پیروی کیلئے کہتے ہیں۔

میتھو نام کا ایک شخص ٹیکس وصول کرتا دکھائی دیتا ہے۔ پیسوں سے اُسے بہت محبت ہے۔ اقتدار کی غلط فہمی میں بھی وہ مبتلا تھا۔ کسی روز کوئی اجنبی میتھو کے پاس سے گذرتا ہے۔ اُسکی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے "میرے ساتھ آؤ" میتھو نے حضرت عیسیٰ مسیح سے نہ تو کوئی سوال و جواب کیا نہ پس و پیش کیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ حضرت عیسیٰ مسیح جیسی عظیم جاذب شخصیت کا یہ فرمان تھا اور اس سے زیادہ میتھو کو اور چاہیئے کیا تھا۔

التفات۔ ATTENTION۔ تجربہ نے مجھے بتایا کہ عوام اس لیڈر کی ایک سننے کو تیار نہیں جب تک انہیں یہ یقین نہ ہو کہ واقعتہً لیڈر ان کے مسائل اور الجھنوں سے دلچسپی بھی لے رہا ہے۔ مخلصانہ توجہ ہر کس و ناکس کی بات نہیں ہوا کرتی۔ یہ صرف انہی لوگوں کو حاصل ہے جو صحیح بصیرت اور صحیح نظر رکھتے ہوں۔ مخلصانہ توجہ لیڈر شپ کی تعمیر کے لئے ناگزیر جز کا درجہ رکھتی ہے۔

کردار۔ CHARACTER۔ ایک نہ بدلنے والا طریق کار اور اعلیٰ ذاتی کردار کا نمونہ ہونا ایسی ضروری باتیں ہیں جو کسی بھی لیڈر کو شروع سے حاصل ہونی چاہئیں۔

یہی وجہ ہے کہ فوجی ادارے ہمیشہ ہی سے احساس فرض، وقار کے سوال، ملک و مالک حقیقی کی ذات سے محبت جیسی باتوں پر بہت زور دیا کرتے ہیں۔ ان اداروں کو اس بات کا علم ہے کہ بغیر کسی قطعی ذاتی کردار کے ایک فرد خود اپنی ذات کے بارے میں مشکوک رہا کرتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ ایک کامیاب لیڈر بن سکے۔

لیڈر کا بھروسہ

مذکورہ بالا اوصاف کے علاوہ ایک لیڈر کو اپنے قدر دانوں پر پورا بھروسہ رکھنا پڑتا ہے۔ ٹھیک ویسا ہی بھروسہ جیسا کہ لیڈر کو اس اصل مقصد سے ہوتا ہے جسکی طرف وہ اپنی قوم کی رہنمائی کر رہا ہوتا ہے۔

نپولین کا اپنی قوم کی بہادری پر اعتماد کبھی ختم نہیں ہوا۔ پر قبضہ کے کسی موقع پر اپنے توپ خانہ کو نپولین نے ایک ایسی خطرناک جگہ لے جانے کا حکم دیا کہ فوجی افسر اس پر اعتراض کر بیٹھے۔ ان لوگوں نے صاف طور سے کہا کہ کوئی سپاہی اتنا بڑا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں۔ نپولین نے اُسی وقت

> لیڈر شپ کسے کہتے ہیں۔ اسکے لئے کیا خوبیاں چاہئیں یہ خدا داد ہے یا لیڈر بنائے بھی جاتے ہیں۔ لیڈر بننے میں کون عناصر کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ کامیاب لیڈر بنانے میں کن لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کی تربیت کب اور کہاں شروع ہوتی ہے؟

ایک نوشتہ آویزاں کرایا جس پر لکھا تھا کہ "خوف و خطرہ سے قطعی محفوظ جگہ" نتیجہ یہ نکلا کہ توپ خانہ مجوزہ جگہ لے جایا گیا اور نپولین کی توپیں بڑی کامیابی کے ساتھ دشمنوں پر چلائی جا سکیں۔

سازگار فضا کی ضرورت

اب سوال یہ ہے کہ لیڈرشپ کے اوصاف پیدا کرنے کیلئے ہم فضا کو کسطرح ہموار کریں جہاں لیڈرشپ کی تربیت ہمیں مل سکے۔

اس سوال کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اس زمین کو گھروالے انجام دیں اور کامیاب لیڈر بنانے کیلئے وہ برابر اپنی کوشش جاری رکھیں۔ اعلیٰ درجہ کی لیڈرشپ کیلئے تربیت ہمیشہ گھر سے شروع ہوا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر بھروسہ کی بات کو لے لیں۔ اس خاصہ کی بنیاد دین یک طالب علم کے اسکول جانے سے بہت پہلے پڑ چکی ہوتی ہیں تھوڑے کام کو کامیاب طور پر انجام دینے سے یہ خاصہ بڑھتا ہے۔ والدین کو برابر ہی بچوں کی ہمت افزائی کرتے رہنا چاہیئے اور بہتر مشورے سے اپنی اولاد کو باخبر رکھنا چاہیئے۔

اگر آپ یہ چاہتے ہوں کہ آپ کا بچہ کوئی نمایاں کارنامہ انجام دے تو اسکے لئے آپکو مواقع بھی فراہم کرنے پڑیں گے تاکہ بچوں کی دلچسپی اور مذاق کی صحیح پرورش کا موقع بھی مل سکے۔ اور اسکا دائرہ بھی وسیع ہوتا ہے والدین کو اس مقصد کے لئے برابر بچوں کی صحیح رہنمائی کرتے رہنا ہوگا۔ اسکے لئے وقت کی قربانی دینا پڑے گی اور ساتھ ہی بچوں کا جائزہ لیتے رہنا ہوگا کہ انکا بچہ کس ڈھنگ سے آگے بڑھ رہا ہے۔

آپ یہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ مخصوص اخلاقی قدروں کی بنیاد گھر میں ہی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر وقار اور خودداری کے سوال کو لے لیں یا پھر جذبہ اطاعت و فرمانبرداری کے سوال پر غور کریں۔ ان اخلاقی قدروں کی گھر میں ہی بنیاد پڑا کرتی ہے، بول چال اور کردار سے اسکی توثیق ہوا کرتی ہے۔

لیڈر بننا کچھ اتنا آسان کام نہیں۔

ایسی کسی غلط فہمی میں ہمیں نہ آنا چاہیئے کہ لیڈر بننا کچھ اتنا آسان کام ہے۔ پہلے کبھی یہ ہو سکتا تھا لیکن موجودہ حالات میں لیڈر بننا آسان نہیں رہا۔ آج لیڈر بننے کے لئے ہمیں سب کچھ از خود کرنا پڑتا ہے اور بڑے دشوار گذار مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

نٹشے کا مقولہ مشہور ہے: "اجتماعی زندگی کے سنگم پر زندگی گراں تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک طرف پیچھے چلنے والوں میں سرد مہری بڑھتی ہے تو دوسری طرف لیڈر کی ذمہ داریوں کے بوجھ میں اضافہ ہوتا ہے اور اس سارے دردسر کے بعد بھی جو ایک لیڈر کو اٹھانے پڑتے ہیں۔ کامیابی کی کوئی یقینی دہانی نہیں ہوتی۔

اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ جو لوگ اجتماعی زندگی کے صبر آزما مرحلوں سے گذرنے کیلئے تیار رہتے ہیں انکے لئے بیشمار صلے اور انعام واکرام بھی ہوا کرتے ہیں۔ کامیابی انہی لوگوں کے قدم چومتی ہے جو عظیم خطرات سے ٹکرانے اور انجان صورت حال سے مقابلہ کی اپنے اندر غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہوں۔

امریکہ کے سابق صدر کینڈی نے کسی جگہ لکھا ہے "صحیح خوشی کا حصول انسان کی خداداد صلاحیتوں کے استعمال میں مضمر ہے۔" اس صلاحیت کا استعمال وہاں ہونا چاہئے جہاں اسکی ضرورت پیش آئے۔ ایک لیڈر بھی مسرت و کامرانی کیلئے کوشاں ہے جو صرف مذکورہ طریقوں سے ہی اسے حاصل کر سکتا ہے۔

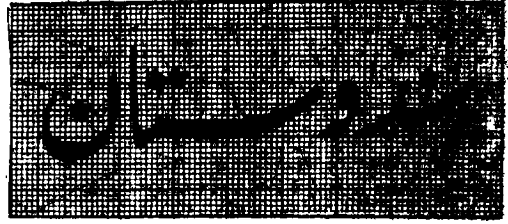
ہم میں سے اکثر حضرات لیڈرشپ کے اس پیچیدہ سوال کو اگر سمجھ لیں اسکے مطابق زندگی بسر کرنی شروع کر دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا مستقبل محفوظ اور تابناک نہ ہو۔ ہماری آئندہ نسل صحیح منزل کی طرف نہ بڑھے اور اسمیں خوشحالی، ترقی فلاح و بہبود نہ ہو۔

بقیہ
ہندوستانی مسلمانوں کے لئے
ایک لمحہ فکریہ

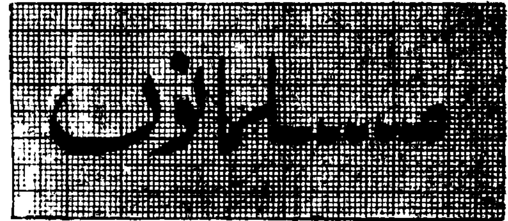
ہوئے ہیں۔ وہ کون لوگ تھے، کہاں سے آئے تھے، اب کہاں ہیں۔ انہوں نے خلف کیلئے کیا درس چھوڑا۔ انکی عظمتیں بڑائیاں، صبر، قربانیاں تعلیمات تصوف سب کچھ ہمیں ماضی کے شاندار دور کی یاد دلا رہے ہیں اور کاروان حیات کے بچھڑے ہوؤں کو آگے آنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

"تاریخ عالم میں صدیوں کا شمار نہیں ہوتا لیکن ہم صرف ۲۰ سالوں میں چیخنے لگے۔ اسلاف کے درس کو بھلا بیٹھے کہ خود انہوں نے سچائی خلوص دیانتداری، محبت فروتنی، تزکیہ نفس، روحانیت اور فنا فی اللہ ہونے کا کیا عظیم الشان درس ہمارے لئے چھوڑا جو مردہ قوموں کو از سر نو زندگی بخش سکتا ہے۔ اور جو تعصب فرقہ پرستی تنگ نظری امتیازات دشمنی اور رقابت کو دوستی محبت، تسلیم و رضا مراعات، رفاقت ہمت افزائی، اتحاد باہمی، بقائے باہمی اور رشتہ و خون کی مضبوط کڑیوں میں منسلک کر سکتا ہے۔

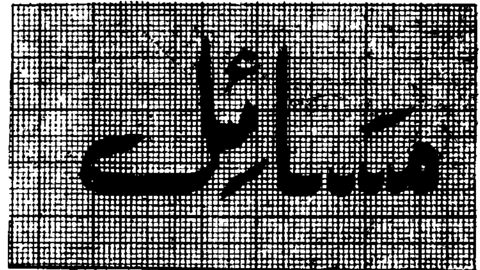
محمد عثمان فارقلیط



میں



کے



ہمیں ابتدا ہی میں دو باتوں کو تسلیم کر لینا چاہئے، اوّل یہ کہ ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل موجود ہیں اور انہیں بہت سی مشکلات درپیش ہیں۔ مسلمانوں کے مسائل سے انکار کرنا یا تو بے حسی اور غفلت کی دلیل ہے یا خوف اور مرعوبیت کی نشانی دوئم یہ کہ حکومت مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے سے قاصر رہی ہے۔ اس نے اپنی خاص پالیسی کے تحت مسلمانوں کے مسائل میں اضافہ تو کیا ہے انہیں حل کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہندوستانی مسلمان اپنا قومی اور سماجی رول ادا نہ کر سکے تو اس پر حیرت نہ کرنی چاہئے البتہ یہ بات ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں پر بیس سال سے جو افتاد پڑتی رہی ہے اس کی وجہ سے ان کے اندر علیحدگی پسندی کا رجحان پیدا نہ ہو سکا، اپنا واجبی رول ادا نہ کرنا علیحدگی پسندی کے ہم معنی نہیں ہے، قدرتی طور پر مذہبی اور روایتی طور پر بھی مسلمان علیحدگی پسند نہیں ہو سکتا۔ اس کا نقطۂ نظر تو آفاقی ہے اس لئے وطن کے جغرافیہ میں وہ علیحدگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر مسلمانوں کی جگہ کوئی دوسرا طبقہ ہوتا اور وہ بیس سال تک تنگ نظری اور تعصب کے شکنجہ میں کسا جاتا تو اسے اپنے وجود ہی سے انکار کر دینا پڑتا اور اس کی سابقہ حالت بالکل بدل جاتی، مگر ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی جان و مال، عزت و آبرو کو آزمائش میں ڈال کر بھی اپنے آپ کو علیحدگی پسندی کے حوالہ نہیں کیا، اور وہ بدستور ہندوستانی سماج اور ہندوستانی قوم کا جزو بنا رہا۔

مسلمانوں کا پہلا مسئلہ

مسلمانوں کے مسائل میں پہلا اور بنیادی مسئلہ جان و مال کا تحفظ ہے مگر انہیں یہ چیز حاصل نہیں ہے، شمالی ہند اور مشرقی ہندوستان میں اور جنوبی ہند کی اکثر ریاستوں میں بیس سال سے ان کی جان و مال پر برابر شب خون مارا جا رہا ہے جب ہم نے حکمرانوں میں سے بعض کو بار بار یہ کہتے سُنا کہ فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے باہر کی دنیا میں ہماری گردن شرم سے جھک گئی ہے تو ہمیں اس پر بڑی ندامت ہوئی کیونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مارا جانا تو ہندوستان کا اندرونی معاملہ ٹھہرا مگر باہر کی دنیا میں پنڈت جواہر لال نہرو کی گردن شرم کے مارے جھکتی رہی۔ جب پاکستان غلطی سے مُسلم کش فسادات پر حکومت ہند سے وضاحت طلب کرتا ہے تو حکومت فسادات کو ہندوستان کا اندرونی معاملہ قرار دے کر پاکستان کے احتجاج کو رد کر دیتی ہے۔ ایسی صورت میں فسادات پر شرم کے مارے گردن جھکانا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے، اپنے اندرونی معاملات پر شرم کس کو آتی ہے؟ تاہم شرم کے احساس سے یہ تو معلوم ہوا کہ یہاں مسلمانوں کو، جان و مال کو تحفظ حاصل نہیں ہے اور پھر بات یہ ہے کہ اس عدم تحفظ کی بنا پر ہندوستانی مسلمان حکومت سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں اور انہیں ایڈمنسٹریشن پر قطعی اعتماد نہیں رہا ہے۔ حال ہی میں جب رانچی کے مسلمانوں پر افتاد پڑی اور ہٹیا میں مسلمانوں کا بے دریغ قتل ہوا اور ان کے اثاثہ کو پوری بے دردی کے ساتھ نذر آتش کیا گیا تو وزیر داخلہ مسٹر چاون نے رانچی کا دورہ کرنے کی زحمت فرمائی اور واپس ہونے کے بعد انہوں نے اپنے بیان میں فرمایا کہ ریاستی وزارت کو سختی سے ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ فسادات کو ہر قیمت پر اور ہر طریقہ سے روکیں اور فرقہ واریت کو قابو میں لانے کی کوشش کریں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کی ہدایت میں قدرت نے کیا تاثیر رکھی تھی کہ اسی صوبۂ بہار میں جہاں رانچی اور ہٹیا کا فساد ہوا وہیں چھ فسادات اور ہوئے جن میں کوئی فساد بھی شدّت سے خالی نہ تھا۔ پھر یو۔پی کے کئی مقامات مسلم کش فسادات کی زد میں آئے اور اب ضلع بستی میں تیسرا فساد ہوا ہے، یو۔پی سے فراغت کے بعد مہاراشٹر پیچھا نے فسادات کا ایک اچھا ریکارڈ قائم کیا۔ اس طرح رانچی اور ہٹیا کے فسادات کے بعد ہم فسادات اور ہوئے اور ابھی یہ سلسلہ

قائم ہے۔ اور ہمیں انتظار رہے کہ مزید فسادات کی نوید کہاں سے آتی ہے۔ ان فسادات کے بعد ہمیں اس بات کی مطلق خواہش نہیں کہ مرکزی وزیر داخلہ مسٹر چاون کی گردن شرم سے جھک جائے اور وہ سوچ میں پڑ جائیں کہ ان کی ہدایت کے بعد ہی فسادات کی کثرت کیوں ہوئی اور ریاستی وزرا اعلیٰ ان کی ہدایت پر عمل کیوں نہ کر سکے یہ وضاحت رہے تاکہ حکومت کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ اگر مسلمانوں کو حکومت اور ایڈمنسٹریشن پر اعتماد نہیں رہا تو یہ بالکل قدرتی بات ہے۔ اور اس میں مسلمانوں کی کسی بدگمانی کو دخل نہیں ہے۔

مسلمانوں کا دوسرا مسئلہ

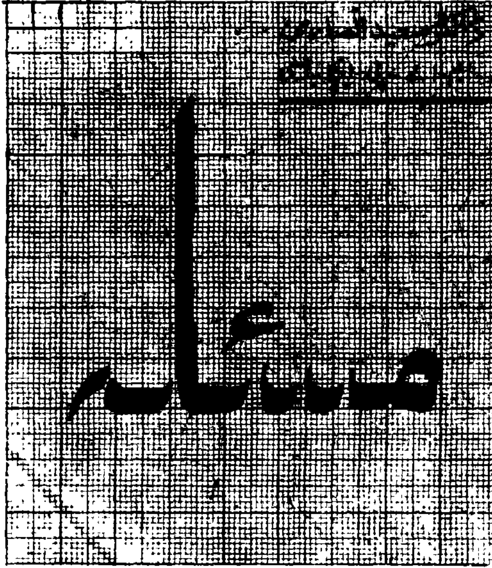
مسلمانوں کا دوسرا مسئلہ جو پہلے مسئلہ سے کچھ کم اہم نہیں، ہے ان کی مذہبی اور ثقافتی انفرادیت ہے۔ مسلمان اس ملک کے شہری ہونے کی وجہ سے باقی آبادی کے ساتھ مشترکہ سیاست اور معاشرت میں گھل مل کر رہنا چاہتے ہیں اور اس پر ان کا عمل بھی ہے اور ان کے لئے یہ بات ناگزیر بھی ہے تاہم جب تک کہ وہ مسلمان ہیں اور اسلام کی انفرادیت ایک مسلمہ حقیقت ہے وہ اپنی مذہبی روایات، مذہبی نظریات اور عقائد اور اپنی اسلامیت میں کسی کو دراندازہونے یا ان کی من مانی تشریح کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، مذہب کے دائرہ کی حد تک ان کا یہ مطالبہ صحیح ہے کہ انہیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اس مطالبہ کے ڈانڈے علیحدگی پسندی سے ہرگز نہ ملانے چاہئیں علیحدگی پسندی کا اطلاق مشترکہ مسائل میں ہوتا ہے یعنے ملک عام اور مشترکہ مسائل سے علیحدگی ہو جانا۔ اور ان میں حصہ لیکر اپنا واجبی رول ادا نہ کرنا علیحدگی پسندی کہلاتا ہے۔ مسجد میں عبادت کے لئے جانا اور مندر اور گوردوارے یا گرجا کی طرف رُخ نہ کرنا علیحدگی پسندی کے ذیل میں نہیں آتا لیکن جب آپ ان کے پرسنل لا کو ختم کرنا چاہیں گے یا قومی ادغام اور ہم آہنگی کے نام سے ان کی ثقافتی اور مذہبی زندگی پر حملہ آور ہوں گے تو یہ ان کی انفرادیت میں دخل اندازی ہوگی، اور اس کوشش کو ارتداد پسندی کا نام دیا جائے گا، فسطائی جماعتوں کی جارحیت تو یہی چاہتی ہے کہ مسلمانوں کے رہن سہن، ان کی تہذیب و معاشرت ان کی روایات، رسوم ورواج اور تاریخی خصوصیات میں اسلامیت اور عربیت کا کوئی نشان نظر نہ آسکے حتیٰ کہ عربی ناموں کا چلن بھی ختم کر دیا جائے، مگر یہ بات افغانستان، ایران، سویت، عراق، ملیشیا، انڈونیشیا وغیرہ ممالک سے دریافت کرنے کی ہے کہ وہاں کی ہندو آبادی سے مقامی مسلم جماعتوں کا مطالبہ کیا ہے؟ آیا اُن کے پرسنل لا کو اسلامی قانون یا سول کوڈ سے بدل دیا گیا یا وہ اپنے مذہبی اور ثقافتی معاملات میں آزاد ہیں؟ اور آیا وہاں بھی ہندو اور عیسائی اقلیت کے مقابلہ میں راشٹریہ سیوک سنگھ جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا کے وزن کی کوئی مسلم جماعت معرض وجود میں لائی گئی ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے قومی ادغام کے مسئلہ نے فسطائی جماعتوں کو مسلمانوں کے اقلیتی کردار پر حملہ کرنے کی شہ دی ہے، اور ان کی جارحیت کے ناخون تیز ہوئے ہیں۔ اندیشہ کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی ثقافتی انفرادیت کی طرف سے کوئی اطمینان کی صورت پیدا نہیں ہو سکی ہے، حکومت بھی پارلیمنٹ میں مسلم پرسنل لا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر کے مسلمانوں کو بے چین رکھنا چاہتی ہے۔ اور مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ خبر نہیں کب حکومت کی نیت میں فرق آجائے اور کب وہ مسلمانوں کی چادر سر سے اُتار لے۔

مسلمانوں کا معاشی مسئلہ

مسلمانوں کا تیسرا مسئلہ معاشی ہے، اس مسئلہ میں جو رکاوٹیں پیدا کی گئی ہیں ان کو اس مثال سے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان اس خیال سے کسی کاروبار میں روپیہ لگانا نہیں چاہتے کہ اگر فسادات کی آگ بھڑک گئی تو حسب معمول نہ ان کی جائداد کی خیر ہے اور نہ اثاثہ کی کیوں کہ فسادات کے نتائج میں ایک لازمی نتیجہ مسلمانوں کی جائداد کو آگ لگانا اور ان کے اثاثہ کو لوٹنا ہے۔ اگر مسلمان اس خوف سے کسی کاروبار میں حصہ نہیں لے سکتے تو اس سے ان کے لئے معاشی مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے، جب کہ ان پر روزگار کے دوسرے دروازے بھی تقریباً بند کر دیئے گئے ہیں، چنانچہ سرکاری ملازمتوں میں ان کا درجہ صفر ہے، پولیس اور فوج میں ان کا حصہ برائے نام ہے حتیٰ کہ سیاسی اداروں میں بھی ان کے داخلہ میں مشکلات پیدا کی جاتی ہیں، ان مسائل کا حل مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے کہ ہرچہ بادا باد کشتی در بلا اندرفتیم۔ خواہ کچھ ہو مسلمان زندگی کی کش مکش سے گریز نہیں کریں گے، اور زندگی کی تگ و دو میں پیچھے نہیں ہٹیں گے مگر اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ مسلمان اکثریت کے صالح عناصر کے تعاون سے بے نیاز نہ ہوں اور ملک کی قومی زندگی پر انھیں پورا بھروسہ ہو، یہ مسائل اگرچہ بظاہر مسلمانوں سے متعلق ہیں لیکن درحقیقت یہ قومی مسائل ہیں اور ناظرین کرام سے استدعا ہے کہ وہ اسی نقطۂ نظر کے ساتھ سطور بالا کا مطالعہ فرمائیں۔



تعلیم میں — زبان کا



ہندوستان میں زبان کا مسئلہ سیاسی اور علاقائی اعتبار سے ایسا الجھا ہوا ہے کہ اس پر نفسیاتی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے کبھی غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا اور ڈر ہے کہ اگر یہ پہلو عرصہ تک نظر انداز رہا — اور سیاسی اور علاقائی اعتبار سے اس کا کوئی حل نکل بھی آیا تو بچوں کی نفسیاتی نشوونما اور تعلیمی ترقی کا بہت بڑا نقصان ہوگا جس کی تلافی عرصہ تک نہ ہو سکے گی۔

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ بچہ زبان سیکھتا ہے۔ ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا نہیں ہوتا اور نہ اسے بنی بنائی کوئی زبان مل جاتی ہے۔ جسے وہ من و عن اختیار کر لیتا ہے۔ بچہ سب سے پہلے اپنے اظہار خیال اور جذبات کے لئے حرکات و سکنات استعمال کرتا ہے۔ پھر جب اس کی زبان، حلق اور تالو کے اعصاب ذرا مضبوط ہو جاتے ہیں تو وہ غوں غاں کرنے لگتا ہے۔ یہ اس کی زبان سیکھنے کی سب سے پہلی منزل ہوتی ہے۔ تھوڑے عرصہ بعد وہ ایک ہی آواز کو مکرر زبان سے نکالتا ہے جیسے مم جسے ہماری زبان اردو زبان میں پانی کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ پھر وہ ایک حرفِ صحیح کو کسی حرف میں دہرا کر نکالتا ہے۔ جیسے ممی۔ جو ماں کے لئے بولا جاتا ہے اور اس طرح بہت سے مشدد الفاظ اس کے ابتدائی ذخیرہ میں پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً اماں۔ ابا۔ اوا وغیرہ۔ اس تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بچہ کی زبان کا نشوونما ہوتا ہے، جس طرح اس کی اور صلاحیتیں نمو پذیر ہوتی ہیں۔

غرض اس طرح اس کے لفظوں کا ذخیرہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح اس میں اس کی تنہا اپنی کوششوں ہی کو دخل نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے رہنے والوں سے جو کچھ سنتا ہے، اس کی نقل اتارنے کی بھی کوشش کرتا ہے اور اس طرح اس کے الفاظ کا ذخیرہ نہایت تیزی سے بڑھنے لگتا ہے۔ لیکن جن بچوں کو دوسروں کی زبان سے الفاظ سننے کا موقع نہ مل سکا ہو، وہ صرف یہ کہ ان کے لفظوں کا ذخیرہ کم بلکہ وہ بالکل تہی مایہ اور گونگے بھی رہ جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو بچے پیدائشی طور سے بہرے پیدا ہوتے ہیں وہ عموماً گونگے بھی ہوتے ہیں

لیکن اگر صرف لفظوں کے ذخیرے کی کمی بیشی ہی کا سوال ہوتا تو اتنا بڑا نقصان نہ ہوتا۔ زبان کے استعمال کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے اس کا سب سے بڑا نقصان جو ہوتا ہے، وہ یہ کہ بچہ کی ساری ذہنی نشوونما رک جاتی ہے۔ یا دوسری زبان والوں کے مقابلہ میں سست پڑ جاتی ہے۔ معلوم نہیں آپ نے یہ قصہ سنا ہے یا نہیں کہ روم شہر کی جس شخص نے بنیاد ڈالی تھی اور جو بعد میں روم کا پہلا بادشاہ ہوا، اسے بچپن میں ایک بھیڑیا اٹھالے گیا تھا اور وہ ایک عرصہ تک اسی کے ماند میں رہا جب وہ لوٹ کر پھر کسی طرح انسانوں کی بستی میں آیا تو سب سے بڑی کمی اس میں جس چیز کی پائی گئی وہ یہ کہ اس کا ذہنی نشوونما اس معیار پر نہیں ہوا تھا،

جو ایک انسان کے بچہ کا اس عمر میں ہونا چاہئے تھا۔ اس کی بڑی وجہ نفسیات کے ماہرین یہی بتاتے ہیں کہ کسی ترقی یافتہ انسانی زبان کے سننے اور بولنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لئے اس کے ذہن کا پورا نشوونما نہیں ہو سکا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر غیر ترقی یافتہ قوموں اور پسماندہ جاتیوں کے بچوں کا ذہنی نشوونما اس معیار کا نہیں ہوتا ہے، جس معیار کا ہم ترقی یافتہ قوموں کے بچوں یا ترقی یافتہ زبانوں کے بچوں کا پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے زبان کا مسئلہ ایک بہت اہم مسئلہ بن جاتا ہے اور قومیت یا علاقائیت کے جوش میں جو لوگ ہر زبان کو بچہ کی تعلیمی زبان بنانا چاہتے ہیں یا دوسری کسی زبان کو جو ابتک ان کے یہاں ذریعہ تعلیم رہی ہے، اسے دور پھینکنا چاہتے ہیں وہ سب سے بڑا نقصان اپنا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کشمیر میں کشمیری

زبان کو لیجئے، یا ایک حد تک پنجاب میں پنجابی کو لیجئے۔ یہ زبانیں ابھی اس حد تک ترقی یافتہ نہیں ہوئی ہیں اور نہ ان میں ابھی بچوں کی تعلیم کیلئے اتنا اد پیدا ہوا ہے کہ انھیں آزادی کے ساتھ ذریعہ تعلیم بنایا جا سکے۔ ان زبانوں کو ــــــ اول الذکر کو اردو کا اور ثانی الذکر کو ہندی اور اردو دونوں کا سہارا لینا ہی پڑے گا۔ اگر یہ چاہتی ہیں کہ ان بچوں کی ذہنی نشوونما رُکے یا ان کی ... تعلیم ناقص نہ رہے۔ اس سے میری مراد ہرگز یہ نہ سمجھنی چاہئے کہ میں ان علاقائی زبانوں کی ترقی کا مخالف ہوں، بلکہ اس سے ان زبانوں کی ترقی اور ان کے مالامال کئے جانے کی اور تائید ہوتی ہے۔ ان زبانوں کے بولنے اور ان کے حامیوں کا بعرے اولین فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ان زبانوں کو بچوں کے لئے درسی کتابوں، تعلیمی ادب اور دوسرے ہر قسم کے لٹریچر سے مالا مال کریں تاکہ یہ زبانیں نہ صرف اپنے بولنے اور پڑھنے والے بچوں کی ذہنی نشوونما کا باعث ہوں، بلکہ ان کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بن سکیں۔

یہ تو اصل میں زبان نہیں بلکہ کل تک جو روزمرہ کا درجہ رکھتی تھیں، ان کا اور ان سے زیادہ ترقی یافتہ زبانوں سے تصادم کا مسئلہ تھا۔ لیکن جہاں کسی ترقی یافتہ علاقائی زبان اور ہندی کے تصادم کا مسئلہ ہو، وہاں بھی نفسیات اور تعلیم کا یہی تقاضہ ہے کہ علاقائی زبان کو نہ صرف ترجیح بلکہ قومی اور ملکی زبان کے ہوتے ہوئے بھی، اسی علاقائی زبان کو بچے کی تعلیم کا ذریعہ بنانا چاہئے اور ملکی و قومی زبان کو اس کے مقابل میں ثانوی درجہ دینا چاہئے۔ اس میں وطنیت یا قومیت کی کوئی توہین نہیں بلکہ ہمارا ملک جو مختلف ملتوں، تہذیبوں اور ثقافتی وحدتوں کا مجموعہ ہے، اس کا حق یہ ہے کہ ان وحدتوں کے ثقافتی ورثے کو جس میں زبان بدرجہ اعلیٰ آتی ہے، نہ صرف محفوظ رکھا جائے بلکہ اس کی ترقی اور نشوونما کے لئے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا جائے۔ اب اگر تعلیم کے انتظامی نقطۂ نظر سے کوئی پوچھے تو اس کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم تو اس کی مادری یا علاقائی زبان ہی میں شروع ہونی چاہئے۔ اور تیسری یا چوتھی جماعت سے، جس میں سہولت ہو، ملکی یا قومی زبان یعنی ہندی کو بطور ایک ثانوی زبان کے شامل کیا جا سکتا ہے۔

اس میں نہ کوئی تعلیمی دشواری ہی ہے اور نہ قومیت و وطنیت کے حق سے انکار، بلکہ ایک وفاقی طرزِ حکومت کے ملک میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

اسی طرح انگریزی زبان کا مسئلہ ہمارے ملک میں آتا ہے۔ اسے انگریزی حکومت کے چلے جانے یا رہنے سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت اس کی اپنی افادیت کی بنیاد پر ہے۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں بیرونی ممالک سے تعلقات رکھنے کے لئے کسی ایک غیر ملکی زبان کا جاننا ملکیوں کے لئے بہت ضروری ہے اور اس کی تعلیم ایک منزل پر آ کر ہمارے نصاب تعلیم کا ایک لازمی جزو ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بہ حالات موجودہ انگریزی کے سوا اور کوئی زبان نہیں جو اس ضرورت کو پورا کر سکے اور اس سے زیادہ اس حق کا دعویٰ کر سکے۔ چنانچہ علاقائی اور ملکی زبان یعنی ہندی کے علاوہ

اگر کوئی تیسری زبان نصاب میں شامل کی جا سکتی ہے۔ تو وہ ثانوی منزل سے کی جا سکتی ہے۔ اس سے پہلے ابتدائی منزل میں دو سے زیادہ تین زبانوں کا استعمال نہ صرف بچہ کے ذہنی نشوونما پر غیر ضروری بار بلکہ تعلیمی معیار کے گرنے کا بھی موجب ہیں۔ اور اگر انگریزی کی تعلیم صحیح طریقہ اور مناسب درسی کتابوں کے ذریعہ ہو تو اس سے پہلے اس سے کے شروع کرنے کی ضرورت بھی نہیں اور نہ ثانوی منزل سے شروع کرنے میں اس کے ضروری معیار کے کم ہونے کا کوئی اندیشہ ہے۔ دنیا کے اور ترقی یافتہ ملکوں میں جہاں کوئی غیر ملکی زبان داخل نصاب کی گئی ہے، وہاں ثانوی منزل سے پہلے شاید ہی کہیں کی گئی ہو۔ حکومت ہند کا "سہ لسانی فارمولا" جو کہلاتا ہے، وہ خواہ اپنی سیاسی تقاضوں اور مصلحتوں کی بناء پر کیوں نہ مرتب کیا گیا ہو، لیکن اس میں بھی نفسیاتی اور تعلیمی اصول کار فرما ہیں جن کا اوپر کی سطروں میں ذکر ہوا ہے

اب علاقائی زبانوں اور انگریزی کا مسئلہ اعلیٰ تعلیم میں ایک ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے رہ جاتا ہے۔ جو اصول ہم نے ابتدائی منزل میں ایک روزمرہ اور ترقی یافتہ زبان کا پیش نظر رکھا ہے۔ وہی بعینہ یہاں اعلیٰ تعلیم میں بھی صادق آتا ہے۔ اولاً تو اعلیٰ تعلیم کے لئے علاقائی زبانوں ہی کو اس علاقہ کی تعلیم کا ذریعہ ہونا چاہئے مثلاً ہندی بولنے والے علاقوں میں ہندی، گجرات میں گجراتی، مہاراشٹر میں مراٹھی و قس علیٰ ہذا۔ لیکن اگر ان کی زبان میں ابھی علوم و فنون کا ذخیرہ نہیں ہے تو وہ انگریزی کو بطور ایک ذریعہ تعلیم کے اس وقت تک کے لئے استعمال کر سکتے ہیں، جب تک ان زبانوں کی یہ کمی پوری نہ ہو جائے۔ اور اگر وہ اپنی غلط زبان پرستی کے جذبہ میں اگر اپنی علاقائی زبان ہی کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانا چاہیں، تو وہ اپنا نقصان کرائیں گے، کسی دوسرے کا نہیں۔ ان علاقوں میں یہ مسئلہ ایک عبوری دور کا مسئلہ کہا جا سکتا ہے، یعنی جب تک کہ وہ زبانیں ضروری سرمایہ ادب سے بھرپور نہ ہو جائیں، اس وقت تک انگریزی کو اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ کے طور پر قائم رکھا جا سکتا ہے۔

جن علاقائی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم کا سرمایہ ادب کافی نہیں ہے۔ یا وہ زبانیں ابھی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ پورے طور پر بننے کے قابل نہیں ہیں۔ وہاں بیادہ کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ اس عبوری دور سے گذرنے کے لئے اس کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں، مثلاً معاشری علوم میں علاقائی زبانوں کے ذریعہ آسانی سے تعلیم شروع کی جا سکتی ہے۔ البتہ سائنس علوم میں انگریزی کا سہارا اس وقت تک لیا جا سکتا ہے جب تک ان زبانوں میں سائنس کی مصطلحات نہ آ جائیں یا کافی کتابیں ترجمہ ہو کر یا از سر نو لکھ کر اس کمی کو پورا کر سکیں۔ پھر ذریعہ تعلیم کے سلسلہ میں یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان علاقائی زبانوں کو طلبا کے لئے امتحان کا ذریعہ تو بنا ہی دیا جائے تاکہ وہ اپنے مافی الضمیر کو اپنی زبانوں کے ذریعہ پورے طور پر ادا کر سکیں، خواہ ان میں تعلیم دینے کا ذریعہ انگریزی ہی کیوں نہ رہے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان طلبا کی تعلیم تو خواہ علاقائی زبان ہی کے ذریعہ ہو، لیکن انگریزی کتابیں زیر مطالعہ قائم رکھی جائیں تاکہ ان کے تعلیم کے مواد میں کمی نہ آنے پائے۔ غرض اس کی مختلف حالات میں مختلف شکلیں

جا سکتی ہیں، لیکن کسی غیر ملکی زبان کو مستقل طور پر یا لامحدود مدت تک ذریعہ تعلیم بنائے رکھنے کا کوئی معقول جواز نہیں ہے۔

اب ایک مسئلہ کلاسیکی زبانوں کا رہ جاتا ہے جو ہندوستان میں سنسکرت یا عربی و فارسی کی شکل میں ہیں۔ کلاسیکی زبانوں کی تعلیم اصل میں اعلیٰ تعلیم کا جزو بن سکتی ہے۔ یا اس سے نیچے کی منزل میں انہیں بہ طور ایک اختیاری مضمون کے رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن ثانوی تعلیم میں ان میں سے کسی ایک زبان کو بطور لازم مضمون کے قرار دیا گیا تو اس علاقے کی مادری اور علاقائی زبان پر ظلم ہوگا۔ یا پھر اس اضافہ سے بچوں کی عام تعلیم کا معیار بہت پست ہو جائے گا۔ دہلی کے ہائی اسکولوں میں سنسکرت کی لازمی تعلیم نہ صرف طلباء کی عام تعلیم پر بہت بڑا ظلم ہے، بلکہ اس کے لئے کوئی قانونی جواز یا سرکاری حکم بھی شاید ہی مل سکے۔

اسی سلسلہ میں ایک مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ جن علاقوں میں علاقائی زبان اور ملکی یا قومی زبان دونوں ایک ہی ہوں، ان علاقوں میں تیسری کون سی زبان اختیار کی جائے مثلاً اترپردیش، بہار، دہلی اور راجستھان۔ ان علاقوں کی کوئی علاقائی زبان نہیں ہے بلکہ ہندی دونوں کا درجہ رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں حق اور انصاف کے علاوہ تعلیم اور تہذیب کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ ان علاقوں میں اردو کو ایک ثانوی زبان کا درجہ دینا چاہیے۔ اور اردو کو بطور ایک ثانوی زبان کے دوسری یا تیسری جماعت سے لگانا چاہیئے۔ ابھی کل تک ان علاقوں میں اردو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی، بلکہ بڑی حد تک ذریعہ تعلیم بھی تھی، آج اگر سیاست اور حکومت کا فیصلہ یہ ہے کہ ہندی ان علاقوں کی اصل زبان قرار دی جائے تو کم سے کم عام طور پر اردو جو ان علاقوں کی اصل زبان قرار دی جائے تو کم سے کم عام طور پر اردو ان علاقوں میں اب بھی عربی بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جس میں بہت سا کاروبار اب بھی اسی زبان میں ہوتا ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اردو کو ان علاقوں میں ثانوی زبان کا درجہ دیا جائے۔ اور نہ صرف ابتدائی منزل میں بلکہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں اس کے ادب اور تاریخ و تنقید کے مطالعہ کا انتظام اور یونیورسٹی میں ریسرچ اور اعلیٰ تعلیم کے شعبے کھولے جائیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان کے مستقبل کا مورخ کبھی اس ظلم اور نا انصافی کو نہیں بھولے گا جو اردو کے ساتھ اس وقت روا رکھی گئی ہے اور اس ظلم اور نا انصافی کی بدولت بچوں کی نسل کی کا جو ذہنی نشو و نما کا ہوگا اور ان کا تعلیمی معیار پست رہا ہوگا، اگر کی پیمائش کا پیمانہ ایجاد ہو سکے تو پھر اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

بقیہ عورت شریکِ حیات یا محض شریکِ بزم

اور عورتوں کے اختلاط کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتی۔ جلسوں میں بھی شریک ہوتی ہے، تو مردوں سے الگ تھلگ بیٹھتی ہے۔

اس لئے پردہ سسٹم کوئی لعنت نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کا اور ہندوستانی عورت کا ایک مزاج ہے، اور ہندوستان ترقی کی آخری منزلیں بھی طے کرلے تو حیاداری کے مزاج کو اسے قائم رکھنا چاہیئے۔

مسلم خواتین کا پردہ، کوئی پریشان کن مسئلہ نہیں ہے۔ غیر مسلم عورتیں بھی عموماً چادر اوڑھتی ہیں اور جن اعضا کی نمائش نامناسب ہو، اسے چادر، گھونگھٹ اور آنچل سے چھپاتی ہیں۔ یہ ہندوستانی عورت کا ایک مزاج ہے، اور مسلم خواتین کا برقعہ ہو، یا غیر مسلم خواتین کی حیاداری یا گھونگھٹ ہو، اسے محض "فارم" کا فرق سمجھنا چاہیئے، ورنہ بنیادی بات یہ ہے کہ حیاداری ہندوستانی سماج میں مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ضروری ہے۔ نئی روشنی کے اس دور میں مسلم خواتین برقعہ اوڑھ کر بہت سی برائیوں سے سماج کو محفوظ رکھتی ہیں جو تباہ کن اور غارت گر اخلاق و ایمان ہیں۔

صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ برقعہ ترک کر دو یا پردہ تک ترک کردو، بلکہ یہ سوچنا ضروری ہے کہ ہندوستانی سماج کی گھٹی میں جو حیاداری پڑی ہے، اسے کیونکر باقی رکھا جائے۔ حیاداری قائم رکھنے کی ایک شکل برقعہ پوشی ہے، اگر برقعہ پوشی بری ہے تو حیاداری کو قائم رکھنے کے لئے بدل یا نعم البدل کیا ہے۔

کناٹ پلیس میں جو بے تمیزی کی گئی وہ ایک "کلائمکس" ہے۔ آزادی اور روشن خیالی کے معنی یہ سمجھ لئے گئے ہیں کہ "ٹیڈی ازم" گوارہ کی جا سکتی ہے، لڑکیوں اور لڑکوں میں آزادانہ اختلاط روا ہے اور حیاداری ایک دقیانوسی بات ہے۔

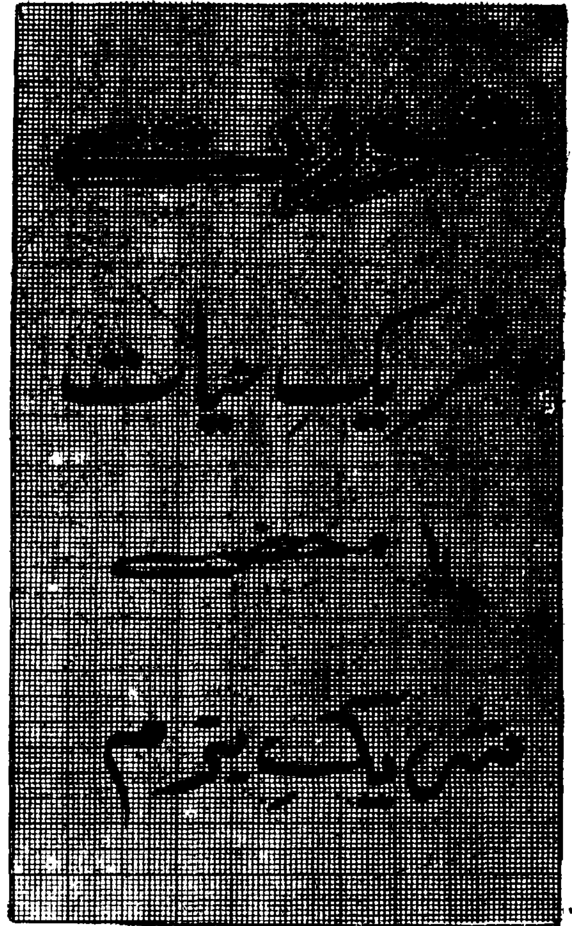
تاریخ کا ہم بہت نام لیتے ہیں، ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ماضی کی روایتوں کا ہمیں امین ہونا چاہیئے، لیکن ہم یہ نہیں سوچتے کہ کیا ماضی نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ شارع عام پر خرمستیاں کی جائیں اور عورتوں اور مردوں کے بے تکلف اختلاط کو آزادی، نیا ہندوستان اور نیا انقلاب سمجھ لیا جائے۔

ہندوستان میں کبھی بدنام کوچے آباد کئے گئے۔ یہ بہت برا کیا گیا، مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا، لیکن اس کا ایک فائدہ تو یقیناً تھا کہ بداخلاقی بدنام کوچوں میں محدود ہو جاتی تھی، اور باقی سماج بہت سی برائیوں سے محفوظ ہو جاتا تھا۔ بدنام کوچوں سے آبادی کا شاید دو فی صدی حصہ بھی دلچسپی نہیں لیتا تھا، لیکن آج حال یہ ہے کہ شہروں کی سڑکیں، گلیاں آبادی کے نوے فی صدی حصے کے لئے بدنام کوچوں کا منظر پیش کرتی ہیں۔

بات یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کی اخلاقی رہنمائی نہ ابھر سکی۔ سیکولرازم کا بجا طور پر ہم نام لیتے ہیں، لیکن اس کا اخلاقی پہلو دبا ہی رہا۔ سیکولرازم کو ہماری نئی نسل یا تو سمجھتی نہیں، یا اُسے بے راہ روی کا ایک لائسنس سمجھتی ہے۔

ہندوستانی عورت دراصل شریکِ حیات، محض شریکِ بزم نہیں۔ وہ سماج کو صرف نشہ نہیں پلاتی، بلکہ شرافت اور کردار بخشتی ہے۔





آزادی کے بعد ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں بحران سا ہے، اور کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ سوشلسٹ نظام کا اگرچہ ہم نام لیتے ہیں لیکن اس کی حدود اربعہ ہمیں معلوم نہیں ہیں۔ بہرحال اتنی بات صاف ہے کہ سوسائٹی اور سماج میں عورت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، لیکن ہندوستانی سماج اب تک سمجھ نہیں آسکا کہ سماج میں عورت کا رول کیا ہے۔ عورت کا ایک رول تو یہ سمجھا گیا کہ سال نو کی مستی میں کناٹ پلیس (نئی دلی) میں بے لگام ہو گئیں؛ لڑکیوں اور عورتوں سے بے تمیزی کی گئی، اور جب پورا تماشہ ختم ہو چکا تو رائے زنی کی جا رہی ہے کہ پولس نے غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ حالانکہ کناٹ پلیس میں بے تمیزی کا جو طوفان آیا، وہ ہندوستان کی سماجی زندگی کا ایک مستقل مرض ہے، جس کا علاج فقط یوں نہیں ہو سکتا کہ علاقہ کے پولس سپرنٹنڈنٹ کا تبادلہ کر دیا جائے یا اکسائز انسپکٹر کی تنبیہہ کر دی جائے۔ کناٹ پلیس میں جو کچھ ہوا، وہ لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ تو یقیناً ہے، لیکن اس سے زیادہ اول درجہ کا سماجی مسئلہ ہندوستان میں اونچ نیچ کی تمیز صدیوں سے ہے۔ ان تعریفوں یا تعزیروں کی نشانہ عورتیں بھی بنی ہوئی ہے تو کوئی عجیب بات نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ ہندوستان نے سیتا جی، درو پدی، رضیہ سلطانہ، نور جہاں، تاج محل، چاند بی بی کو بھی جنم دیا؛ ویسے بھی ہم جانتے ہیں کہ عورت سے اگرچہ کھیلنے کی کوشش کی گئی، لیکن عورت کی اہمیت ہندوستان میں ہمیشہ تسلیم کی گئی۔ تاریخ کا ایک ابتدائی دور ایسا بھی تھا کہ معاشرہ "مادرانہ" تھا، یعنی ماں کی حیثیت سے معاشرہ عورت کا اقتدار تسلیم کرتا تھا، اور آزادی کے بعد ایک دور ایسا بھی آیا کہ شریمتی وجے لکشمی انجمن اقوام متحدہ کی صدر منتخب ہوئیں اور آج مسز اندرا گاندھی وزیر اعظم ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں، سوامی ویویکانند، راجہ رام موہن رائے، ٹیگور کی تحریکوں نے عورتوں میں نئی بیداری پیدا کی، "تہذیب نسواں" لاہور سے جاری کیا گیا جس نے تعلیم نسواں پر زور دیا۔ ان تحریکوں اور انگریزوں کی جدت پسندی نے عورتوں میں بیداری پیدا کی، گورو بابا نانک کو عورتوں کی آزادی یا پابندی پر زور دینے کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں ہوئی کہ اول تو پنجاب کی دیہی آبادی پردہ کی پابند نہ تھی؛ دوسرے پنجاب کا سوشل سسٹم پابند ہونے کے بجائے بڑی حد تک آزاد تھا۔

ان اصلاحی اور سماجی تحریکوں کا مجموعی طور پر اثر یہ ہوا کہ ترقی نسواں اور تعلیم نسواں قومی زندگی کی اساس بن گئی۔ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ عریانی آئی، کلبوں کی زندگی نے بے لگام ہونا سکھایا۔ اس لئے انیسویں صدی میں جو اصلاحی اور سماجی تحریکیں شروع ہوئیں ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انگریزوں اور انگریزی تعلیم کی وجہ سے جو بے راہ روی پیدا ہو رہی ہے، اس کی روک تھام کی جائے۔

بہت بڑا کام گاندھی جی نے کیا۔ تحریک ترک موالات نے عورتوں کو صرف یہ سبق نہیں دیا کہ غلامی کے خلاف پُر امن جنگ کرو بلکہ یہ سبق بھی دیا کہ قومی تحریک میں منظر عام پر آنے کے باوجود عورتوں کو سادہ زندگی بسر کرنا چاہیئے، اور فیشن کا غلام نہ بننا چاہیئے۔

پردہ سسٹم

پردے کا رواج ہندی مسلمانوں میں عام ہے، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے کہ غیر مسلم خواتین پردہ بالکل نہیں کرتیں۔ مسلمانوں کے ضمن میں پردہ سسٹم بہت زیادہ اس لئے محسوس کیا جاتا ہے کہ وہ برقعے پہنتی ہیں اور اپنے آپ کو گھروں تک محدود رکھتی ہیں، لیکن ہندوستانی عورت کا عام طور پر مزاج یہ ہے کہ وہ حیادار رہے، برقعہ نہیں اوڑھتی تو گھونگھٹ کاڑھتی ہے، مردوں

عطا کاکوی

نہ بدلا کچھ نہ بدلے گا ترا نظمِ کہن ساقی
بناتے ہیں الگ ہم آج اپنی انجمن ساقی

نئے انداز سے ہو ضو فگن رنگِ چمن ساقی
نئے پھولوں سے گر ہو زینتِ شاخِ کہن ساقی

بھرے ہیں میکدے میں تیرے اپنے بھی پرائے بھی
نہ جانے کس کی جانب ہو ترا روئے سخن ساقی

بُھلا بیٹھے سب اپنا شیوۂ اندازِ مستی میں
بدلنا ہے مجھے پھر سے مذاقِ انجمن ساقی

ترے رندانِ دُردِ آشام جائیں تو کہاں جائیں
کھڑے ہیں میکدے میں آکے شیخ و برہمن ساقی

کریں کیا اب تو لے دے کر قفس ہی آشیانہ ہے
خوشی اُس کو بہار آنے کی جس کا ہو چمن ساقی

ذرا ابرو پہ بل آنے تو دے خود دار رندوں کے
سنور جائے گی خود ہی تیری زلفِ پُر شکن ساقی

پھرا لی ہیں نگاہیں گرچہ تو نے اپنی جانب سے
عطا کا ہے ابھی تک تجھ سے قائم حسنِ ظن باقی

کامل نظامی

میرے وطن

تری جانب ہے وا روئے سخن میرے وطن
کیوں یہ مسموم ہوائیں ہیں یہ بے رنگ چمن
تیرے گلشن کی بہاریں طرب انگیز نہیں
کوئی غنچہ بھی سرِ شاخ دلآویز نہیں
کیا ہوئی اب وہ چراغِ گل و لالہ کی ضیا
چھا گیا صحنِ چمن میں یہ اندھیرا کیسا . . .
نکہتِ گل کدۂ ہند گریزاں کیوں ہے
آج ہر ساکنِ گلزار پریشاں کیوں ہے
'آہ' اس دور میں یہ حالتِ ابنائے وطن
جس کو دیکھو نظر آتا ہے گرفتارِ محن
ہر طرف ظلم و فسادات کی دارائی ہے
یہ غنیمت ہے کہ یارائے شکیبائی ہے
کثرتِ خار بھی پھولوں کی نگہباں نہ ہوئی
ضامنِ حسنِ بہارِ چمنستاں نہ ہوئی
سالِ نو کی یہ طرب ناک فضائیں بے سُو

ہر طرف راہِ ترقی ہے وطن میں مسدود
کس کو سمجھیں کہ ستمگار و ستم کوش نہیں
کون ہے وہ جو یہاں وعدہ فراموش نہیں

دورِ مغلیہ کی ایک شاعرہ — رزمی

اٹھارھویں صدی میں ایک شاعرہ پیدا ہوئیں، جن کا نام تھا عارف جہاں بیگم اور تخلص تھا رزمی۔ شہنشاہ فرخ سیر کا دور تھا اور حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے زہد و تقویٰ اور کرامات کا چرچا تھا۔

رزمی کے استاد کا پتہ نہیں چلتا۔ تاریخ فرخ سیر کے مصنف وکاء اللہ کا بیان ہے کہ وہ اس وقت کے ایک بزرگ کامل، محمد صادق عرف قلندر کی ارادت مند تھیں اور روحانی فیض نے انھیں شاعرہ بنا دیا۔ تخلص بھی ان کے مرشد کا عطیہ ہے۔ رزمی نے اپنا تخلص بزمی کرنا چاہا تھا۔ مگر مرشد نے کہا کہ رزمی ٹھیک ہے۔ اس لئے کہ زمانہ بزم آرائی کا نہیں رزم آرائی کا ہے۔ تخلص نے رزمی کے کلام کا رنگ ہی بدل دیا۔ ان کے کلام کے نمونے بہت کم ملتے ہیں، لیکن جو ملتے ہیں، ان سے شدت احساس، جنگ پسندی، معرکہ پسندی، اور مہم جوئی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے کلام کے صرف چند نمونے استاد سائل دہلوی کی بیاض میں ملتے ہیں، جو کسی طرح کسی زمانے میں نذیریہ لائبریری دلّی تک پہنچ گئی تھی، اور اب غالباً ضائع ہو چکی ہے۔

رزمی سن بلوغ کو پہنچنے کے بعد بھی ایک زمانہ تک کنواری رہیں۔ مرشد کی ہدایت پر انہوں نے محمد زماں خاں سے نکاح کیا۔ جو شاہی فوج میں ایک ممتاز افسر تھے۔ ہو سکتا ہے ان کا تخلص بھی ایک فوجی افسر سے نکاح کرنے کا نتیجہ ہو۔

رزمی کے کلام میں اہمام بھی ہیں، اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ شاعری میں غالباً ان کا کوئی استاد نہیں ہے۔ لیکن ان کے تخیل اور کلام میں بلا کا زور ہے اور یہی ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ اردو شاعری میں عوام، اور غربا کا تصور اتنا نمایاں نہیں ہے، جتنا رزمی کے کلام میں ہے۔ فرماتی ہیں۔

کچھ شفق میں کچھ فلک میں کچھ حنا کے رنگ میں
سرخیاں خون غریباں کی چھلک کر رہ گئیں
مانگ اجڑی، گھر بھی اجڑے لٹ گئیں آبادیاں
جو بھری تھیں گودیاں بچوں سے ویراں ہو گئیں

اٹھارھویں صدی کا زمانہ پیش نظر ہو تو حیرت ہوگی کہ زبان اتنی چست اور صاف کیوں ہے۔

رزمی نے جنگ پر یوں کلام کیا ہے۔

جنگ میں عورت سپاہی ہو تو کیسی بات ہو
شاد ہو وے جی مرا اور کام ہو
رزمی سے تلوار اپنے ہاتھ میں
یوں مری دنیا کا بھی انجام ہو

ہم عرب کا نام لیتے ہیں مگر
نام کو مرنے سے کیا آرام ہو

فرماتی ہیں:۔

دنیا میری دین کو مانگے ہے یاں
دین دنیا میں ہے کیا دیوار یاں
بے عمل کے واسطے اک حوصلہ
تیری ہستی ایک دھوکا ہے یاں

ماحول پر شاید طنز فرمایا ہے۔ کہتی ہیں:۔

مہ وشوں کے حضور میں کیوں ہو
رنگ میں سرور میں کیوں ہو
خانہ برباد کیوں عشق میں اپنے
اپنے ایماں کو بیچتے کیوں ہو

عورت تھیں، اس لئے اپنی مجبوریوں پر کچھ کہا ہے:

چوڑیاں ہاتھ میں ہیں سیف نہیں
گھر کی قیدیں ہیں، دل میں حیف نہیں
میں ہوں مجبور اس زمانہ میں
ورنہ کیا بات ہے کہ کیف نہیں

رزمی پردہ دار خاتون تھیں، پردے پر فرماتی ہیں:۔

پردہ ہے میرے ناموس کا پردہ
یہ نہیں دین سے پردہ
پردہ میرا اٹھائے ہمت کو
بات ایسی کہو نہ بے پردہ
راز مولا کا ہے پردہ
ورنہ ہو کیا بجز ایک پردہ

سعی و عمل پر گہرے اشارے کئے ہیں۔

رزم ہو بزم ہو کہ خوابگاہ امیر
کائنات میں ہے ہر قدم اپنا
کام ہوتا نہیں ہے بے تدبیر
اک سعی ہے کہ خود ہی ہے تقدیر

بڑے سے بڑا دانشور جدوجہد حیات پر یہی کہہ سکتا تھا جو رزمی نے اب سے کم و بیش دو سو برس پہلے کہا۔



ویت نام میں دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی سامراج کا دوبارہ عمل دخل کر دیا تھا۔ جاپانی سامراج کو شکست دینے کے بعد ویت نامیوں کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ اسی طرح صدر ہوچی منہ کی رہنمائی میں فرانسیسیوں کو آخری اور شرمناک شکست ہوئی اور اُن کو ویت نام چھوڑ دینا پڑا۔ ۱۹۵۴ء میں ویت نام کے بارے میں جنیوا میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اسی کانفرنس کے فیصلوں کے مطابق ویت نام شمالی اور جنوبی دونوں حصوں میں بانٹ دیا گیا۔

شمال میں ہوچی منہ کی قیادت میں ڈیموکریٹک ریپبلک آف ویت نام کی آزاد ریاست قائم ہوگئی۔ جنوب میں الگ حکومت قائم ہوئی۔ جنیوا کانفرنس نے طے کیا تھا کہ ایک آزاد انتخاب ایک سال بعد ہونا چاہیئے جس میں جنوبی ویت نام کے عوام اپنی مرضی کے مطابق حکومت اور اپنے مستقبل کو طے کرینگے۔ لیکن فرانسیسیوں کے جانے کے بعد ہی امریکی فوج



اُڑان کے بعد روسی پائلٹ ویت نامی پائلٹ سے محوِ گفتگو ہیں۔ ویتنامی پائلٹ روس کا تربیت یافتہ ہے

جنوبی ویت نام میں داخل ہونے لگی۔ اس کے بعد جنیوا کانفرنس کے کسی فیصلے پر عمل درآمد نہ ہوا بلکہ الٹی خلاف ورزیاں ہوتی رہیں۔

اصل میں امریکہ کی جنوبی ویت نام کی بیش قیمت معدنیات پر نظر تھی۔ خود اس زمانہ کے صدر امریکہ مسٹر آئزن ہاور کے قول کے مطابق ویت نام کی چھپی ہوئی دولت حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے خطرے بھی مول لینا جائز ہے۔ جنوبی ویتنام کے حریت پسند کسی بھی غیر ملکی اثر اور اقتدار کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ امریکی افواج کی تعداد بڑھتی ہی چلی گئی۔ اُدھر قومی آزادی کا محاذ قائم کیا گیا۔ اسی طرح امریکی سامراج اور جنوبی ویت نام کے حریت پسندوں کے درمیان ایک عظیم جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔

ویت نام کے بہادر عوام پچھلے سات برسوں سے امریکہ جیسی زبردست قوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ چھوٹا سا بہادر ملک ہر قسم کے ظلم و ستم اور بربریت کا نہ صرف جیداری سے مقابلہ کر رہا ہے بلکہ پوری دنیا پر ثابت کر رہا ہے کہ آزادی کے ان متوالوں کو بڑی سے بڑی قوت بھی نہیں دبا سکتی کہاں امریکی سامراج کی قوت اور کہاں پس ماندہ چھوٹا سا ویت نام لیکن پچھلے سات برسوں میں ویت نامیوں نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں۔ انہوں نے پوری دنیا میں امن پسندوں اور انصاف پسندوں کی ہمدردیاں حاصل کر لی ہیں۔ اسی نسبت سے امریکہ دنیا میں بے یار و مددگار ہوتا چلا جا رہا ہے اور خود امریکہ والوں میں ویت نام کی غیر منصفانہ اور ناجائز جنگ کے خلاف غم و غصہ روز بروز بڑھتا اور پھیلتا چلا جا رہا ہے صورت حال یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ویت نامی مسئلہ ہمارے دور میں عالمی پالیسی کا ایک بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔

امریکہ کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ شمالی ویت نام پر بے تحاشہ بمباری کی جائے تو ویت نامیوں کو گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کر دیا

جائیگا۔ امریکہ نے اس طریقۂ کار کا اپنی بھرپور قوت اور بربریت سے استعمال کیا۔ شمالی ویت نام کے چپہ چپہ پر ہزاروں ٹن خطرناک ترین بم گرائے۔ ان کا خیال ہے کہ "بمباری، بم اور بم اور بار بار بمباری اور بم" سے ویت نام کی جنگ جیت لیں گے لیکن یہ طریق کار بری طرح ناکام رہا ہے۔ امریکہ کے فوجی کمانڈروں نے دعویٰ کیا تھا کہ "ہم بموں کی مدد سے شمالی ویتنام کو پتھروں کے دور میں پہنچا دیں گے۔ یعنی موجودہ تہذیب و تمدن کا کوئی نام و نشان باقی نہیں چھوڑا جائیگا۔ بیشک شمالی ویت نام کے لئے جتنے بم استعمال کئے جا چکے ہیں وہ پوری دوسری جنگ عظیم کے دوران بمباری سے کہیں زیادہ ہیں جنہوں نے تباہی و بربادی اور ہلاکت کا بھی ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بہادر ویت نامیوں سے یہاں بھی امریکہ کو شرمناک شکست دی ہے۔

بے شک ویت نام کے عوام کی بہادری اور حریت پسندی کے ساتھ ساتھ وہ امداد بھی شامل ہے۔ جو اُسے دوسرے ممالک سے ملی ہے۔ کمیونسٹ ممالک اور سوویت روس نے دل کھول کر اقتصادی اور فوجی امداد دی ہے۔ پوری دنیا کے عوام نے کسی نہ کسی شکل میں ویت نامیوں کو مدد اور اخلاقی حمایت دی ہے۔ اس امداد میں ہندوستان کے عوام بھی شامل ہیں اور امریکہ کے عوام بھی۔ سوویت روس نے جدید ترین اقتصادی امداد، کارخانے کلمیں اور جدید ترین اسلحہ و بارود دیئے ہیں۔ اور مسلسل یہ امداد پہنچا رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ویت نامیوں کو زندگی و موت کی اس سخت جدوجہد میں جو امداد دینگے وہ اُس کے لئے بے حد شکر گذار ہونگے۔ اتنا ہی نہیں اس سے سچی دوستی اور برادری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں ہے کہ امریکہ کے ہزاروں طیارے مار گرائے اور اُن کے لاکھوں فوجیوں کو ہلاک اور زخمی کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ روسی امداد کا ہے۔ جن میں جدید ترین مزائل اور ہوائی جہاز اور دوسرے



ایسی بہت سی ایمبولینس گاڑیاں روس نے ـــــ ویت نام کو بطور امداد دی ہیں

اسلحہ شامل ہیں۔ اس سلسلے میں دونوں ملکوں میں نئے معاہدے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں امریکہ کے عوام نے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ویت نام کی ظالمانہ جنگ کو ختم کرنے کے لئے جو زبردست آواز بلند کی ہے وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

ڈیموکریٹک ریپبلک ویت نام (شمالی ویت نام) اور جنوبی ویت نام میں امریکیوں اور اُن کے حواریوں کو پے درپے شکستیں ہو رہی ہیں۔ ان شکستوں کا صحیح اندازہ مندرجہ ذیل اعداد وشمار سے ہوتا ہے۔

جنوبی ویت نام میں۔

عوامی آزاد فوج (ویت کانگ) نے دشمن کے ۱۵ لاکھ فوجی ہلاک کئے جن میں ۳ لاکھ امریکی اور اُس کے حواری ملکوں کے فوجی شامل ہیں۔

۸۵۹۰ دشمن کے طیارے مار گرائے یا زمین پر تباہ کر دیئے۔

۱۵۸۳۵ فوجی گاڑیاں تباہ کیں۔

۲۶۳ کشتیاں اور موٹر لانچ ڈبوئے۔

۲۷۰۴ چھوٹے بڑے مضبوط اڈّے اور چوکیاں نیست و نابود کر دیں۔

۱۲ دسمبر ۱۹۶۷ء تک پچھلے دو سالوں میں جبکہ عوامی آزاد فوج (ویت کانگ) اور امریکی حملہ آوروں سے بہت سے مقابلے ہوئے۔

تقریباً ۸ لاکھ دشمن کے فوجیوں کو ہلاک کیا جن میں ۳ لاکھ امریکی اور اُس کے حواری ممالک کے فوجی شامل ہیں۔

۵۲۳۰ طیارے مار گرائے یا زمین پر برباد کر دیئے۔

۱۱ ہزار فوجی گاڑیاں برباد کر دیں۔

۹۷ کشتیاں اور موٹر لانچ ڈبوئے۔

شمالی ویت نام میں۔

۲۷۰۶ طیارے ۵ جنوری کی صبح تک مار گرائے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ جنوبی ویت نام میں ۶ لاکھ کے



امریکہ کی ہوائی فوج کے کیپٹن برگ جنہیں ویتنام کی جنگ میں زندہ گرفتار کیا گیا

قریب امریکی فوج کے باوجود عوامی آزاد فوج (ویت کانگ) کے حملے شدت اختیار کرتے جا رہے ہیں اور وہ جدید ترین ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ نہ صرف جدید ترین ہتھیار حاصل کر رہے ہیں بلکہ اُن کے صحیح استعمال کی تربیت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ یہ تربیت بھی ویتنامیوں کو روسیوں نے ہی دی ہے۔ شمالی ویت نام میں جدید ترین قسم کے ہوائی جہازوں کو چلانے اور میزائل اور راکٹ چلانے کی تربیت بھی اُن کو زیادہ تر روس میں حاصل ہوئی ہے۔ جنوبی ویت نام کے سب ہی عوام بوڑھے، جوان اور بچے، مرد اور عورت اسی جنگ آزادی میں شریک ہیں۔ امریکیوں کی شکست کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ اُن کو پوری ویت نام قوم کے خلاف لڑنا پڑ رہا ہے۔ ویت نامی عوام اس عزم و یقین کے ساتھ لڑ رہے ہیں کہ فتح اُن کی ہوگی اور حملہ آوروں کو واپس جانا پڑیگا کیونکہ وہ اپنی آزادی اور اپنے ملک کے دفاع کے لئے لڑ رہے ہیں۔ جبکہ امریکہ ایک غیر قانونی، ناجائز اور غیر منصفانہ لڑائی لڑ رہا ہے۔ وہ جارح ہے اور اپنے ملک سے ہزاروں میل دور ایک چھوٹے سے ملک کو طاقت کے بل پر غلام بنانا چاہتا ہے۔

ان سات برسوں میں جنوبی ویت نام میں قومی آزادی کے محاذ نے زبردست فتوحات حاصل کی ہیں۔ نگو ڈن ڈیم کی ڈکٹیٹری کا خاتمہ کر دیا۔ امریکہ کی "خاص جنگ" ناکام کر دی۔ ۱۹۶۵-۶۷ میں اور اس کے بعد ۱۹۶۶-۶۷ میں امریکہ کے خشک موسم کے "جوابی حملوں" کے منصوبے مٹی میں ملا دیئے۔ ساتھ ہی ساتھ "دفاعی دور" کے امریکی ارادے ناکام کر دیئے اور اب صورت حال یہ ہے کہ ویت نام میں "مقامی نوعیت کی جنگ" کی جدید امریکی حکمت عملی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔

ویت نام میں امریکی بندوقوں، ٹینکوں، میزائل اور فاسفورس بموں اور زہریلی گیسوں کے علاوہ چار ہزار سے زائد جنگی ہوائی جہاز استعمال کر رہے ہیں۔ ان میں دو ہزار ہیلی کاپٹر ہیں۔

ویت نام کے عوام اتنی زبردست جارح فوج کا کامیابی سے مقابلہ کر رہے ہیں اور دشمن کی ہر چال کو ناکام بنا رہے ہیں۔ ویت نامیوں کو جو امداد مل رہی ہے اس کا وہ صحیح استعمال کر رہے ہیں۔ اس بہادر قوم کو یہ احساس ہے کہ اس مخلصانہ امداد کا شکریہ ادا کریں۔ اُن کے رہنما ایسا کرتے ہیں۔

سوویت روس میں جنوبی ویت نام کے محاذ قومی آزادی

پوری دنیا میں ویتنام پر امریکی بمباری کے خلاف مظاہرے ہوئے
یہ تصویر ماسکو کے ایک ایسے ہی مظاہرے کی ہے

کے سربراہ مسٹر ڈانگ کوانگ منہ نے اپنے ایک مضمون میں ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا ہے: "قومی محاذ آزادی اور جنوبی ویت نام کے عوام، سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی، حکومت اور عوام کا، دوسرے برادر سوشلسٹ ملکوں کا اور دنیا کی امن پسند اقوام کا مخلصانہ شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے ویت نامی عوام کی جد و جہد کی پُر زور تائید کی ہے اور اُس کو ہر طرح کی امداد بہم پہنچائی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امریکی حملہ آوروں کی شرمناک شکست ہوگی۔ یہ شکست اٹل ہے اور صرف وقت کی بات رہ گئی ہے۔

جمہوریہ ہند کی ترقی اور خوشحالی کیلئے

بہار ہینڈلوم

کی مشہور و معروف مصنوعات جو پائیداری۔ عمدہ ڈیزائن۔ ارزانی اور خوشنمائی کے لئے ساری دنیا میں مشہور و مقبول ہیں۔

روز مرّہ کی ضروریات اور تقریبات کے موقع پر ہمیشہ استعمال کریں

ساری۔ دھوتی۔ شرٹنگ۔ چادریں۔ تولئے۔ پردے۔ میز پوش۔ غلاف سلک وغیرہ اور دیگر ضروریات کی تمام چیزیں بروقت صوبہ بہار کے تمام ضلعوں۔ سب ڈویزنوں۔ اور مشہور بازاروں میں بہار اسٹیٹ ہینڈلوم ویورس کوآپریٹیو یونین کی کھلی دوکانوں میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔

مزید معلومات کے لئے لکھیے

بہار اسٹیٹ ہینڈلوم ویورس یونین لمیٹڈ

اکزیوشن روڈ — پٹنہ — ۱

تار کا پتہ ——————— ہینڈلوم۔ پٹنہ

جماعت اسلامی
تبلیغی جماعت
پیشرو تحریکات کی روشنی میں

از:- اے - ب - حق

اصلاح اور رشد و ہدایت کا کام ہر دور میں انتہائی صبر آزما اور دشوار گذار رہا ہے۔ آج کی بات کچھ نئی نہیں ۔ انبیاء، اولیاء ، اتقیاء، صلحاء اور مصلحین سب کو اس کٹھن منزل سے گذرنا پڑتا ہے ۔ اصلاح و رشد کے لئے صرف اٹھ کھڑا ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے لئے اندرون و بیرون ملک کے مذہبی رجحانات ، اخلاقی صورتِ حال اور معشیت کے گہرے جائزے کی ضرورت پڑتی ہے اور ایک فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچ کر قدم اٹھانا پڑتا ہے ۔ مسلمانوں میں تنظیمی جذبہ شروع سے تازہ رہا اور ہر دور میں اصلاح و رشد، سیاسی ، اقتصادی ، اخلاقی اور مذہبی سدھار کے لئے تحریکیں شروع کی گئیں۔ انہیں سے اکثر و بیشتر تحریکات اپنے اندرکمی کے سبب اپنا وجود کھو بیٹھیں ۔ ایسا نہیں ہے کہ وجود کھو بیٹھنے والی تحریکات میں لیڈر شپ کی کمی ہو یا مطالعہ اور فن سے واقفیت کا فقدان ہو۔ دراصل صورتِ حال سے صحیح مطابقت اور ذاتی جائزے کی جس قدر کسی تنظیم کو ضرورت پیش آتی ہے اتنی کہیں اور نہیں پیش آتی اور جہاں اس کی کمی پائی جاتی ہے وہاں بگاڑ آنا لازم ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں چند سیاسی و مذہبی تحریکیں میدانِ عمل میں آئیں جن میں جمعیتہ علماء ، جمعیتہ احرار ، خاکسار پارٹی ، خلافت ، تحریک امارتِ شرعیہ ہمارے سامنے ہیں ۔ جمعیتہ علماء عوام میں اپنی بات آج قائم نہ رکھ سکی۔ اس کے اسباب کیا ہیں ؟ یہ ذمہ داران جماعت کا کام ہے کہ وہ اس کا پتہ چلائیں تحریکی اور جماعتی زندگی گذارنے والوں کے سامنے یہ باتیں ہونی چاہئیں۔ اسی طرح جمعیتہ احرار کا نام اب نہیں آتا۔ اسی طرح خاکسار پارٹی جوش و خروش کے ساتھ سامنے آئی اور اس کے سرکردہ لیڈروں سے بڑی توقعات قائم کی گئیں، لیکن یہ عوامی لیڈر شپ کے بعد ان میں زیادہ دنوں نہ ٹھہر سکی۔ تحریکِ خلافت کو آگے بڑھانے میں سرکردہ علماء زعماء اور مفکرین کا ہاتھ رہا لیکن یہ تحریک سب سے پہلے ختم ہوئی ۔ امارتِ شرعیہ کی جو تحریک چلائی گئی وہ ابھی کسی طرح زندہ ہے۔

[illegible]ء کے عظیم انقلاب کے بعد ہندوستان کے سیاسی معاشی اور سماجی حالات بدلے ، ان حالات کا تقاضہ تھا کہ مسلمانوں کو نئے طور پر منظم کیا جائے اور ان کے مذہب ، اخلاق و کردار ، سیاست و معاشرت کے لئے ایک واضح لائحہ عمل مرتب کیا جائے ۔ کچھ تنظیمیں جیسے جمعیتہ علماء آل انڈیا حیثیت کی مالک تھی اور اصولاً مناسب یہی تھا کہ مسلمانوں کی لیڈر شپ کی ذمہ داری یہی تنظیم سنبھالتی لیکن وہ آج بے بس ہو رہی ہے ۔ خاکسار تحریک کا فوجی کردار بھی اپنی اپیل ختم کر چکا۔

جہاں تک سرکاری اور حکومتی پالیسیوں کا سوال اٹھتا ہے وہاں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو مسلمانوں کی مذہبی ملی سماجی اور اقتصادی گٹھ جوڑ میں مانع ہو ۔ یہ ایک دوسری بات ہے کہ کچھ فرقہ پرست اپنے محدود دائرے میں بیٹھ کر ہمارے بارے میں کچھ خاکے ترتیب دے دیا لیکن ملکی قیادت کو مسلمانوں کی مذہبی ملی اور معاشی ایکتا میں مانع نہیں کہا جا سکتا ۔ مسلمانوں کا اتحاد ملک و قوم ، قومی ذرائع و وسائل ، ملک کی سائنٹفک ترقی سماجی فلاح و بہبود میں ہر طرح سے مفید ثابت ہو سکتا ہے جس طرح ایک گھر کے تمام حصے درست ہوں تو وہ خوبصورت نظر آتا ہے ۔

بہر نوع ابھی ملکی قیادت کو اس کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ذمہ داری ہماری ، ہمارے لیڈروں ، مفکروں اور سیاستدانوں کی ہے کہ وہ کسی ڈھنگ سے بھی ہمیں ایک بنائیں اور خوشحال آسودہ حال ، ترقی، فلاح اور ایک پُرامید زندگی کی طرف بڑھائیں ۔

مسلمانوں کے اخلاقی معاشی سماجی سیاسی اور ملی زوال کو روکنے کے لئے جو تحریکیں اس وقت چل رہی ہیں وہ ہیں جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے اس سے جتنی توقعات تھیں اس نے پوری نہیں کیں ۔ صرف کتابی علم کافی نہیں ہوا کرتا ۔ تبلیغی اور مشینری کاموں میں علم سے زیادہ وجدان اور جذباتی ہم آہنگی کی کارفرمائی ہے ۔ جماعت اسلامی نے اسکولوں کالجوں یونیورسٹیوں ، میڈیکل کالجوں ، انجینرنگ اسکولوں میں تعلیم پانے والے طلباء میں کام کئے اور اسلامیات پر لٹریچر بہم پہنچائے ۔ وکلاء بیرسٹر اساتذہ قائدین ، سماجی ورکروں میں بھی ان کا کام جاری ہے اور وہاں یہ نظریاتی ابہام و تفہیم سے کام لے رہے ہیں ۔ اسی طرح کارخانوں ، فیکٹریوں اور صنعتی اور کاروباری مراکز میں جماعت اسلامی کے ورکر متحرک نظر آتے ہیں ۔ اسلامی نظریات کو ہر طبقہ خیال میں پہنچانے میں وہ سرگرم کار سمجھے جاتے ہیں ۔ لیکن یہ بات کچھ میں

نہیں آتی کہ تعلیم یافتہ حلقہ میں ۲۰ سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد بھی وہ جوش و خروش اور وہ جذبہ نہیں پیدا کیا جا سکا جو اب تک یقیناً ہونا چاہئے تھا۔ عمل کے معاملہ میں عام طور پر جماعت اسلامی دوسری جماعتوں کا بھی مقابلہ نہیں کر پائی۔ وضع و قطع ایک معیار بنانے لباس اور صورت میں سادگی پیدا کرنے میں جماعتی زندگی کی کامیابی کارا ز ہے۔ کرچہ مشن کا جو کام جماعت اسلامی نے اپنے متعلق لیا ہے اس کی بنیاد زیادہ تر تراجم پر ہے اور یہ لوگوں کی یہاں بڑی کمی نظر آتی ہے جو اسلامیات اور جدید علوم و فنون کی واقفیت براہ راست کتابوں سے رکھتے ہوں اور ان کا استدلال جدید و قدیم قدروں کی بنیاد پر متوازن ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ جماعت کے کچھ افراد کے بارے میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ انکسار، فروتنی، خاکساری اور بے نفسی کی جو بات قیادت کے لئے ضروری ہوا کرتی ہے اس کے بارے میں جماعت کے ذمہ داروں کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہئے۔

مسلمانوں میں آج تک بدقسمتی سے ایسے بین الاقوامی مذہبی سیاسی ادارے قائم نہ ہو سکے جو اپنے وسیع علم و تجربہ کی بنیاد پر اندرون و بیرون ملک دونوں جگہ کے سیاسی، معاشی اور سماجی اداروں کے لئے صلاح کار یا مشیر کار کی حیثیت اختیار کر سکیں۔ اسلام نے زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق واضح اور تجربات پر مبنی ٹھوس نظریات دیئے ہیں جو بین الاقوامی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور فوجی اداروں کے سامنے پوری خود اعتمادی کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن اس طرح کی کسی پیشکش سے پہلے معلومات کی فراہمی اور صورت حال کے صحیح جائزے تقابلی مطالعہ اور خود کو نمونہ بنانا ضروری ہے۔

سیاست جماعت اسلامی آج جس سیاست کی جانب بڑھنا چاہتی ہے اکثر و بیشتر تنظیم کے لئے حسرت ناک گورستان ثابت ہوتی ہے۔ نظریاتی پہلو جنگ و جدال، مطالبات، مظاہروں، پروپیگنڈہ بازی، سازش میں تبدیل ہو کر ہمیشہ کے لئے سرد پڑ جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ تزکیۂ نفس ہو، تطہیر قلب ہو، سوچنے اور سمجھنے کے ذرائع کو فطری اور قدرتی بنایا جائے وہاں ایک جھنجھلاہٹ، منافرت، کشیدگی اور تناؤ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر وہ تنظیم جو سیاسی میدان میں قبل از وقت قدم رکھتی ہے۔ اپنا شاندار مستقبل کھو بیٹھتی ہے۔ ۶-۷ کروڑ مسلم عوام میں مذہبی نظریات کی اشاعت کچھ اتنا آسان کام نہیں۔ پھر ملک میں بسنے والی اور قومیں بھی حق رکھتی ہیں کہ ہم ان کے سامنے اسلام کا نظری اور مثالی نظریہ زندگی پیش کریں جس میں منافرت امتیاز اور احساس برتری کو دخل حاصل نہ ہو۔ جماعت اسلامی کے بارے میں یہ صرف خیال نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اس کے زیر اثر افراد تیزی کے ساتھ انفرادیت، احساس برتری قومی منافرت اور کشیدگی کے شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں لہٰذا صحیفہ آسمانی کے مشن کو پھیلانے کی جو بڑی ذمہ داری ان لوگوں نے اپنائی ہے وہ ان باتوں سے بے نیاز ہے

مشن کا ایک بڑا کام وہ بھی ہے جو مسیحی ادارے انجام دے رہے ہیں انہیں صبر و ضبط، سخت حالات کے مقابلے، مخالفت کے برداشت کرنے کی صلاحیت مسیحیت کو پھیلانے کا جذبہ، نفس کشی، فروتنی، انکسار، دوسروں کو سمجھنے کا جذبہ ان کی مشکلات میں ہاتھ بٹانے اور وقت پر کام آنے کی اسپرٹ، غیر مذاہب سے واقفیت عالمی اور ملکی حالات کا علم بدرجہا بہتر ہے جو ہمارے لئے درس عمل ہے۔ مسیحی علماء بین الاقوامی سطح پر ایک عرصے سے اپنی سمجھ کے مطابق اپنا فرض انجام دے رہے ہیں اور مذہبی نقطہ نظر سے ہم انہیں جو کچھ کہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسیحیت کے پھیلاؤ کے مختلف ادارے نفس تبلیغ اشاعت کے معاملے میں متحد ہیں اور انہوں نے بڑے صبر کے ساتھ جنگلوں جھاڑیوں، خطرناک جگہوں علاقوں اور قوموں میں پوری یکسوئی کے ساتھ کام کیا ہے۔

جہاں تک تبلیغی جماعت کا سروکار ہے ان کی واقفیت و علم کے بارے میں جو کچھ کہہ لیا جائے لیکن یہ طے ہے کہ جو جوش و خروش، جوش عمل، حرکت، جذب جذباتی ہم آہنگی، فروتنی، انکساری، قربانی، صبر و ضبط، تحمل و خاموشی، جانفشانی اور افہام و تفہیم کا جذباتی طریقہ یہاں ملتا ہے جماعت اسلامی کے لئے یقیناً درس عمل ہے۔ تبلیغی جماعت جنگلوں بیابانوں جھاڑیوں، گاؤں دیہات اندرون و بیرون ملک میں ہر جگہ متحرک ہے۔ یہ تنظیم بڑی تیزی کے ساتھ عوام میں مقبول ہو رہی ہے اور اگر اس کے جذبہ کا یہی حال رہا تو مستقبل قریب میں یہ ایک عظیم اصلاحی اور مشنری جماعت بن جائے گی۔

کھیل کے — میدان سے



ممتاز کرکٹ کھلاڑی پدم شری مشتاق علی

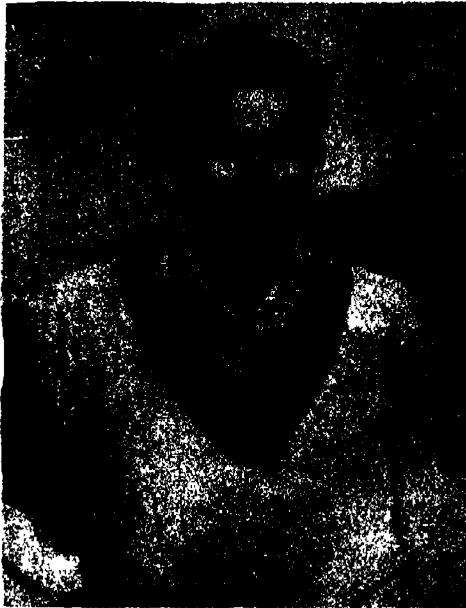


مشہور ٹینس چیمپئن — کرشنن

ہندوستانی کرکٹ ٹیم کا کپتان اور بہترین بلے باز نواب پٹودی



ہندوستان کا بے مثال باؤلر، سلیم دُرّانی



امن، پیار، زیادہ پیداوار اور پُرجوش زندگی

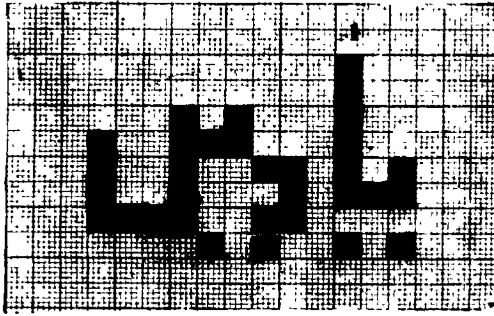


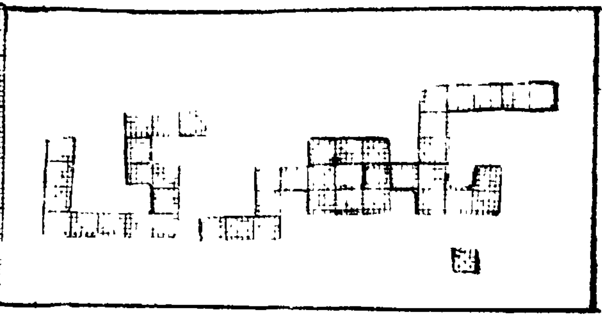


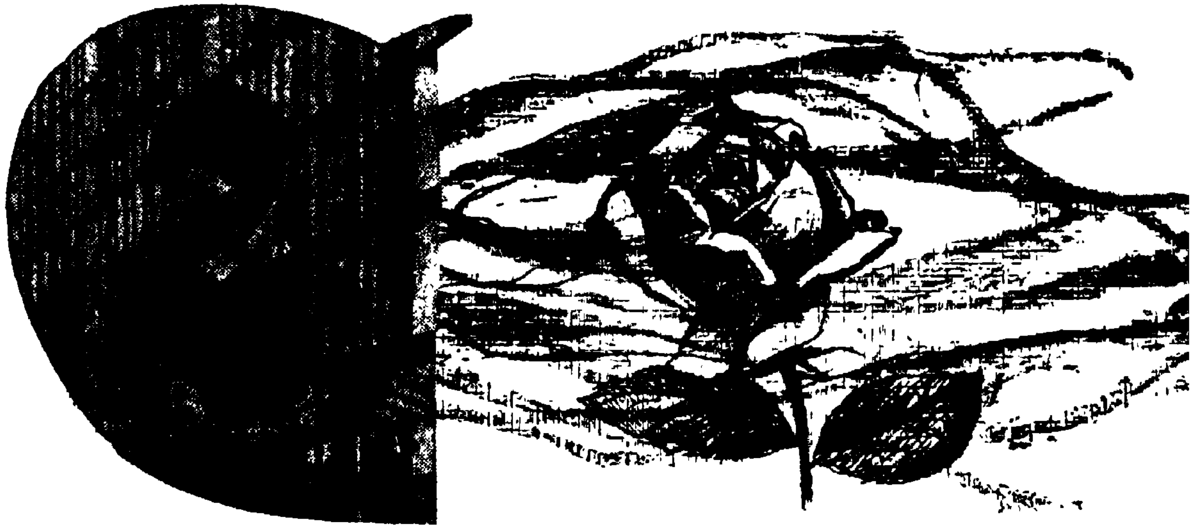
جسمانی درد، چوٹ، موچ، زخم، جلنے کٹنے اور

نورانی تیل

انڈین کیمیکل کمپنی، مئو ناتھ بھنجن، یوپی







پارک اسٹریٹ۔ لندن

جناب من

آپ مجھے نہیں جانتے ہوں گے۔ لیکن میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اور آخر وہ کونسا ہندوستانی ہوگا جو آپ کو نہیں جانتا ہوگا — ہندوستان کی جنگ آزادی کے پرانے سپاہی اور وقت کے عظیم صحافی کو سب ہی جانتے ہیں جن قربانیوں کے بعد آپ لوگوں نے ہمارے ملک کو انگریزوں کے پنجے سے آزاد کرایا ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے اور ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ آزادی کے پروانوں کی پرستش کریئے۔ ان میں سے میرے نزدیک آپ بلند ہیں۔

میں آج سے پندرہ سال پہلے جب ہمارا ملک غلام تھا اپنے باپ کے ساتھ لندن چلی آئی تھی۔ میرے والد ایک انگریز کے خانساماں تھے۔ انگریز صاحب جب ہندوستان سے واپس انگلستان آنے لگے تو اپنے ساتھ اور بہت سی چیزوں کے ساتھ اپنے پرانے نمک خوار کو بھی لیتے آئے۔ ماں مرچکی تھی اس لئے ہم دونوں باپ بیٹی ہی یہاں آگئے۔ میں انگلستانی ماحول میں پلی بڑھی۔ پھر بھی یہ فراموش نہ کرسکی کہ میں ہندوستانی ہوں۔ جتنا شعور بیدار ہوتا گیا اتنا ہی مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میرا وطن یہ نہیں ہے بلکہ ہندوستان ہے جو ابھی غلام ہے۔ اُسے آزاد ہونا ہی چاہیئے۔ آخر کار مادر وطن کے چاہنے والوں نے اُسے آزاد کرا ہی لیا۔ جو شعلہ سلطان ٹیپو نے بھڑکایا تھا وہ بھڑکا اور اُس کی آگ نے پورے ہندوستان کو روشن کردیا۔ مہاتما گاندھی، جواہرلال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور بے شمار شمع آزادی کے پروانوں کے آگے انگریزی سامراج کو جھکنا ہی پڑا۔ اور میرا بھارت آزاد ہوگیا۔ آہ۔ میں کتنی خوش ہوئی تھی کہہ نہیں سکتی۔ برسوں سے سوچ رہی تھی کہ اپنے وطن واپس چلوں۔ والد صاحب کا بھی انتقال ہوچکا ہے۔ اور میں نے اپنی ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کرلی ہے۔ اس لئے اب جلد ہی اپنے وطن واپس آرہی ہوں۔

عبدالباسط

آپ جانتے ہیں یہ خط میں دریائے ٹیمز کے کنارے بیٹھی لکھ رہی ہوں میرے بالکل سامنے دنیا کا سب سے بڑا گھنٹہ گھر بگ بین ہے۔ دائیں طرف انگلستان کا پارلیمنٹ ہاؤس ہے وہاں پر یونین جیک نظر آرہا ہے جو کبھی ہمارے ملک میں لہرایا کرتا تھا لیکن سچ کہتی ہوں۔ سب مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں اپنا لال قلعہ اور اس پر لہراتا ہوا ترنگا۔

دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے لیکن یہاں آج بھی کالے گورے کی تمیز باقی ہے۔ ایسا ہندوستان میں تو اب نہ ہوتا ہوگا۔ وہاں تو اب سب برابر ہوں گے۔ کوئی کسی کا زرخرید غلام نہ ہوگا۔ سب کو پیٹ

بھر کے روٹی ملتی ہوگی، کسی پر ظلم نہیں ہوتا ہوگا۔ اور اب ہوگا بھی کیوں اب تو ہمارے اوپر برطانوی آقا نہیں ہے۔ ہمارا اپنا راج ہے۔ میں بہت جلد واپس اپنے وطن آرہی ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ سے کیوں رابطہ پیدا کیا ہے۔ اس لئے کہ میں اب یہ نہیں جانتی کہ میرا کون عزیز کہاں ہے۔ میں آپ سے سہارا چاہتی ہوں۔ کیا آپ مجھے سہارا دیں گے۔

خط کا جواب جلد تحریر کیجئے گا۔ میں بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔

ایک اجنبی۔ ”سُورَیا“

کرشن نگر۔ دلی۔

رویا دیوی

آپ کا خلوص نامہ ملا۔ یہ کہنا تو فضول سا ہی ہوگا کہ پڑھ کر خوشی ہوئی مگر یہ کہتے ہوئے میں بالکل نہیں جھجک محسوس کر رہا ہوں کہ جس بھارت کی تصویر آپ نے بنا رکھی ہے اور جو سپنے آپ دیکھ رہی ہیں وہ ابھی پورے نہیں ہوئے ہیں پھر بھی آپ جیسے ہی نئے ہندوستان کے معمار ہوں گے۔ اور آپ کو جلد سے جلد ہندوستان آجانا چاہئے۔ میری آنکھیں آپ کی راہ تک رہی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ ہندوستان آکر آپ کی یہاں کے حالات و واقعات سے دل شکنی تو ضرور ہوگی پھر بھی آپ ہمت نہیں ہاریں گی۔ وہ خواب جو ہم پورے نہ کر سکیں ہیں ان کو پائے تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کریں گی۔ بھارت کے سیکڑوں بچے اپنا ایک باپو چاہتے ہیں جو انھیں پیار سے گود میں اٹھا لے اور ترقی کے راستوں پر انگلی پکڑ کر چلا سکے۔

مجھ جیسے ہندوستانی آج صرف آزادی سے ہی خوش نہیں ہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں ہمارا ہندوستان ترقی کی نئی شاہراہ پر چل کر ساری دنیا سے بلند ہو جائے اس کے لئے سچی لگن کی ضرورت ہے جو آپ میں بدرجہ اتم موجود ہے جلد سے جلد آنے کی کوشش کیجئے۔

آپ کا۔ ندیم

کناٹ پلیس۔ دلی۔

پیارے صفدر

کہو پیارے کیسے حال ہیں۔ اپنی کچھ نہ پوچھو کیسی گذر رہی ہے۔ میاں بس کیا بتائیں۔

ندیم صاحب کے مشورے سے ایک اخبار نکال لیا ہے کمبخت ایسا دردِ سر مول لے لیا ہے کہ کیا بتاؤں کیسی نہ کسی طرح اخبار نکالتے ہیں لیکن جب وہ مارکیٹ میں آتا ہے تو لوگ شکایات کا پلندہ سروں پر دے مارتے ہیں۔ کہیں کہتے ہیں کہ پرانی باتیں ہیں انگلش اخباروں میں سب چھپ چکا ہے۔ اب ان کو کون سمجھائے۔ ہندوستان سے انگریز چلے گئے پھر بھی سچے انھیں کی ہوتی ہے جن کے پاس روپیہ کھنکتا ہے۔ ان کے پاس تو ذریعہ ہے۔ ان کا ساتھ حکومت دیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم نے بھی آزادی کی خاطر پاپڑ بیلے ہیں اپنے آپ کو خاک میں ملا دیا۔ مگر پیارے کون سمجھتا ہے —— اور ہم ہی کیا اپنے ندیم صاحب کو لے لو۔ کتنے بڑے وطن پرور اور کتنے بڑے صحافی ہیں۔ ان کی ملک کے لئے قربانیاں ہیں پھر بھی انھیں کیا دیا ہے اس قوم نے اس ملک نے —کرایہ کا ایک کمرہ ہے جس میں صحیح روشنی بھی نہیں پہنچ پاتی ہے مگر جب ان کا خیال اس طرف دلاتے ہیں کہتے ہیں ”کیا میں اپنی قربانیوں کا سود وصول کروں گا“۔

آج کل تو پیارے وہ ملک کے سب سے بڑے دیو فرقہ پرستی سے برسرِ پیکار ہیں۔ کہتے ہیں انگریز کو تو بھگا ہی دیا ہے۔ اب اس کے ان چیلو کو بھی مٹا کر رکھنا ہے۔ یا تو فرقہ پرستی کی جڑیں اکھاڑ کر رکھ دوں گا یا خود فنا ہو جاؤں گا۔ میاں بڑے دل گردے کا آدمی ہے۔ کتنا پڑھا لکھا ہے مگر ایک کھدر کے جوڑے میں مست رہتا ہے۔ لوگوں کے لئے روتا ہے۔ غریبوں کے لئے لڑتا ہے۔ ہندوؤں سے مسلمانوں کے لئے لڑے گا ہندوؤں کے لئے مسلمانوں سے جھگڑے گا۔ پتہ نہیں یار کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔

ارے پیارے سب سے دلچسپ خبر تو اب یاد آئی۔ اپنے ندیم صاحب شادی کرنے والے ہیں۔ میاں لڑکی بھی بہت غضب کی ہے۔ لندن سے آرہی ہے قصہ دراصل یوں شروع ہوا تھا کہ اس لڑکی نے یہاں آنے سے پہلے ندیم صاحب کو ایک خط لکھا۔ الفاظ بہت ہی متاثر کن تھے۔ بھائی نے بھی جواب لکھ مارا۔ پھر تو یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ دونوں پیار کے رشتہ میں بندھ گئے۔ اور خطوط کے ذریعہ ہی ایک دوسرے کے ہوگئے

وہ لندن سے آئی۔ ادھر ہم نے آزادی کے سپاہی کو دُولہا بنایا تم بھی ضرور آنا۔ آؤگے نا۔ پیارے ہمارے تمہارے علاوہ اُس کا ہے ہی کون؟

بس اب اجازت دو کیوں کہ اخبار کے لئے پریس بھاگنا ہے۔ جواب کی تم سے کوئی جلدی نہیں ہے۔ کیوں کہ میں تمہاری عادت جانتا ہوں۔

تمہارا ۔ جوگندر۔

ساکچی بازار۔ جمشید پور

میرے سرتاج۔

آپ کا ابھی ابھی خط آیا۔ پڑھ کر دل کو سکون ہوا۔ فوراً جواب لکھنے بیٹھ گئی۔ یہاں آج کل بہت خراب فضا ہو رہی ہے۔ جب سے میں بمبئی سے آئی ہوں عجب عجب باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ آج ہندوستان کو آزاد ہوئے پندرہ برس ہو چکے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ زخم جو بدلیشی لگا کر گئے تھے بجائے بھرنے کے ناسور بنتا جا رہا ہے۔ وہ دو بھائی جو سیکڑوں سال سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ الگ ہو گئے ہیں۔ اب اپنی حکومت تھی اب ان کو پھر قریب آنا چاہیئے تھا مگر ایسا نہیں ہو رہا۔

ایک بار پھر سازشی لوگ جنم لے رہے ہیں اور پورے ہندوستان کو خون کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں۔ بڑے بڑے نام رکھ کر یہ عوام کو دھوکا دیتے ہیں اور آئے دن مذہب کے نام پر ہنگامے جگاتے ہیں۔ اب آج کل یہ لوگ مل کر خون کی ہولی کھیلنا چاہتے ہیں۔ ہم لوگ بڑے خوف زدہ تھے۔ لیکن اب ذرا اطمینان ہوا ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان کے شہرت گیر لیڈر ندیم صاحب یہاں آ رہے ہیں۔ ان کے یہاں آنے سے عوام میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ پھر بھی پتہ نہیں کیوں میرا دل دھڑک رہا ہے۔ یہ جو فرقہ پرست پارٹیاں ہیں۔ یہ اپنے لئے کہیں انھیں کچھ نقصان نہ پہنچا دیں۔

اللہ ان کی حفاظت کرے۔ آمین۔

میں بہت جلد واپس بمبئی آ رہی ہوں آپ بالکل فکرمند نہ ہوئیے گا۔ منّی کی صحت اب ٹھیک ہے۔ چنو آداب کہتا ہے۔ خدا حافظ

آپ کی صرف آپ کی۔ زبیدہ

دلّی۔ ہندوستان۔

پیاری روزی۔

میں اپنے پیارے وطن ہندوستان آ گئی ہوں۔ اپنی اس سرزمین میں آ گئی جس کے میں نے ہمیشہ خواب دیکھے ہیں اور جس کی مٹی سے میں بنی ہوں جب میرا جہاز یہاں کے ہوائی اڈے صفدر جنگ پر ٹھہرا اور میں باہر آئی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم اب آزاد ہیں۔ ہماری اپنی حکومت ہے ہمارے فیصلے ہمارے اپنے ہوتے ہیں۔ اب ہم کسی کے غلام نہیں ہیں۔

لیکن پیاری روزی تو نے سچ ہی کہا تھا کہ میں ہندوستان جا کر خوش نہ رہ سکوں گی صحیح ہے کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں۔ مگر ہماری مثال وہ ہے کہ کسی جنگلی بیل کو شیشے کی دوکان میں چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ خوبصورتی اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ ناممکن ہے۔ روزی ہم بھوکے تھے۔ ہمیں اقتدار کی ہوس تھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہی ہم اپنے چکر میں ایسے لگے کہ سب کو بھول گئے قوم کہاں جا رہی ہے اس کا ابھی علم نہیں ہے۔ نہ یہ جانتے ہیں کہ تعلیم کی کیا اثر لا سکتی ہے۔ سازشی کتے کیا کر سکتے ہیں۔

جانتے ہیں یہاں پر دو بھائی ہندو اور مسلمان جو صدیوں سے ساتھ رہتے آئے تھے غلط باتوں میں بہک کر خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ اور بھیڑیوں کی انسانی جماعت میں مل کر وہ اس کو وطن پرستی کا نام دیتے ہیں میں تجھے کیا بتاؤں کہ میں کتنی دکھی ہوں۔ ندیم صاحب نے صحیح لکھا تھا کہ تم آزاد ہندوستان میں آ کر خوش نہ رہ سکو گی۔

اب تو روزی میری شادی کو پوچھے گی۔ ندیم کو پوچھے گی۔ اری پگلی ان درندوں میں کوئی انسان رہ سکتا ہے۔ اسے یہ لوگ کیا زندہ رہنے دے سکتے ہیں۔ یہ جو ناموں پر خون کی بھینٹ لیتے ہیں۔ انھوں نے میری زندگی کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ اس کا خون کر دیا۔ روزی انسانوں کے بھیس میں درندوں نے اسے کھا لیا۔ اُف۔

پچھلے دنوں یہاں ایک جگہ فرقہ پرست ہنگامے شروع ہوئے۔ ندیم وہاں گئے تھے بھائی چارے کا پیغام دینے لیکن ان شیطان کے ساتھیوں نے ان کی بلی چڑھا دی۔ ان کو شہید کر دیا۔ کیا ہم اس لئے آزاد ہوئے تھے۔ کیا یہی ہماری ترقی ہے کہ ہم مذہب کے نام پر۔ صوبہ کے نام پر ایک دوسرے کا خون بہائیں۔

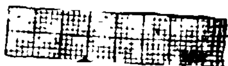
نہیں نہیں روزی اب میں لندن نہیں آؤں گی۔ میں اپنے ملک میں اپنے ندیم کے ملک میں اس کے اصولوں کو زندہ رکھوں گی جس مشن کے لئے گاندھی جی قربان ہوئے جس کے لئے ندیم شہید ہوئے۔ اُس مشن کو پورا کرنے کی کوشش کروں گی۔ چاہے مجھے بھی قربان ہونا پڑے۔

میں اُس کمرہ میں رہ رہی ہوں جہاں ندیم رہتے تھے۔ یہاں سے میں اس شمع کو ہمیشہ روشن رکھوں گی جس کو انھوں نے جلایا تھا۔

روزی مجھے کنواری مت لکھنا۔ میری شادی ہو گئی ہے۔ ندیم کے اصولوں سے۔

تیری

رویا ندیم



عنوان چشتی

لہو پکارتا ہے

یہ ایک راز ہے تقدیسِ حسنِ باطن پر
یہ ایک داغ ہے دامن پہ زندگانی کے
یہ ایک خراش ہے انسانیت کے چہرے پر
یہ ایک زخم ہے آنکھوں میں شادمانی کے

یہ ایک طلسم ہے زر کے سیاہ ہاتھوں کا
یہ ایک زہر ہے ایماں کے جام ہستی میں
یہ ایک بوجھ ہے دھرتی کے چشم و ابرو پر
یہ ایک حرفِ غلط ہے بیاضِ ہستی میں

یہ ہے اندھیروں کی مشعل، سراب کی قندیل
وجودِ اسرائیل

بجھی نہیں ہے ابھی شوخیٔ رمِ آہو
پڑی نہیں ہے ابھی دستِ شوق میں زنجیر
کھلی ہوئی ہے ابھی رہ گزر شہادت کی
بجھی نہیں ہے ابھی دردِ شوق کی تنویر

وہ ارضِ مسجدِ اقصیٰ، وہ کعبۂ اوّل
پھر اپنے چاہنے والوں کے انتظار میں ہے
لہو پکارتا ہے اہلِ دل کو مقتل میں
ہنوز قافلۂ درد رہ گزار میں ہے

خودی کا رقص کرو۔ ہے اشارۂ جبریل
غرضِ عشق کی تکمیل
یہ ہے اندھیروں کی مشعل سراب کی قندیل
وجودِ اسرائیل

سرمد عظیم آبادی

مقامِ عشق

صبح کا غیر کی جانب سے پیام آیا ہے
عشق ہشیار کہ مشکل یہ مقام آیا ہے

اپنی زلفوں میں گرہ اور لگا اور لگا
بعد مدت دلِ وحشی نہ دام آیا ہے

طوق پہنانے لئے جاتے ہیں دیوانوں کو
سرِ فہرست مرا دیکھئے نام آیا ہے

میکدہ ساقی و صہبا ہیں جہاں میں ہم سے
ہم ہی محروم ہیں جب دور میں جام آیا ہے

دیکھ اے محوِ خودی دید کی خو د حسنِ ازل
اپنے جلوؤں میں لئے دعوتِ عام آیا ہے

سب کو خمخانۂ قدرت سے ملی ہے مئے ناب
میرے حصے میں مگر بادۂ خام آیا ہے

ایک نگاہِ غلط انداز سے دیکھ تو لے
ترا سرمد تجھے کرنے کو سلام آیا ہے

عبدالرشید خاں جاوید

آخری خط





" یہ شادی ہرگز نہیں ہوسکتی " بھارت کی ماں چیخی۔

" شادی تو ضرور ہوگی، اور پرمیلا سے ہی ہوگی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے"۔ بھارت نے فیصلہ کن جواب میں کہا۔

" بیٹے تم سمجھدار ہو! نا سمجھ نہیں جو تمہیں اونچ نیچ بتائی جائے" بھارت کے باپ ٹھہرے ہوئے لہجہ میں سمجھانے لگے۔ " تم جانتے ہو ہم لوگوں کی سماج میں کچھ عزت ہے۔ ہمارا ایک مقام ہے، دُنیا جانتی ہے کہ تم میرے بیٹے ہو تمہارے نام کے ساتھ لوگ ہمیں یاد کر لیتے ہیں۔ کیا تمہاری اس شادی سے ہمارا مذاق نہ اُڑے گا۔ جس سے تم شادی کرنا چاہتے ہو، کیا اس کے بارے میں غلط باتیں مشہور نہیں ہیں۔"

" لیکن ڈیڈی وہ باتیں بالکل غلط ہیں۔ مجھے اُس کا یقین ہے"۔

" نہیں بھارت تم یہ کہہ کر سماج کا منہ بند نہ کر سکو گے۔ وہ لڑکی جو برسوں سے دفتروں کی خاک چھان رہی ہو، جس کے بارے میں ایک ایک آدمی ایسی ایسی باتیں کرتا ہو رام رام ابھی کل کی ہی بات ہے، مجھے راھو ملا تھا۔ تم سُن بھی نہ سکو گے کہ اُس نے کن الفاظ میں پرمیلا کا ذکر کیا"۔

" میں سب جانتا ہوں پتا جی، اس نے کہا ہوگا یہی کہ پہلے اس کا تعلق مجھ سے رہ چکا ہے۔ لیکن میں نے بھی اُسے یوں چھوڑ دیا کہ وہ صرف مجھ سے تعلق رکھ کر اطمینان کا سانس نہ لے سکی۔

" ارے بیٹا! صرف اتنا ہی کہتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ میں تو وہ باتیں شاید دُہرا بھی نہ سکوں گا۔ ہاں ہمارے ساتھ شامو کاکا تھے تم اُن سے جا کر پوچھو کہ کیا کیا اُس نے کہا ہے۔ اور اس کا مجھے یقین ہے کہ اُس نے جھوٹ نہ بولا ہوگا۔

" مجھے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا ہے۔ مجھے صرف پرمیلا سے مطلب ہے اور میرے نزدیک وہ سیتا کی طرح پاک ہے" بھارت یہ کہہ کر کھانے کی میز سے اُٹھ گیا۔

" روکو " بھارت ماں کی ممتا نے پھر پکارا ۔ میرا ارمان تھا تمہارے لئے چاند سی دُلہن لاؤں اور تمہاری شادی اتنی شان سے کروں کہ تم جس گھوڑی پر بیٹھو اُس پر پھولوں اور روپوں کی بارش ہو، لیکن بیٹا تم نے

سارے خواب ڈھندلے کر دیئے۔ اب بھی سوچ لو۔ کہاں تم اور کہاں وہ کالی پڑیل۔

"اُف ماں۔ یہ کہہ کر تم میرے پیار، میرے خلوص کو ٹھیس لگا رہی ہو۔"

"ارے کم بخت تجھے شرم نہیں آتی میرے سامنے ایسے الفاظ کہتے ہوئے"

"اور ماں! تمہیں خیال نہیں آتا کہ اپنی ہونے والی بہو کو کن کلمات سے نواز رہی ہو۔"

بھارت بیٹا جتنا ہم سمجھا سکتے تھے تمہیں سمجھا دیا۔ لیکن بیٹا جو بھی کرو خوب سوچ سمجھ کر کرنا۔ اور یہ بات ذہن میں رکھو کہ سماج کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اُس کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور اُن کی روشنی ہی میں کچھ کرنا چاہئے، ویسے تمہاری دلہن ہماری بہو ہوگی۔ چاہے اس کا ماضی کچھ بھی رہا ہو، بھارت کے باپ نے آخری الفاظ کہہ دیئے۔

ڈیڈی میں آپ کا شکر گزار ہوں اور اس کا یقین رکھئے کہ آپ کا بیٹا ایسا کوئی کام نہیں کرے گا جس کے لئے کبھی آپ کو شرمندہ ہونا پڑے۔ یہ کہہ کر بھارت اپنے کمرے میں آکر میز پر بیٹھ گیا وہ پرمیلا کو جلد سے جلد اپنا آخری فیصلہ خط میں لکھ دینا چاہتا تھا۔ کاغذ قلم اُٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔

ڈیر پرمیلا

تمہیں ہوگئے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کئی صدیاں بیت گئی ہوں۔ آج کے دن تم نے آنے کو کہا تھا لیکن تم یہاں نہیں پہنچیں۔ اور نہ معلوم کب تک آؤ۔ اس لئے یہ خط لکھ رہا ہوں کہ جلد سے جلد یہاں آجاؤ۔ ڈیڈی کا اصرار ہے کہ میں لندن چلا جاؤں۔ اور اگر تم نہ ملتیں تو شاید میں لندن چلا بھی گیا ہوتا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو شاید میرا یہ جیون بے کار ہی رہ جاتا۔ کیوں کہ تم نہ مل پاتیں۔ اور پھر مجھے ایک جنم لینا پڑتا۔ اوہ۔ خط میں بھی میں تم سے ایسی باتیں کرنے لگا، جن سے تم گھبراتی ہو۔ یہ خط میں تم کو اس لئے لکھ رہا ہوں کہ تم جلد یہاں میرے پاس آجاؤ۔ نیا سال شروع ہونے والا ہے اور میں چاہتا تھا کہ نیا سال میری زندگی میں نیا پن لائے۔ ہمارے عہد و پیمان اب حقیقت کا رُوپ دھار لیں گے۔ شادی تو ہماری جب ہی ہو چکی ہے۔ لیکن پھر بھی دُنیا والے جسے شادی کہتے ہیں اُس کا وقت آچکا ہے اور تمہارے انتظار کی گھڑیاں مجھ پر کٹھن گذر رہی ہیں۔ بس چلی آؤ۔ چلی آؤ۔

تمہارا اور صرف تمہارا

بھارت

بھارت نے خط لکھ کر جیب میں رکھا اور لفافہ خریدنے بازار کو چل دیا۔

"ارے بھارت بیٹے۔ کن خیالات میں گم چلے جا رہے ہو"! کسی نے بھارت کو خیالات کی دُنیا سے کھینچا۔

"اوہ نمسکار۔ شامو کاکا۔ کہاں جا رہے تھے۔"

"ارے بیٹے تمہارے ہی گھر جا رہا تھا بھئی ہمیں تو یقین نہیں آیا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ تمہارے باپ تو بہت ہی پریشان ہو گئے ہیں۔ جب سے وہ لڑکا رامو ملا ہے۔ اُس نے تو وہ بکواس کی ہے کہ رام رام۔"

"شامو کاکا۔ اس دُنیا کا عجب قاعدہ ہے۔ کوئی کسی کو بھی کسی حالت میں دیکھ نہیں سکتا۔ کوئی خوش رہتا ہے تو دُنیا جلن کی شکار ہوتی ہے۔ کوئی روتا ہے تو اُسے رونے نہیں دیتی۔ اب ایسے میں کیا کیا جائے۔"

"نہیں بیٹا۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے، آخر تمہیں کس بات کی کمی ہے۔ ایک سے ایک امیر، خوبصورت لڑکی تمہیں مل سکتی ہے۔"

"کاکا۔ مجھے صرف لڑکی نہیں چاہئے۔ ایک شریکِ حیات چاہئے۔ جو مجھے محبت دے سکے جس کے دل میں میرے لئے درد ہو، جس کی آنکھوں میں میرے لئے آنسو ہوں، اور جس کے ہونٹ میرے لئے مسکراتے ہوں اور میرا خیال ہے کہ ایسی لڑکی کوئی دوسرا نہیں ڈھونڈ سکتا ہے۔ میں نے اُسے تلاش کر لیا ہے، اور اُس کو آپ اچھی طرح جان گئے ہیں۔ بھارت نے جذبات میں بہتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔

"بیٹے بھارت: تم میری اولاد کی طرح ہو۔ میں نے تمہیں اپنی گود میں کھلایا ہے۔ میں کم سے کم تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا، کہ تم اس لڑکی سے شادی تو شادی کسی قسم کا تعلق رکھو۔ تم نہیں جانتے، رامو سے اس کی پہلے محبت تھی لیکن رامو نے اُس سے شادی نہیں کی، اس کے بعد سے اُس کے قدم جس منزل کی طرف بڑھے ہیں وہاں تم جیسے نیک لڑکے کی جگہ نہیں ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ اب کہیں نوکری کرتی ہے۔ ارے بیٹے شام کو جب دُنیا کے آفس بند ہوتے ہیں، تو وہ دفتر جاتی ہے۔ وہ بھی صرف ہفتہ میں تین دن۔ بیٹا گوشت وہ کھاتی ہے، شراب وہ پیتی ہے، آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔

"اوہ۔ شامو کاکا۔ مجھے آپ معاف کر دیجئے۔ اور میرے حال پر مجھے چھوڑ دیجئے۔ آپ کی ان باتوں سے مجھے سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ میری طبیعت خراب ہوگی۔ اُف۔ بھارت یہ کہتا ہوا ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر اُس نے ایک لفافہ خریدا اور اپنا خط اس میں رکھتا ہوا کیبن کی جانب بڑھ گیا اُس نے ایک کیبن کا پردہ اٹھایا، پردہ اُس کے ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ اُس کے دل کی دھڑکن رُک سی گئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں، کیوں کہ اس نے اپنے محل کو اپنے سامنے ہی گرتے ہوئے دیکھ لیا۔ پرمیلا اپنے آفس کے بوس (جسے وہ اپنا باپ کہتی تھی) کی باہوں میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ بھارت کو دیکھتے ہی دونوں کے چہرے کالے پڑ گئے۔ اور بھارت سوری کہتے ہوئے پردہ چھوڑ کر واپس مڑ گیا۔ شادی کا پہلا خط آخری خط بن کر اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔

۱۹۳۵ کون کیا تھا؟

مرتب

قدیر احمد قدیر۔ ایم۔ اے

۱۹۳۵ء میں مسٹر وامن۔ پی۔ کباڈی نے انڈین ہوازہو۔؟ (کون کیا ہے؟) ایڈیٹ کی تھی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں یہ پہلی کوشش تھی۔ انگریزی میں یہ کتاب ۶۰۸ صفحات پر مشتمل ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر ہے۔ قیمت کل تین روپے ہے اور پاینڈلر پرنٹنگ پریس بمبئی میں چھپی ہے۔ اسمیں تقریباً سوا سو کارخانوں، فرموں، صنعتوں انشورنس کمپنیوں، بنکوں، اخباروں، کتب فروشوں اور دیگر کمپنیوں کے اشتہارات ہیں۔ ملک کے ہر صوبے اور قریب قریب ہر علاقے کی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں آل انڈیا شہرت کے ادیبوں، کھلاڑیوں، فن کاروں، ہندوستانی اور انگریزی افسروں اور سوشل ورکروں کے حالات ان کی ملک گیر شہرت کے مطابق جمع کئے گئے ہیں اور ہر حال میں غیر جانب داری کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ان ہزاروں اشخاص میں سے آج ہم گنے چنے حضرات سے ہی واقف ہیں۔ اس وقت ان حضرات میں سے کچھ لوگ اپنی شہرت کے عروج پر ہیں۔ کچھ لوگ درمیانی شہرت کے مالک ہیں اور کچھ کی شخصیت ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان میں سے چند ان سیاسی رہنماؤں کے حالات پیش کئے جاتے ہیں جو آج بھی ملک گیر شہرت کے مالک ہیں یا آزادی سے کچھ پہلے یا آزادی کے بعد ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔

عبدالغفار خاں

سرخ پوش لیڈر ہیں ۱۸۹۱ء میں اتمان زئی میں پیدا ہوئے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ہندوستانی فوج میں کمیشن پیش کیا گیا لیکن لینے سے انکار کر دیا۔ اپنے گاؤں میں قومی۔۔ اسکول جاری کیا۔ لیکن ۱۹۲۵ء میں عتاب کی نذر ہو گیا۔ رولٹ ایکٹ اور تحریک ترک موالات میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ گرفتار کر کے تین سال کی قید مشقت کی سزا دی گئی۔ ۱۹۲۹ء میں افغان جرگہ کی تنظیم کی اور سرخ پوش والینٹر کور پس کی تشکیل کی جو خدائی خدمتگار کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۳۲ سے ۱۹۳۴ء تک ہزاری باغ جیل میں صوبائی قیدی رہے۔ رہا ہونے کے بعد مع اپنے بھائی ڈاکٹر خان کے پنجاب اور صوبہ سرحد میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔ بمبئی کانگریس ۱۹۳۴ء کی ایک تقریر پر ۱۹۳۵ء میں مقدمہ چلا اور بغاوت کے الزام میں دو سال کی

سزا دی گئی۔

آغا خان۔

سلطان محمد شاہ۔ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ اسماعیلی مسلمانوں کے ہیڈ ہیں اور ایسٹ افریقہ، سنٹرل، ایشیا اور ہندوستان میں انکے لاتعداد مذہبی پیرو ہیں جنگِ عظیم کے دوران بہترین خدمات کے صلہ میں فرسٹ کلاس سردار کے ماہی و مراتب اور ۱۱ بندوقوں کے سلام عطا ہوئے ہیں۔ ہندوستان اور یورپ میں بہت سے ریس کے گھوڑوں کے مالک ہیں۔ "انڈیا ان ٹرانسزیشن" کے مصنف ہیں۔

سی۔ ایف۔ اینڈریوز۔

پیدائش ۱۲ فروری ۱۸۷۱ء۔ شانتی نکیتن میں پروفیسر ہیں۔ ہندوستانیوں سے میل محبت رکھنے کے باعث "دین بندھو" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کنگ ایڈورڈ اسکول، برمنگھم اور پیم برک کالج میں حاصل کی۔ اسی کالج میں فیلو اور لیکچرر ہوئے۔ سینٹ اسٹیفنز کالج میں پروفیسر ہو کر آئے۔ کیمبرج یونیورسٹی بورڈ کے ممبر پنجاب یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ کے ممبر اور فیلو رہے۔ ساؤتھ افریقہ میں گاندھی جی کی تحریک ترکِ موالات میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے (۱۹۰۴ء ۱۹۱۳ء) "کرسچینیٹی اینڈ لیبر پرابلم" "نارتھ انڈیا" "دی رینیسنس ان انڈیا" "کرائسٹ اینڈ لیبر" "دی انڈین پرابلم" "انڈین ان ساؤتھ افریقہ" "ٹو دی سٹوڈنٹس" "دی ڈرنک اینڈ ڈرگ ایولز" "وہاٹ آئی اون ٹو کرائسٹ" "کرائسٹ ان دی سائنس" "کارسپونڈنٹ، مانچسٹر گارجین" "کیپ آرگس" "شال اینڈ ورنا ٹینرز" "ذکا اللہ آف دہلی" وغیرہ کتابوں کے مصنف ہیں۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

پیدائش۔ ۱۸۸۰ء میور سنٹرل کالج الہ آباد، نظام کالج دکن۔ یونیورسٹی آف ایڈنبرگ میں تعلیم حاصل کی۔ چارجنگ ہاسپٹل لندن میں ریزیڈنٹ میڈیکل آفیسر، سینٹ پیٹرس ہاسپٹل لندن میں کلینکل اسسٹنٹ رہے۔ یورپ میں ۱ سال گذارنے کے بعد ایڈنبرگ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف میڈیسن اور سرجری میں ڈگری لینے کے بعد ہندوستان واپس آئے۔ ۱۹۱۲-۱۳ء میں میڈیکل مشن

ترکی کی تنظیم کی۔ ۱۹۱۷-۱۸ء میں ہوم رول تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے ۱۹۲۲ء میں خلافت کانفرنس گیا کے صدر۔ ۱۹۲۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس۔ مدراس کے صدر۔ ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کنونشن کلکتہ کے صدر ہوئے۔ ۱۹۲۰-۲۲ کی خلافت تحریک کے روح رواں تھے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں ستیہ گرہ تحریک کے سلسلہ میں قید کئے گئے۔ پریذیڈنٹ کانگریس پارلیمنٹری پارٹی (۱۹۳۳) کے بانی مبانی اپریل ۱۹۳۵ء میں صحت خراب ہونے کے باعث کانگریس ورکنگ کمیٹی اور سرگرم سیاست سے ریٹائر ہوگئے۔ نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈر رہیں۔

آصف علی۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ بار ایٹ لا۔ دہلی

پیدائش ۱۸۸۸ء سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی اور لنکن ان۔ لندن میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۸ء میں مقدمہ چلا اور قید ہوئی۔ کانگریس کی تحریکوں میں حصہ لینے کے سبب کئی بار جیل گئے۔ یورپ کا کافی سفر کیا ہے۔ میونسپل کمشنر دہلی۔ سکریٹری پارلیمنٹ بورڈ، نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے سرگرم ممبر۔ ۱۹۳۵ء کے الیکشن میں ہندو مسلمانوں کے ووٹوں کی بھاری اکثریت سے لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے /۔ ۱۹۲۸ء میں ارونا گنگولی سے شادی کی ہے۔ "کنسٹرکٹو نان کوآپریشن" کے مصنف ہیں۔ اسکیٹنگ شکار اور صحافت سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

ارونا آصف علی۔

پیدائش جولائی ۱۹۰۹ء سیکرڈ ہارٹ اینڈ کنونیٹ اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ مسٹر آصف علی ایم ایل اے سے شادی ہوئی۔ نیشنل کونسل آف وومن کی ممبر اور دہلی وومن لیگ کی سکریٹری ہیں۔ آل انڈیا وومن کانفرنس کی اسٹینڈنگ ممبر اور وومنز فنڈ ایسوسی ایشن کی ممبر ہیں۔ ۱۹۳۰-۳۱ کی کانگریس کی ترک موالات تحریک کے سلسلہ میں چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں پھر چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ تعلیمی، سماجی اور سیاسی ہر میدان میں عورتوں کی رہنمائی کرتی ہیں۔ آجکل وومن کانفرنس کی اسٹینڈنگ ممبر ہیں اور لاتعداد سیاسی اور تعلیمی کمیٹیوں اور تنظیموں سے منسلک ہیں۔ بہترین مقرر اور ادیب ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مسلمانوں کے مقبول روحانی و علمی مفکر ہیں۔ مکہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں عرب میں ہی رہے۔ مذہبی تعلیم الازہر یونیورسٹی میں حاصل کی۔ ہندوستان آ کر کلکتہ کو مستقر بنایا اور اپنے مشہور اخبار "الہلال" کا اجرا کیا۔ اسکے ذریعہ ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک کے حالات سے مسلمانوں کو روشناس کرایا۔ حکومت نے اس پر پابندی لگا دی تو "البلاغ" نام کا دوسرا اخبار نکالا جس نے علی برادران کے ساتھ ان کی شہرت کے چار چاند لگا دیئے۔ جنگ عظیم کے موقعہ پر قومی تحریکات میں بڑے زور شور سے حصہ لیا۔ اور گاندھی جی کی رہنمائی میں کانگریس میں شامل ہو گئے۔ تحریک خلافت کے روحِ رواں ہوئے اور تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں ۲۲-۱۹۲۱ء میں دیش بندھو داس اور علی برادران کے ساتھ سزایاب ہوئے۔ جو اس وقت کی قومی تحریکوں کی روح اور مسلم رہنما تھے۔ ۳۲-۱۹۳۰ء میں سول ڈس اوبیڈینس مومنٹ میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ ۱۹۲۳ء کے انڈین نیشنل کانگریس سپیشل دہلی سیشن کے صدر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں کانگریس کے ایکٹنگ صدر رہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر ہیں۔ مشہور ادیب، کامیاب مقرر اور مصنف ہیں۔ بہت سے مضمونوں کے مصنف الہیات اور تفسیر قرآن کی بہت سی تصانیف ہیں۔

سبھاش چندر بوس۔

پیدائش ۱۸۹۷ء۔ کلکتہ اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ آئی سی ایس میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں مستعفی ہو کر تحریک ترک موالات میں شامل ہو گئے۔ ۲۴-۱۹۲۲ء میں "فارورڈ" کلکتہ کے منیجر رہے۔ ۱۹۲۴ء میں کلکتہ کارپوریشن کے ممبر منتخب ہوئے۔ چیف ایگزیکیوٹو آفیسر ہوئے۔ گرفتار ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ بنگال پراونشیل کانگریس کمیٹی کے صدر رہے ۱۹۲۷ء میں رہا کر دیئے گئے۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سول ڈس اوبیڈینس مومنٹ کے روح رواں تھے۔ متعدد بار جیل گئے۔ ستیہ گرہ کی تحریکات کے سلسلہ میں ماخوذ ہوئے رہا ہونے کے بعد انگلینڈ کے علاوہ کسی بھی یورپین ملک میں علاج کرانے کی غرض سے چلے جانے کا حکم ہوا۔ والد کی نازک حالت ہونے کے سبب دسمبر ۱۹۳۴ء میں ہندوستان واپس آنے کی اجازت ملی۔ والد کے انتقال کے بعد انگلینڈ کے سوا کسی بھی یورپین ملک میں واپس جانے کا حکم ہوا۔ "دی انڈین اسٹرگل ۳۴-۱۹۳۰ء" میں لندن میں چھپی تو حکومت نے اس پر پابندی لگا دی۔ مطالعہ اور ٹینس کا شوق ہے۔

سید عبداللہ بریلوی۔ ایم اے۔ ایل ایل۔ بی

بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ الفنسٹن کالج سے ۱۱-۱۹۱۰ میں گریجویٹ ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہو کر ۱۹۱۸ء میں لیڈر رائٹر ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں جونیئر ایڈیٹر ۱۹۱۸ء میں اسسٹنٹ ایڈیٹر اور ۲۰-۱۹۱۹ء میں مسٹر ہارنی مین کی جلا وطنی کے زمانے میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۲۴-۱۹۲۰ میں مسٹر ایم پکتھال کے ساتھ "کرانیکل" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے متبادل ممبر ہوئے۔ نومبر ۱۹۳۰ء میں سول ڈس اوبیڈینس مومنٹ کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی اور دوسرے رہنماؤں کے ساتھ رہا ہوئے نیشنل مسلم پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہیں۔ جنوری ۱۹۳۲ء میں دوسرے کانگریسی رہنماؤں کے ساتھ گرفتار ہوئے اور دو سال کی قید با مشقت ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں رہا ہوئے اور بمبئی یونیورسٹی کے ممبر ہیں۔ سوشل سروس سہ ماہی کی ایڈیٹوریل کمیٹی کے ممبر ہیں۔

سردول سنگھ

پیوپل انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور کے مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ کانگریس لیڈر ہیں۔ سکھوں میں قومی تحریک کے بانی مبانی ہیں۔ تحریک ترک موالات میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں ۱۸۸۶ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ کرکٹ ٹیم کے کپتان اور فٹ بال کے کھلاڑی رہے۔ دہلی میں پبلک لائف کا آغاز کیا اور "سکھ ریویو" کا اجرا کیا۔ ۱۹۱۷ء میں ہندو یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں لاہور منتقل ہوئے اور "نیو ہیرالڈ" کا اجرا کیا۔ ۱۹۲۵ء میں پنجاب پراونشیل کانفرنس کی صدارت کی۔ ۱۹۲۶ء میں مختلف تنظیموں سے مستعفی ہو کر کانگریسی تحریکات کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر لی۔ ۱۹۲۸ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہوئے اور رہے۔ ۱۹۳۲ء میں کانگریس کے

ایکٹنگ صدر رہے۔ ۱۹۲۶ء میں یو بلز انشورنس کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ دی سکس مل لائف انشورنس ایجنٹ" نان وائلینٹ نان کوآپریشن"۔ اسٹیڈیز ان سکھ ریلیجین"۔ اور دوسری مذہبی اور سیاسی کتابوں کے مصنف ہیں۔

محمد علی کریم بھاگلہ۔ بی۔ اے (آکسن) بار ایٹ لا۔

۱۹۰۰ میں پیدا ہوئے بمبئی اور آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی جیور اسٹیٹ دھاریسی کی دختر مہرالنسار سے شادی ہوئی۔ انڈین مجلس۔ آکسفورڈ ۱۹۲۲ء صدر رہے۔ ۱۹۲۲ء میں وکالت شروع کی مسٹر محمد علی جناح کے جونیر کی حیثیت سے بمبئی میں پریکٹس شروع کی۔ بمبئی مسلم لیگ کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی سلسلہ میں اختلافات کی بنا پر مستعفی ہو گئے۔ رپورٹ کی مخالفت کرنے والے مسلم فرقہ پرستوں کی سختی سے مخالفت کی۔ نیشنلسٹ مسلم پارٹی بمبئی کے نائب صدر ہوئے۔ آل پارٹی سائمن کمیشن بائیکاٹ کے سرگرم ممبر رہے۔ بمبئی اسٹوڈینٹ برادرہڈ کے نائب صدر ہوئے۔ بمبئی بار کونسل کے سکریٹری ہیں۔

کملا دیوی چٹوپادھیائے۔

پیدائش ۳ راپریل ۱۹۰۳ء۔ کیمبرج۔ کورس ان سوشیالوجی بیڈ فورڈ کالج۔ لندن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ شروع میں بذات خود اسٹیج پر آکر ایکٹنگ کی اصلاح کی۔ ۱۹۲۲ء میں کانگریسی تحریکات میں شامل ہوئیں۔ ۱۹۲۶ء میں پہلی ہندوستانی خاتون تھیں جنھوں نے لیجسلیٹو کونسل کے الیکشن میں حصہ لیا۔ تعلیمی اور سماجی مسائل میں سرگرم عمل ہیں۔ خصوصاً عورتوں کے مسائل میں خاص دلچسپی رکھتی ہیں۔ ۱۹۳۰ء تک آل انڈیا ویمنز کانفرنس کی آرگنائزنگ سکریٹری رہیں۔ سول نافرمانی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۳۰۔۳۴ء میں متعدد بار جیل گئیں۔ کمسنی کی شادی کی مخالفت اور شاردا ایکٹ کی ہمنوائی میں سرگرم رہیں۔ کٹر سوشلسٹ ہیں۔ آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کی منتظم ہیں۔ دیہاتی کاموں میں بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ممبر ہیں۔ کانگریس کے والنٹیر محکمہ میں عورتوں کی لیڈر رہیں۔ نوجوانوں کی تحریکات کی لیڈر بھی ہیں۔ بہت سی کانفرنسوں کی صدارت کر چکی ہیں۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے کانگریسی نظریات میں تبدیلی لانے والے گروپ میں شامل ہیں۔

تصاویر اور نوادرات جمع کرنے کا شوق ہے۔

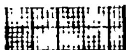
نواب چھتاری۔ سر محمد احمد سعید خاں۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی

۱۹۳۳ء کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ۱۹۲۸ء۔ ایم۔ بی۔ ای ۱۹۱۸ء یو۔ پی کے ایکٹنگ گورنر ہوئے۔ اپریل ۱۹۳۳ء۔ ۱۲ر دسمبر ۱۸۸۸ء کو پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ آل انڈیا راجپوت کانفرنس کے صدر رہے۔ ۱۹۲۳ء۔ یوپی ایل سی ۲۲۔۱۹۲۲ء کے ممبر رہے۔ پہلے ڈسٹرکٹ بورڈ بلند شہر کے نان آفیشل چیرمین مقرر ہوئے (۲۳۔۱۹۲۲ء) ۲۵۔۱۹۲۳ء میں یوپی کے صنعتوں کے محکمہ کے وزیر ہوئے۔ ۳۳۔۱۹۲۶ء میں یوپی ہوم ممبر رہے۔ پہلے جون ۱۹۲۸ء میں اور پھر اپریل ۱۹۳۳ء میں یوپی کے گورنر نامزد ہوئے۔

دونوں کی قیادت سے ہندوستان اور پاکستان کو جو فائدے پہنچ سکتے تھے، نہیں پہنچے۔ خان عبدالغفار خاں واقعات کا رخ موڑ سکتے تو ہندوستان و پاکستان کے اختلافات کا وہ عالم نہ ہوتا جو آج ہے۔ ان کی ذات گرامی نہ تو پختونوں کے لئے مفید ہو سکی۔ نہ پاکستان کے عوام کے لئے مفید ہو سکی، نہ ہندوستانی عوام کے لئے مفید ہو سکی، دو قومی نظریہ نے جو شرانگیزی کی تھی، اس کا توڑ صرف خان عبدالغفار خاں کر سکتے تھے،

خان عبدالغفار خاں اس وقت افغانستان میں مقیم ہیں۔ کچھ ممتاز ہندوستانیوں نے کابل میں آپ سے ملاقاتیں کیں، لیکن یہ عقدہ نہ کھل سکا کہ ان کے ارادے کیا ہیں۔ جہاں تک ہمیں اندازہ ہے، وہ افغانستان میں کوئی محاذ قائم کرنا نہیں چاہتے، وہ غالباً ہندوستان بھی نہیں آنا چاہتے۔

جہاں تک ان کی تحریک پختونستان کا تعلق ہے، اس کی حقیقت بھی یہ رہ گئی ہے کہ صوبہ سرحد کا نام پختونستان رکھ دیا جائے۔ حکومت ہند سے امید ہو سکتی تھی کہ وہ تحریک پختونستان کے لئے غذا بہم پہنچائے گی، لیکن کشمیر کا سوال ہی اس قدر الجھ رہا ہے کہ خشک سالی کے اس دور میں پختونستان کیلئے غذا کون بہم پہنچائے۔ گاندھی اور نہرو مر چکے، مولانا ابوالکلام آزاد بھی اللہ کو پیارے ہو چکے، جنہیں پہلے ہی خان عبدالغفار سے کوئی غیر معمولی دلچسپی نہ تھی۔ آج کے جن پرانے لیڈروں سے پرانی یادیں وابستہ ہیں، وہ خان عبدالغفار خاں کو یا تو پہچانتے نہیں، یا پہچانتے بھی ہیں تو دور سے۔ جیسے آثار قدیمہ کو دور سے پہچانا جاتا ہے۔



تحریکِ اہلحدیث

ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی زندگی کمزور ہورہی تھی۔ اسے کتاب و سنت سے روشناس کرنا، ان پر شریعت کے منشا کو واضح کرنا، انہیں اصل اسلام سے قریب لانا ضروری تھا جسے تحریک اہل حدیث نے پورا کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ہندوستان کی تحریک اہل حدیث کے خلاف منظم طور پر بدگمانیاں پھیلائی گئیں پھر بھی یہ طے ہے کہ اگر کتاب و سنت کے سوال کو وقت پر نہ اٹھایا گیا ہوتا تو ہندوستانی مسلمان اپنے مذہب کے دو اہم ماخذوں سے بہت دور نکل چکے ہوتے۔ جہاں انہیں لوٹانا آسان نہ ہوتا۔ ہندوستانی مسلمان مذہباً حنفی تھے اور اگرچہ حنفیت دیگر مذاہب کے اعتبار سے انتہائی محتاط قدم کہی جاسکتی ہے۔ پھر بھی فقہ حنفی آگے چل کر کچھ ایسی فقہی موشگافیوں کا شکار ہوچکی تھی کہ مذہب کی سادگی ختم ہونے کے قریب آرہی تھی۔

تحریک اہل حدیث کی بنیاد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ہاتھوں پڑی جب وہ حجاز سے تعلیم مکمل کرکے ہندوستان لوٹے۔ شاہ ولی اللہ کے دور سے پہلے ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں فلسفہ علم کلام اور فقہ کا زور تھا۔ حدیث کی باقاعدہ تعلیم اور کلام پاک کی مستند تفسیروں کا گویا رواج نہ تھا۔ فقہ کی بنیاد دی اور ائمہ اربعہ کے فقہی اختلافات کی حقا اصل بنیاد پر کوئی تعلیم نہیں دی جارہی تھی۔ فقہ کہاں سے بنی، اس کے مسئلوں میں کیا کمزوریاں ہیں۔ انہیں کس طرح دور کیا جاسکتا ہے اور ان کی تطبیق کتاب و سنت سے کیوں کردی جاسکتی ہے۔ ان باتوں کی واقفیت ضروری نہیں سمجھی جارہی تھی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ہندوستان کے مخصوص حالات کے لئے ضروری سمجھا کہ یہاں کے عربی مدارس اپنے مطالعہ اور تعلیم کو وسعت دیں۔ اور اس میں گہرائی پیدا کریں تاکہ عربی مدارس سے فارغ طلبہ مذہب اسلام کے صحیح نمائندہ بن سکیں۔

تحریک اہل حدیث کو اگرچہ درس نظامیہ کے مروجہ طرز کا مقابلہ کرنا پڑا اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا پڑا۔ پھر بھی ہندوستان کے ہر حصہ میں اس تحریک کی قبولیت عام ہوئی اور ہزاروں تعلیم گاہیں مکاتب دارالحدیث وغیرہ قائم ہوئے۔ علمائے اہل حدیث نے مناظرے کئے، ہزاروں کتابیں لکھی گئیں غلط رسوم کے خلاف جہاد کیا گیا۔ ہندوستانی مسلمان اپنی تقریبات ولادت و وفات اور زندگی کے اور بھی کئی مرحلوں پر مذہب اسلام کے دیئے ہوئے قطعی طریقے بھول بیٹھے تھے۔ ان کی اصلاح تحریک اہل حدیث نے کی۔ ہندوستان کے بعض حصوں میں جہالت کے سبب ستاروں کے اثرات، جنتر منتر، بھوت پریت، جن، دیوی دیوتا، ارواح بد کا اثر بڑھ رہا تھا۔ جو تحریک اہل حدیث کے اثر سے کم ہوا۔ مسجدوں کے طاق میں چڑھاوے شروع ہو گئے تھے۔ شادی بیاہ سے پہلے کچھ غلط رسمیں معاشرہ کی جان تھیں۔ شادیوں کے بعد نئے جوڑے کچھ حماقتوں، خوف و خطرہ اور تو ہمات کا شکار بنائے جاتے تھے، ہاتھ دکھانے کا مرض عام ہوتا چلا جارہا تھا۔ اور لوگ اسلام کے دیئے ہوئے سہل الحصول اور آسان طریقۂ زندگی، طریقۂ عبادت، یقین محکم اور خوف خطرہ سے دور محسوس باتوں سے دور ہوتے چلے جارہے تھے۔ تحریک اہل حدیث نے دل و دماغ کا تزکیہ کیا۔ اسے صفائی، اصلاح، پاکیزگی اور جلا بخشی۔ تحریک اہل حدیث ہندوستان میں کتاب و سنت کی ترویج و اشاعت کا ذمہ دار بن کر آئی۔ اس تحریک نے اپنے سیاسی دور میں بنگال سے لے کر سرحد تک کے مسلمانوں کو ایک کلمہ ایک نعرہ ایک جھنڈہ اور ایک مقصد کے تابع لاکھڑا کیا۔ ہزاروں مراکز قائم ہوئے، فوجی چھاؤنی اور فن حرب کی تربیت کیلئے مراکز قائم ہوئے۔ جائیدادیں اس مقصد کے لئے وقف کی گئیں۔ رابطہ قائم کرنے کے لئے بیڑوں کی قطاریں خلیج بنگال تک حرکت میں لائی گئیں۔ بیعت جہاد لی گئی لوگوں نے ہجرتیں کیں اور انگریز سامراج سے ٹکر لینے کی جس فیصلہ کن تاریخ کی داغ بیل ڈالی وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ جدوجہد آزادی کی تاریخ آج لوگ کانگریس سے شروع کرتے ہیں۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا پہلا دور ختم ہوچکا تھا جب کہ انڈمان کے قیدیوں کی رہائی کا فیصلہ الہ آباد ہائی کورٹ نے کیا۔

تحریک اہل حدیث نے سیاسی دور میں جائیداد کی عظیم قربانی کی۔ لاکھوں علماء دار پر چڑھا دیئے گئے۔ کتنے بے وطن ہوئے۔ بہتوں نے سرحدی علاقوں میں جاکر پناہ لی۔ جو آج بھی مذہب اسلام کی سادہ زندگی کے ترجمان ہیں ۱۸۵۷ء کے بعد اگرچہ تحریک اہل حدیث کمزور پڑگئی اور بعد کے دور میں کچھ لوگ لادینیت کیونزم چکڑالویت اور انکار حدیث کے شکار ہوئے لیکن اس تحریک کی یادگاریں اس کی بنائی ہوئی مساجد ان کی سادگی، مدارس اور ان کی مقصد پسندی، کتاب و سنت پر عمل کی کوشش، تحریک اہل حدیث کی قائم کردہ چاندماری کی جگہیں، مجاہدین اسلام کے قرنطینہ کی جگہیں۔ گنگا و جمنا میں ان کے گذرنے اور گھاٹ پر قیام کرنے کی تاریخی یادگاریں اس بات کی شاہد ہیں کہ یہ تحریک ایک عظیم سیاسی اور مذہبی جہاد کے لئے وجود میں لائی گئی ـــ اگرچہ اس تحریک سے بھی وابستہ کچھ لوگ برطانوی سامراج سے سمجھوتہ کر بیٹھے اور سلف کی تاریخ بھلادی۔ اور آج کے بہت سے محدثین اس انقلابی تاریخ سے واقف بھی نہیں۔

برطانیہ کے لئے سیاسی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے تحریک اہل حدیث عظیم ترین خطرہ تھی۔ اور عجب اتفاق کہ وہ اس خطرہ کو ہٹانے میں کامیاب ہو گیا ورنہ برصغیر ہندوپاک، ایشیاء پر برطانوی سامراج کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر دیا جاتا۔ اگرچہ تحریک کچھ روز اور باقی رہ جاتی۔ صرف سرحدی علاقوں کو اس تحریک سے وابستہ مجاہدین نے برطانوی سامراج کے اثرات سے محفوظ رکھا۔ ورنہ انگریزوں کا فتنہ سارے ایشیا میں پھیلا اور اس کی کوئی کاٹ نہیں کی جا سکی۔

تحریک اہل حدیث عظیم جانی مالی قربانی، ریاضت، استحکام، فیصلہ، رازداری، رسوم کی اصلاح۔ سیاسی ایکتا، ایک جھنڈا، ایک نعرہ اور ایک کلمہ کے گرد اکٹھا ہونے، سرفروشی، حرکت وعمل اور جاں باز مجاہدین کی چھوڑی ہوئی ایک تیغ یاد ہے جو دلوں کو تڑپا کر رکھ دیتی ہے اور انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہاں گئے وہ لوگ؟

اس تحریک نے ہزاروں علما، فضلا، محدثین، مناظر، حدیث و قرآن سے متعلق کتب تفاسیر، رسالے اور پمفلٹ چھوڑے۔ تحریک اہل حدیث کے سیاسی دور کے جاں باز و صاحب عزیمت رہنما آج بھی کچھ یورپی مفکرین اور سیاستدانوں کے لئے ایک سوالیہ بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کی تاریخیں ترتیب دی جا رہی ہیں۔

اس تحریک کو بڑھاوا دینے، پھیلاؤ اور وسعت بخشنے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شاہ صاحب کے کچھ ہمعصر اور بالخصوص شاہ صاحب کے خلفاء کا بہت بڑا ہاتھ ہے جس کا ایک سرسری جائزہ درج ذیل ہے۔

ہندوستان میں تحریک اہل حدیث کے بانی مبانی کی حیثیت سے شاہ محمد فاخر صاحب محدث کا نام بھی مشہور رہے جو شاہ ولی اللہ کے ہمعصر تھے۔ حجاز میں تعلیم پائی۔

عبدالوہاب نجدی ان کے استاد بھی تھے اور ہندوستان میں تحریک وتعلیم کا سرچشمہ بھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی کہے جا سکتے ہیں۔ اور تحریک اہل حدیث کا ایک اہم ستون۔

شاہ ولی اللہ اور شاہ فاخر صاحب محدث حجاز سے درس حدیث لے کر ہندوستان لوٹے۔ عمل بالحدیث کا پرچار کیا۔ تحریریں لکھیں جن پر آگے چل کر مولانا اسماعیل شہید کے دور میں کھل کر عمل ہوا۔ مولانا سید احمد بریلوی نے بھی اگرچہ بظاہر حنفی تھے اپنے وقت میں عمل بالحدیث پر زور دیا اور تحریک اہل حدیث کو طاقتور بنانے میں مدد دی۔

دلی۔ دلی میں جو حضرات تحریک اہل حدیث کو آگے بڑھانے میں پیش پیش تھے اس میں شاہ ولی اللہ صاحب کے خلفاء کا نام سرفہرست ملتا ہے۔ ان میں مولینا عبدالحی بڑہانوی، مولینا محمد یوسف بھیروی، شاہ محمد اسحاق، شاہ محمد یعقوب حکیم مومن خاں (شاعر)، عبداللہ خاں علوی کے نام خاص طور پر لئے جاتے ہیں۔

یو۔ پی۔ یوپی علاقہ قنوج میں سید اولاد حسن قنوجی (شاہ عبدالعزیز محدث کے شاگرد و خلف جو شیعہ سے سنی ہوئے) اور نواب سید صدیق حسن صاحب کے نام ملتے ہیں جنہوں نے تحریک اہل حدیث کو بڑھاوا دیا۔ بستی میں سید جعفر علی نقوی کی کوششوں کے نتیجے میں یہ تحریک پروان چڑھی۔ رام پور میں اس تحریک کو بڑھانے میں مولانا محمد علی رام پوری، مولینا سید حیدر علی کا ہاتھ ہے۔ بنارس میں مولینا محمد سعید صاحب، سہارنپور میں مولوی محمد سہارنپوری مظفر نگر میں سید نظیر صاحب، میرٹھ میں مولوی ضیاء الرحمٰن عمرپوری اور سید شوکت حسین نے تحریک کو طاقت بخشا۔

حیدر آباد۔ حیدر آباد دکن اور الہ آباد کے کچھ اطراف میں تحریک اہل حدیث کے پھیلنے میں مولوی حیدر علی صاحب اور مولینا ولایت علی صادقپوری کا نام آتا ہے۔

بہار بنگال۔ بہار و بنگال میں اس تحریک کو پھیلانے والے علمائے صادقپوری مولینا ولایت علی صاحب و عنایت علی صاحب عظیم آبادی ہیں۔ عنایت علی صاحب نے بیت المال بھی قائم کیا۔ ولایت علی صاحب حیدرآباد دکن کے اور ناگپور (سیونی نرسنگ پور (سنٹرل) میں اس تحریک کو کامیابی کے ساتھ پھیلایا۔ ان بزرگوں کے علاوہ مولینا ابراہیم صاحب اروی۔ مولینا شمس الحق صاحب ڈیانوی، مولینا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی، مولانا یوسف، مولانا حسن الحق پھلواروی شاہ محمد علی پھلواروی، اور حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری کے نام بھی خاص طور پر لئے جاتے ہیں۔

پنجاب۔ پنجاب میں تحریک اہل حدیث شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خلفاء نے پھیلائی۔ سید احمد صاحب کے خلفاء کا بھی خاص تذکرہ ملتا ہے۔ افغانستان کے خلیفہ مولوی حبیب اللہ صاحب قندھاری۔ سرگرم علمائے افغانستان ان کے خلفاء مولوی عبیداللہ غزنوی، مولوی غلام رسول صاحب ساکن قلعہ میہاں سنگھ ضلع گجرانوالہ سید امیر صاحب یاغستانی، حافظ محمد بن بارک اللہ وغیرہم کا نام قابل ذکر ہے۔ حافظ عبدالمنان صاحب محدث غلام علی صاحب، غلام حسنی سیالکوٹی کے نام بھی خاص طور سے لئے جاتے ہیں۔

راجستھان۔ ٹونک میں نواب وزیرالدولہ سید احمد شہید کے خلیفہ تھے۔ تحریک اہل حدیث سے وابستہ مجاہدین کا قافلہ بالاکوٹ کے سانحہ کے بعد یہیں آکر فروکش ہوئے سید احمد شہید کی اہلیہ کی سواری کا نواب صاحب نے استقبال کیا۔ اور ٹونک میں ٹھہرایا۔ راجستھان، جے پور، جودھ پور مارواڑ میں یہ تحریک اسی قافلہ کے مجاہدوں نے پھیلائی۔

کشمیر۔ کشمیر میں شاہ مولوی حسن صاحب، مولینا انور شاہ شوپیانی۔ غلام رسول صاحب اور قلعہ والوں کے اثر سے تحریک اہل حدیث جموں و کشمیر میں پروان چڑھی، اس سلسلہ میں مولوی فتح علی صاحب، مولوی امیر علی صاحب مولوی عمرالدین صاحب، شیخ شاہ محمد مرحوم، میاں لال دین، میاں فیروز الدین، مولوی کرم الدین صاحب کے نام خاص طور سے لئے جاتے ہیں۔

سرحد و پشاور۔ سرحد و پشاور میں عبداللہ صاحب غزنوی کے مریدین

دلی کے چند قومی کارکن جن سے دلی کی شان تھی

دلّی کے چند مخلص قومی کارکن جنھوں نے اپنے وقتوں میں بڑی قربانیاں دیں، کانگریس کی ہر طرح سے مدد کی اور خاموشی کے ساتھ تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں سرگرم رہے ہیں۔ دلی میں کانگریس کا جنم داتا اور پشت پناہ بھی کہا جا سکتا ہے جنکے نام کانگریس تنظیم سے کبھی نہیں ہٹائے جا سکتے اور جن کی قدردانی آج بھی مخلص کارکنوں میں حسب دستور باقی ہے انکا مختصر حال درج ذیل ہے۔

لالہ رگھونندن سرن

لالہ پیارے لال اینڈ سنس والوں کے صاحبزادہ تھے۔ کشمیری گیٹ میں موٹروں کی بہت بڑی فرم کے مالک رہے۔ تحریک آزادی کے سلسلہ میں کبھی جیل تو نہیں گئے لیکن کانگریس کی درپردہ ہر طرح امداد کی۔ موٹر، ٹرک اور گاڑیوں کی جہاں کہیں ضرورت پیش آتی۔ لالہ رگھونندن سرن اسکی پیشکش کیلئے سب سے آگے نظر آتے۔ انتقال ہوائی حادثہ میں مدراس کے قریب ہوا۔ انتہائی خلیق ملنسار دوست نواز تھے اور کانگریس کی ہر تقریب میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ تحریک آزادی میں کھل کر حصہ لیا۔ اخبارات اور انجمنوں کی مالی امداد کی۔ کانگریس کے سب ہی سرکردہ لیڈر انکے ساتھی تھے۔ شہر میں نہایت ہردلعزیز تھے۔ علم و ادب سے بھی شوق تھا۔

جوگل کشور کھنّہ

انکے والد بزرگوار گورنمنٹ ہائی اسکول کشمیری گیٹ جہاں آج پالی ٹیکنیک ہے کے سکنڈ ماسٹر تھے۔ کھنہ جی نے تحریک آزادی کے سلسلہ میں بڑے کام کئے۔ کئی بار جیل بھی گئے۔ انتہائی ملنسار مخلص اور دوست نواز رہے۔ ۴۲ء میں انکی تلاشی جاری تھی۔ کچھ مدت روپوش رہے۔ پوشیدہ طور پر کانگریس کے لئے ناقابلِ فراموش کام کئے۔ کہیں کہیں نمایاں بھی رہے۔ آزادی کے بعد سرکاری ملازمت بھی کی۔ اِن دنوں کناٹ سرکس میں کہیں مقیم ہیں۔ ببر بازار کے نگراں ہیں۔

ستیہ وتی دہلوی

ارونا آصف علی کی طرح کانگریس کی سرگرم کارکن تھیں۔ بڑے جوش و خروش اور دلیری کے ساتھ کام کیا۔ برطانوی حکومت انکی گرفتاری کے پیچھے پڑی رہی لیکن کبھی گرفتار نہیں کرسکی تعلیم یافتہ اور انتہائی قابل قدر ورکر تھیں۔ سوامی شردھانند آپکے والد بزرگوار تھے۔ کانگریس کے لئے کئی بار جیل بھی گئیں۔ کانگریس کے جلسوں میں دور دور جاکر تقریریں کیا کرتی تھیں۔ ۴۲ء میں گرفتار کی گئیں۔ کانگریس سے آپ شروع ہی سے وابستہ رہیں۔ کانگریس کے کاموں کے سلسلہ میں کافی شہرت حاصل کی۔ عورتوں میں انتہائی سمجھدار با اخلاق ورکر تھیں۔ آسودہ حال گھرانہ سے تعلق تھا۔ اکثر و بیشتر امداد بھی کیا کرتی تھیں۔ مقامی کانگریس ورکنگ کمیٹی کی آسودہ بھی رہیں۔ انہیں دلی کی "جان آف آرک" کہتے تھے۔

لالہ شنکر لال۔

بہت پرانے کانگریسی تھے۔ انکی تقریریں جوش و ولولہ سے

بڑی ہوا کرتی تھیں۔ کانگریس کو چار چاند لگائے۔ سالدار گھرانہ سے سروکار رکھتے تھے۔ انشورنس کمپنی بھی قائم کی۔ دلی کانگریس کے صدر بھی رہے۔ ۴۲ء کے اندولن میں گرفتاری کا وارنٹ جاری تھا۔ لالہ جی کچھ مدت کیلئے روپوش رہے۔ برطانوی حکومت کے سخت خلاف رہے اور اس سلسلہ میں جاپان گئے۔ جہاں سُوباش چندر بوس کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کے لئے کام کیا۔ دلی میں اعلیٰ درجہ کی خدمات انجام دیں۔ لال قلعہ میں ۴۲ء کے تبدیلیوں کے ساتھ رہے۔ انتہائی مخلص ہمدرد سمجھدار اور باحوصلہ کارکن تھے۔ ۲۱ء کا ذکر ہے کہ ایڈورڈ پارک میں بڑی جوشیلی تقریر کی اور برطانوی سی آئی ڈی کو کھری کھری سنائی اور کہا کہ ہم تو ملک کی آزادی کیلئے سربکف ہیں اور یہ لوگ ہماری تقریروں اور بیانات کو غلط انداز میں پیش کیا کرتے ہیں"۔

ان کی سرپرستی میں ایک اخبار دلی سے نکلتا تھا جس کا نام "ڈیلی کانگریس" تھا۔ مولانا عارف ہسوی اخبار کے اڈیٹر تھے۔ ادارہ تحریر میں کامریڈ منصور (کمیونسٹ) بھی تھے۔

مولانا عارف ہسوی

دلّی کے ممتاز کانگریسی لیڈر تھے۔ کبھی مولانا محمد علی کے اخبار روزنامہ "ہمدرد" اور اس کے بعد روزنامہ کانگریس کے اڈیٹر تھے۔ جن لوگوں نے ان کے ساتھ کام کیا، ان میں سعید انصاری صاحب (جامعی)، سید محمد جعفری صاحب (مالک و مدیر ملت) ڈاکٹر سعید بریلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

صوم و صلوٰۃ کے معاملہ میں اللہ ہی ان کا رازدار تھا، لیکن روز پردہ جو مضامین لکھتے تھے، اس زمانہ میں کوئی نہیں لکھ سکتا تھا۔ رسالہ "مولوی" میں ان کے جو مضامین چھپتے تھے، وہ آج بھی زندہ اور تازہ ہیں۔ پان بہت چباتے تھے۔

مولانا عبداللہ آٹے والے

قومی زندگی کی آن تھے۔ بلی ماروں میں ان کی بہت بڑی دکان تھی، مسیح الملک حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری سے برابری کا معاملہ تھا۔ گفتگو بڑی زوردار کرتے تھے۔ بات بات پر سیاسی صفیں پلٹ دینا، ان کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

- - - - - - - - - - - -

مولانا منشی عبدالقدیر

اگلے وقتوں کے یادگار ہیں۔ قوم کی خاطر پوری زندگی خرچ کر ڈالی۔ آجکل صحت اچھی نہیں ہے۔ خدا انہیں تادیر سلامت رکھے۔ عمر کوئی ۸۰/۸۵ کی ہوگی۔

ان کا ذکر ابھی ادھورا ہے، کبھی پورا کیا جائے گا۔

بقیہ تحریک اہلحدیث

سید احمد صاحب کے خلفا اور بعد کے دور میں عبداللہ صاحب کے مریدوں روٴساء اور ارباب عبدالرؤف کے اثر سے یہ تحریک مقبول ہوئی۔

بمبئی۔ بمبئی اور سنٹرل انڈیا میں اس تحریک کو کامیاب بنانے میں مولینا ولایت علی صادق پوری نے ہاتھ بٹایا۔ بہار، بنگال سنٹرل انڈیا، حیدرآباد اور بمبئی میں اس تحریک کو آگے بڑھانے میں سرفہرست مولینا ولایت علی صاحب کا نام لیا جاتا ہے۔

گرچہ تحریک اہلحدیث کا ہندوستان میں اس وقت کوئی مستقبل نہ رہا جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس تحریک کا سیاسی رخ ختم ہوچکا پھر بھی اصلاح رسوم، شرک و بدعات سے دور کرنے اور صحیح کتاب و سنت کیلئے یہ تحریک ابھی بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔

تحریک اہلحدیث ۱۸۶۰ء کے بعد آمین بالجہر، رفع یدین اور کچھ مخصوص مسائل کے دائرہ میں گھر کر رہ گئی اور مذہب و سیاست سے جو بڑا اسرو کار اس نے قائم کیا تھا وہ ختم ہوا اور اس وقت یہ تحریک ایک فرقہ بن کر رہ گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے اسلاف نے جو نعرہ اور جو مقصد اس تحریک کو بخشا تھا آج بھی وہ اسی طرح قائم ہے۔ عیدگاہوں، مساجد، مکاتب، مدرسوں کو علیحدہ کرنا اسلاف کا ہرگز مقصد نہ تھا اور نہ تحریک اہل حدیث کے بانی کچھ مخصوص مسائل تک اس تحریک کو لاکر ختم کر دینا چاہتے تھے۔ تحریک اہل حدیث ایک عظیم جہاد ایک ریاض ایک عظیم قربانی ایکتا اور جذبہ کے لئے قائم کی گئی تھی جو اگر باقی رہتی تو ہندوستان میں خلافت راشدہ کے طرز کی ایک حکومت کی بنیاد پڑ سکتی تھی اور ہندوستانی مسلمان مذہب کے عجمی تصور سے ہمیشہ کے لئے نجات پا جاتے۔ اس تحریک نے صرف مسلمانوں میں کام نہیں کیا بلکہ کئی جگہ گاؤں اور بستیوں کو حلقۂ اسلام میں لائی۔ اندھیرے کو اجالا دیا اور سرد مہری کی طرف مائل مسلم قوم کو حرکت و عمل بخشا۔ اس تحریک کا بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو باطل کے خلاف احتجاج کرنے اور صف آرائی کرنے کا سلیقہ آیا۔

دلی کے ہندوستانی چیف کمشنر

جناب امن دہلوی

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد سے پچھلے سال تک یعنی بیس سال میں دلی کے سات ہندوستانی چیف کمشنر ہوئے ہیں صاجزادہ خورشید احمد خاں سے شروع ہو کر یہ سلسلہ شری آدینہ ناتھ جھا پر ختم ہوا جن کے دور میں چیف کمشنر کے عہدہ کی جگہ لفٹنٹ گورنر کا عہدہ وجود میں آیا۔ اور اب وہ دلی کے پہلے لفٹنٹ گورنر ہیں مجھے چونکہ ان ساتوں چیف کمشنروں سے سابقہ رہا ہے۔ لہٰذا کاروانِ وطن کے لئے اُن کے مختصر خاکے پیش کر رہا ہوں۔

صاجزادہ خورشید احمد خاں آئی سی ایس اتنا حسین و جمیل کوئی چیف کمشنر نہیں آیا۔ یہ صاجزادہ آفتاب احمد خاں کے صاجزادے تھے۔ جمال کے ساتھ جلال بھی تھا۔ آئی سی ایس پاس کرنے کے بعد مجسٹریٹ سے لے کر کمشنر تک مختلف عہدوں پر رہ چکے تھے ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے دوران یہ دلی کے چیف کمشنر مقرر ہوئے عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ مسٹر مہندر سنگھ رندھاوا ڈپٹی کمشنر تھے اور یہ چیف کمشنر لیکن سردار پٹیل (ہوم منسٹر حکومت ہند) تک مسٹر رندھاوا کی رسائی زیادہ تھی۔ وہ روز ایک بار مل آتے تھے اور کبھی کبھی دو بار۔ لیکن انھیں دو دو روز تک ملاقات کا موقع نہ ملتا تھا۔ فرقہ پرست اخباروں نے دلی میں طوفان مچا رکھا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ قتل و خونریزی کی فضا پیدا کرنے میں ان کا بہت کچھ ہاتھ تھا۔ جب مہاتما گاندھی کی شہادت ہوئی تو سردار پٹیل بھی گھبرائے وہ یہ تو جانتے تھے کہ فرقہ پرست ہندو گاندھی جی کو پریشان رکھیں گے لیکن اتنا نہ سمجھتے تھے کہ ان کی جان ہی لے لیں گے۔ دلی صوبہ کانگریس کمیٹی نے حتی الوسع فرقہ پرستوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور اس کے اکثر ارکان سردار پٹیل کے رویہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ گاندھی جی کی شہادت کے بعد یہ طے ہوا کہ اخبارات کا محکمہ ڈپٹی کمشنر کے بجائے چیف کمشنر اپنے ہاتھ میں لے لیں چنانچہ فروری کے شروع میں اس پر عمل ہوا اور صاجزادہ صاحب نے مجھے پریس افسر مقرر کیا۔ میں نے پچھلے اخباروں کو دیکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا۔ دو روز صبح سے آدھی آدھی رات تک اخباروں کے ہزاروں صفحے پڑھ کر میں نے صاجزادہ صاحب کو کیفیت بتائی۔ انھوں نے حکومت ہند سے گفتگو کی آخر ۹ فروری ۱۹۴۸ء کو ہوم سکریٹری حکومت ہند کی صدارت میں میٹنگ ہوئی جس میں میں نے قابل اعتراض تراشے پیش کئے جس کے نتیجے کے طور پر دس ہندو اور سکھ اخباروں کے خلاف ایکشن لیا گیا۔ صاجزادہ صاحب اس سے بہت خوش ہوئے اور امن و قانون کے معاملوں میں بھی مجھ سے کبھی کبھی مشورہ کرتے اور اپنی مجبوریاں بتاتے تھے۔ چونکہ یہ سرکاری معاملات تھے لہٰذا میں ان کا تفصیل سے ذکر نہیں کرنا چاہتا البتہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت ہند نے صاجزادہ صاحب کے ساتھ انصاف نہیں کیا کچھ مہینوں بعد وہ اور رندھاوا صاحب دونوں تبدیل ہو گئے۔ میں نے صاجزادہ صاحب کو فرقہ پرستی کے جذبات سے بالاتر پایا۔ اگر حکومت ہند اُن کا پورا ساتھ دیتی تو دلی کا بلوہ زیادہ کامیابی سے فرو ہو سکتا تھا۔ اُن کو آئی اے ایس کالج کا پرنسپل بنا کر بھیج دیا گیا۔ چند مہینے بعد حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے علی گڑھ میں موٹر چلاتے چلاتے اُن کا انتقال ہو گیا

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

شری شنکر پرشاد آئی سی ایس

صاجزادہ صاحب کی جگہ اجمیر کے چیف کمشنر شری شنکر پرشاد مقرر ہوئے۔ رنگین مزاج بیدار مغز ادب دوست معاملہ فہم اور حسین انسان۔ اِن کے ساتھ میں کئی حیثیتوں سے وابستہ رہا جب یہ چیف کمشنر ہو کر آئے تو میں پریس افسر تھا پھر انھیں کے دور میں دلی اسمبلی کا ممبر ہوا ڈپٹی سپیکر ہوا اور پھر منسٹر ہو گیا یہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک چیف کمشنر رہے۔ ان کے دور میں زخم خوردہ اخباروں کے مجھ پر حملے رہے مگر میں محفوظ رہا۔ انھیں کے دور میں دلی اسمبلی بنی جسے امن و قانون کے معاملہ میں کوئی دخل نہ تھا یہ محکمے براہ راست چیف کمشنر کے ماتحت تھے لیکن انھوں نے اسمبلی کے اجلاس میں یہ اعلان کیا کہ میں عملاً اس تفریق کو روا نہ رکھوں گا چنانچہ چیف منسٹر چودھری برہم پرکاش کو انھوں نے پولیس گارد سے سلامی دلوائی اور میں بہ حیثیت وزیر قانون برابر مجسٹریٹوں کی عدالتوں کے متعلق اسمبلی میں جواب دیتا رہا۔ شنکر پرشاد صاحب کی گفتگو یوں بھی بہت دلچسپ ہوتی تھی لیکن جب جوش صاحب ہوں پھر تو کہنا ہی کیا ہے۔ میں تھا تو زاہد خشک مگر ان صحبتوں میں اکثر شریک رہتا تھا جوش صاحب کی شاعری پر بھی کبھی کبھی تبصرہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ شنکر پرشاد صاحب نے حضرت جوش سے فرمایا کہ آپ کی شاعری میں اس شدت سے

خدا کے خلاف لعن طعن ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے خدا آپ کے ذہن پر
چھایا ہوا ہے۔ جب میں پولیس افسری سے استعفیٰ دے کر اسمبلی کا الکشن
لڑنے پر تیار ہوا تو انھوں نے مجھے منع کیا کہنے لگے کہ امن صاحب الکشن
لڑنا آپ جیسے سیدھے سادے آدمیوں کا کام نہیں۔ میں نے عرض کی کہ
میں نے درخواست نہیں دی تھی کانگریس نے حکم دیا ہے۔ اب تک اس کا
حکم مانتا رہا ہوں اب ٹالنا مشکل ہے۔ انھوں نے بادل ناخواستہ استعفیٰ
۲ دسمبر ۱۹۵۱ء کو منظور کر لیا۔ ۵ دسمبر کو میں نے کاغذات نامزدگی داخل کئے
۱۴ جنوری ۱۹۵۲ء کو انتخاب ہوا اور میں کامیاب ہو گیا۔ انھوں نے مجھے
مبارکباد دی اور کہا کہ میرے لئے آپ کی یہ کامیابی خلاف امید ہے
چار مہینے بعد میں ڈپٹی اسپیکر ہو گیا اور ۱۹۵۲ء کے آخر میں منسٹر جب میں حیثیت
منسٹر ملنے گیا تو وہ مجھے باہر پہنچانے آنے لگے میں نے منع کیا اور کہا کہ میں تو آپکا
ماتحت افسر رہا ہوں مگر انھوں نے کہا کہ اب مجھے آپ کو موجودہ حیثیت
سے اعزاز دینا چاہیئے۔ مشاعروں میں شنکر پرشاد صاحب بہت دلچسپی
لیتے تھے۔ ایک مشاعرہ میں لاؤڈ اسپیکر فیل ہو گیا شاعر کی آواز کمزور تھی
کچھ شعراء نے کہا حضرت مصرع اٹھائیے شنکر پرشاد صاحب نے فرمایا کہ شاعر
کو ہی کیوں نہ اٹھا دیجئے۔ ڈپٹی کمشنر پنڈت راجیشور پرشاد سے انکے تعلقات
بہت اچھے تھے۔

شری آنند ناتھ پنڈت آئی سی ایس

۱۹۵۵ء کے وسط میں مسٹر پنڈت نے شری شنکر پرشاد سے چارج لیا
یہ بھی اجمیر کے چیف کمشنر کے عہدے سے آئے تھے ان کا مزاج شنکر پرشاد صاحب
سے قدرے مختلف تھا۔ شنکر پرشاد صاحب کو اردو فارسی کا ذوق زیادہ
تھا انھیں ہندی اور سنسکرت کا انگریزی ادب کے مطالعے کا شوق دونوں
کو تھا پنڈت صاحب اپنے کام میں محنت بہت کرتے تھے۔ جب یہ چیف کمشنر
ہوئے تو ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو ہوم منسٹر تھے وہ ان کے کام سے بہت خوش
تھے لیکن مقامی کانگریسی لیڈر کچھ ناراض تھے میں دونوں جانب کی باتیں
سنتا تھا لیکن اپنی رائے کسی طرف نہ دیتا تھا ۱۹۵۵ء کے شروع میں پنڈت
گووند بلبھ پنتھ حکومت ہند کے ہوم منسٹر ہو کر آ گئے۔ اب کچھ ایسی صورت
تھی کہ دلی کے چیف منسٹر چودھری برہم پرکاش مسٹر پنڈت اور پنڈت
گووند بلبھ پنت دونوں ہی سے ناراض تھے ادھر اسمبلی کانگریس پارٹی میں
بھی آپس میں کشمکش چل رہی تھی۔ شری جگ پرویش چندر اور ان کے ساتھی
چودھری برہم پرکاش کو چیف منسٹری سے ہٹانا چاہتے تھے۔ چودھری صاحب
کو یہ محسوس ہوا کہ جیسے ہوم منسٹر پنڈت گووند بلبھ پنت چیف کمشنر مسٹر پنڈت
اور ڈاکٹر سوشیلا نیر وزیر صحت دلی سب میرے خلاف ہیں جو کچھ بھی ہو آخر
چودھری برہم پرکاش کی وزارت فروری ۱۹۵۵ء میں ٹوٹ گئی اور سردار
گورمکھ نہال سنگھ جو اسمبلی کے اسپیکر تھے چیف منسٹر ہو گئے۔ چودھری برہم پرکاش
چیف منسٹر سے منسٹر رہ گئے اور میں منسٹر سے ایم ایل اے رہ گیا۔ اس کے بعد
چودھری برہم پرکاش اور ان کے ساتھیوں نے مسٹر پنڈت سے بیر سا باندھ
لیا تھا لیکن ۱۹۵۶ء میں دلی اسمبلی ہی ٹوٹ گئی۔

وہ شاخ ہی نہ رہی جس میں آشیانہ تھا

مسٹر پنڈت ایک کشمکش سے چھوٹے اب وہ براہ راست مرکزی حکومت
کے مشورہ سے کام کرتے تھے۔ پہلی نومبر کو اسمبلی ٹوٹی آئندہ مہینہ یعنی دسمبر ۱۹۵۶ء میں
میرے ساتھی ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ اور میں دونوں حکومت دلی کے ایڈوائزر ہو گئے
غالباً یہ مسٹر پنڈت کو گوارا نہ تھا کیونکہ پنڈت جی نے اُن سے پوچھے بغیر یہ انتظام کیا تھا
پھر بھی وہ ہم دونوں سے تعاون کرتے رہے ۱۹۵۹ء کے آخر تک وہ اس عہدے
پر رہے اُن کی صاف گوئی کبھی کبھی لوگوں کو ناگوار گذر جاتی تھی۔ دسمبر ۱۹۵۹ء میں شری
بھگوان سہائے نے اُن سے عہدے کا چارج لیا۔

شری بھگوان سہائے آئی سی ایس

پچھلے تینوں چیف کمشنروں کی طرح یہ بھی یو پی (اُتر پردیش) کے تھے پہلے ان کا
خاندان امروہہ میں تھا پھر ان کے والد نے چندوسی میں قانونی پریکٹس شروع کی وہیں انکی
تعلیم شروع ہوئی دلی میں چیف کمشنر مقرر ہونے سے پہلے یہ نیپال میں سفیر تھے ان کے آنے
کے بعد چیف کمشنر کا گریڈ پہلے سے اونچا ہو گیا۔ کائستھوں کے ماتھر خاندان سے ہیں اور
تہذیب و تمدن میں کائستھوں کا ہی انداز پایا جاتا ہے۔ ان کے پیشرو پنڈت صاحب کو
تصویر بنانے کا شوق تھا یہ مصور بھی تھے اور بت ساز بھی ان سے پہلے یا ان کے بعد جتنے
چیف کمشنر آئے ان میں سب سے زیادہ لیڈر قسم کے یہی تھے۔ پنڈت گووند بلبھ پنت کی
نظروں میں بھی بہت چڑھے ہوئے تھے۔ ان کے دور میں ایک بڑا [illegible] یہ
آیا تھا کہ [illegible] ملازموں نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے ہڑتال کرنے
کی ٹھانی [illegible] ان سے اور پنت جی سے مشورہ ہوا میں تعلقات نامہ کمیٹی کا صدر تھا
اور لالہ شام ناتھ دلی کارپوریشن کے میئر تھے۔ ہم تینوں پنت جی کے پاس
گئے اور باہمی مشورہ کے بعد اس ہڑتال کی صورت میں دلی میں متبادل انتظام
کرنے کا فیصلہ ہوا چنانچہ نو سو آدمی میری کمیٹی نے اور سولہ سو آدمی کارپوریشن نے
آنریری کام کرنے کے لئے تیار کئے۔ میں نے اس زمانہ میں بھگوان سہائے صاحب
کے سلیقۂ کار کو دیکھا اور یہ معلوم ہوا کہ وہ جتنے حسنِ انتظام کے ماہر ہیں اتنے
ہی سیاست کے بھی۔ آخر کار یہ ہڑتال فیل ہو گئی۔ پنڈت گووند بلبھ پنت نے
ان کے سلیقۂ کار کی بہت تعریف کی شری بھگوان سہائے میں بذلہ سنجی کا مادہ
بہت ہے انھوں نے اپنے طریق کار سے ہر پارٹی کو خوش رکھا کانگریس کو بھی اور
جن سنگھ کو بھی کمیونسٹوں کو بھی اور سوشلسٹوں کو بھی شاید کوئی اور چیف کمشنر
ایسا نہ تھا جس کے لئے کانگریس اور جن سنگھ دونوں نے یہ چاہا ہو کہ ابھی انھیں
یہیں اور رکھا جائے۔ چودھری برہم پرکاش خاص طور سے ان سے خوش تھے
یہی کیفیت پروفیسر ملراج مدھوک کی تھی۔ چودھری برہم پرکاش سے ملے تو

انھیں دلّی کا یہ ڈر رہا۔ پروفیسر ملراج مدھوک سے ملے تو ان کے چہرے پر چمک کا خاص طور پر ذکر کیا ادبی آدمی ملا تو ادب کی بات کی اور کاروباری ملا تو کاروبار کی۔ جس طرح شری شنکر پرشاد کو سردار پٹیل کے گذر جانے پر میں نے بہت غمگین دیکھا تھا ویسے ہی پنت جی کے گذر جانے پر انھیں پایا ۱۹۶۳ء کے آخر میں ہماچل پردیش کے لفٹننٹ گورنر ہو کر گئے جہاں پہلے چیف کمشنر تھے اور اس کے بعد کیرالہ کے گورنر ہوئے اب کشمیر کے گورنر ہیں۔

شری دھرم ویر آئی سی ایس

شری بھگوان سہائے سے شری دھرم ویر نے چارج لیا ان کے والد راجہ جوالا پرشاد پہلے ہندوستانی چیف انجینیر رہے تھے اور یہ پنڈت جی کے پرائیویٹ سکریٹری رہ چکے تھے جب چیف کمشنر ہو کر آئے تو محکمہ آبادکاری کے سکریٹری تھے اور شری مہر چند کھنہ سے وابستہ تھے یہ یو پی کے ضلع بجنور کے ہیں طور طریق دلی کے ہیں جتنے چیف کمشنر آئے سب سے چھوٹے قد کے یہی تھے دلی کا کوئی اور چیف کمشنر اتنی پرائیویٹ تقریبوں میں شریک نہ ہوا تھا جتنی شرکت انھوں نے کی کسی کو مایوس نہ کرتے تھے اور تقریب میں پہنچنے کے بعد کسی کو یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ میں کوئی بڑا افسر ہوں برابر کے پایہ سے بات چیت ہوتی اور برابر کا مذاق ہوتا۔

خوش قسمتی سے انھیں شری بوس ملک جیسا ڈپٹی کمشنر ملا بوس ملک نسلاً تو بنگالی ہیں مگر عملاً یو پی کے کیونکہ ان کے والد میرٹھ کالج میں پروفیسر تھے دونوں کی خوب بنی شری دھرم ویر نے ایک نیا سلسلہ جاری کیا یعنی وہ ہر بدھ کو سویرے براہ راست لوگوں کی فریاد سنتے تھے یہ تعداد برابر بڑھتی رہی ان کے بعد بھی جب تک چیف کمشنر کا عہدہ قائم رہا دوسرے چیف کمشنروں نے اس کی پیروی کی ان نشستوں میں میں بھی شریک ہوتا تھا اور چونکہ دھرم ویر صاحب اردو بہت کم جانتے تھے اس لئے اردو کی درخواستیں میرے سپرد کر دیتے تھے افسران متعلقہ بھی ہوتے تھے عوامی پیمانہ پر جو مسئلہ حل ہونے والا ہوتا ـــــ وہ میرے سپرد ہو جاتا ورنہ جس افسر کے محکمہ کا کاغذ ہوتا اسے ہدایت دے کر اُس کے سپرد کر دیتے اور میعاد مقرر کر دیتے کہ اتنے دنوں میں رپورٹ آجانی چاہیئے اس کارروائی کی وجہ سے بھی افسر چابک اور چوبند ہو گئے تھے پنڈت جواہر لال نہرو کی رحلت پر نہایت غمگین ہوئے کیونکہ سکریٹری کی حیثیت سے ان سے وابستہ رہ چکے تھے رفتہ رفتہ ان کی ہفتہ وار نشست چیف کمشنر کے دربار کے نام سے مشہور ہو گئی شری لال بہادر شاستری ان کے کام سے بہت خوش تھے چنانچہ جب وہ وزیر اعظم ہوئے تو چند مہینوں بعد انھوں نے ان کو اپنا کیبنٹ سکریٹری مقرر کر لیا یہاں سے یہ ترقی کر کے پنجاب کے گورنر بنے اس کے بعد گورنر بنگال ہو گئے جہاں انھوں نے خاص رول ادا کیا ہے سچ ہے۔

دیتے ہیں بادۂ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

شری وینکٹیش وشوناتھن آئی سی ایس

شری دھرم ویر نے شری وشوناتھن کو چیف کمشنری کا چارج دیا جو اس سے پہلے حکومت ہند کے ہوم سکریٹری تھے کوئی اور چیف کمشنر اتنا عالم نہیں آیا تو نہ اتنی زبانوں سے واقفیت رکھتے ہیں جن میں سے دو زبانیں غیر ملکی ہیں ایک انگریزی تو ہے ہی دوسری فرنچ یہ بہت تھوڑے دنوں یعنی تقریباً سوا سال دلی کے چیف کمشنر رہے۔ اُن کے دوران میں پاکستان اور ہندوستان کی جنگ ہوئی جس کی وجہ سے دلی میں خاص انتظامات کرنے پڑے جب تک جنگ کا سلسلہ جاری رہا یہ روزانہ افسروں کی میٹنگ کرتے تھے جس میں میں بھی شریک ہوتا تھا کبھی کبھی اخباری نمائندوں کو بھی بلا لیتے تھے اخباری نمائندے بھی ان سے بہت خوش تھے کیونکہ یہ ان کے سوالوں کا جواب بہت مفصل اور عالمانہ انداز میں دیا کرتے تھے۔ گاؤں کے معاملہ میں جتنی دلچسپی انھوں نے لی اتنی اور کسی چیف کمشنر نے نہیں لی گاؤں والے بھی ان سے بہت خوش رہے اور اب تک انھیں یاد کرتے ہیں۔ جنگ پاکستان و ہندوستان کے دوران انھوں نے مختلف پارٹیوں سے ٹریفک کے کام کے لئے والنٹیر مانگے سب سے زیادہ والنٹیر جن سنگھ نے دیئے کانگریس کے والنٹیر اس سے آدھے بھی نہ تھے جب یہ والنٹیر ٹریفک کے کام پر لگائے گئے تو کانگریس والوں کو یہ شکایت ہوئی کہ جن سنگھ کے والنٹیروں کو کیوں اس کام پر لگایا گیا لیکن مجھے اسی وقت یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ عوام میں جن سنگھ کا اثر کانگریس سے زیادہ ہو چکا ہے فوجیوں کے لئے سامان بھی جن سنگھ والے کانگریس سے کہیں زیادہ لاتے تھے ایک بار مجھ سے پوچھا کہ آپ جانتے ہیں کہ درپن آئینہ کو کیوں کہا جاتا ہے میں نہ جانتا تھا تو فرمایا کہ درپ خودبینی کو کہتے ہیں اسی سے درپن بنا ہے ایک بار میں نے پوچھا کہ بہت سے گاؤں نگلہ یا نگلی کے نام سے ہیں یاد ہیں اس کے معنی کیا ہیں تو فرمایا کہ سنسکرت میں ل اور ر کا بدل ہے اس لئے نگر سے نگل اور پھر اسی سے نگلہ یا نگلی ہو گیا اسی طرح ایک بار بتایا کہ یورپ میں جو ہنانا کہا جاتا ہے وہ ہنانا سے زیادہ درست ہے کیونکہ اصل لفظ سنان ہے اور سنسکرت میں س اور ہ کا بدل ہے۔ ایک روز گاؤں کے دورہ پر گئے تو ٹیسو کے پھول کھلے ہوئے تھے مجھے انھوں نے سنسکرت کا ایک شلوک سنایا میں نے کہا کہ میں اس کے چند لفظ تو سمجھ گیا لیکن پورا مفہوم نہیں سمجھا انھوں نے مجھے افسروں سے الگ لے جا کر بتایا کہ اس شلوک کا مطلب یہ ہے کہ بہار آگئی اور چمن کو پیٹ گئی چمن کے سینہ پر اپنے ناخنوں سے جو نشان اس نے ڈالے ہیں وہ ٹیسو کے پھولوں کی صورت میں نمودار ہوئے ہیں یہاں سے ہماچل پردیش کے لفٹننٹ گورنر ہو کر گئے اب کیرالہ کے گورنر ہیں

شب نے وجام سے گذرنی ہے

کے قائل ہیں۔

شری آدیتہ ناتھ جھا آئی سی ایس

مارچ ۱۹۶۶ء میں شری آدیتہ ناتھ جھا نے شری وشوناتھن سے عہدے کا چارج لیا اسی مہینے چاندنی چوک میں ہنگامہ ہو گیا۔ جن سنگھیوں نے جو ہڑتال کرائی تھی اس میں دکان نہ بند کرنے والے سکھوں کی دکانیں یا لوٹ لی گئیں یا جلا دی گئیں اور پھر نومبر کے مہینے میں گئو رکھشا کا جلوس نکلنے پر نئی دلی میں اتنا بڑا ہنگامہ ہوا کہ مارچ کا ہنگامہ بھی اس کے سامنے ماند پڑ گیا۔ شری جھا کے زمانے میں ہی چوتھا عام انتخاب بھی ہوا جس میں دلّی میں کانگریس کا تختہ اُلٹ گیا اور جن سنگھ کی اکثریت آگئی۔ میٹرو پولیٹن کونسل میں بھی اور کارپوریشن میں بھی

جھا صاحب کا دور ہر اعتبار سے بہت پُر آشوب رہا ہے ذاتی طور پر بہت ہنس مکھ انسان ہیں عالی خاندان بھی ہیں ان کے والد سر گنگا ناتھ جھا ملک کے مانے ہوئے سنسکرت عالموں میں سے تھے اور ان کے بڑے بھائی پنڈت امرناتھ جھا جنھیں پدم بھوشن بھی ملا تھا الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ چیف کمشنر ہونے سے پہلے جھا صاحب محکمہ نشرواشاعت کے سکرٹری تھے بڑے وجیہہ لحیم شحیم انسان ہیں مگر جسامت جتنی اچھی ہے صحت ویسی نہیں۔ سنسکرت کے عالم ہیں اور بذلہ سنج بھی۔ اکثر بدھ کے دن جب ہم لوگ جمع ہوتے تھے تو دلچسپ واقعات سنایا کرتے تھے جن میں افسروں پر بھی پھبتیاں ہوتی تھیں اور پبلک لیڈروں پر بھی گاؤں کے دوروں کا چنداں شوق نہیں اس لئے بیشتر شہر کی تقریبوں میں ہی شریک ہوتے ہیں۔ پولیس کی ہڑتال کا دور بھی انھیں کے سامنے آیا اور اب نئی دلی کا نئے سال کا ہنگامہ بھی

انھوں نے کارپوریشن کو توڑ دینے کے متعلق جو سفارش کی ہے اس سے جن سنگھ والوں کا ایک طبقہ بہت ناراض ہے لیکن حکومت ہند نے اس مراسلہ کو صیغہ راز میں رکھا ہے اگرچہ جن سنگھ کے لیڈر اس کے انکشاف کے لئے سرگرداں ہیں چونکہ میں اگست ۱۹۶۶ء کے آخر میں چیرمین محکمہ تعلقات عامہ کے عہدے سے ہٹ گیا اس لئے ان سے میری وابستگی صرف چند مہینوں رہی البتہ انترم میٹرو پولیٹن کونسل کی ممبری کا حلف انھوں نے ہی مجھے دلایا تھا پھر بہ حیثیت چیرمین میں نے اوروں کو حلف دلایا تھا۔



پھیلی ہے نگاہوں میں تیرے غم کی سیاہی
بھیگی ہوئی دیوار پہ جس طرح سے کاہی

محتاط ہوں اظہارِ محبت نہیں کرنا
واللہ قیامت ہے تیری نیم نگاہی

محسوس بھی ہوتا نہیں احساس خزاں اب
راس آئی ہے اس طرح گلستان کو تباہی

سنتا ہوں عبادت کے فضائل تو بہت ہیں
رحمت کو پسند آئی میری زود گناہی

اب چاند ستاروں کی طرف لوگ ہیں مائل
بوسیدہ خیالی ہے میری خاک پناہی

دعویٰ ہے نگار آپکا اس ماہ جبیں پر
رکھتے نہیں پیمانِ محبت کی گواہی



کو بدل دو . . . اور یہ کام حقیقت میں تم ہی کر سکتے ہو۔" (ص ۲۱۹-۲۲۰)

"بڑے بڑے معزز لوگ مجھ سے ملنے آئے" صدر ایوب لکھتے ہیں" اور کہتے ۔۔ تم چاہو تو ملک کے حالات بدل سکتے ہو، مگر تم جوکھوں میں پڑنا نہیں چاہتے . . . جوں جوں حالات خراب ہوتے گئے زیادہ سے زیادہ لوگ میرے پاس آئے اور اسی لہجہ میں گفتگو کرنے لگے۔" (ص ۹۸)۔

"[بالآخر] نقارے پر چوٹ پڑ ہی گئی"۔" اور" وہ لمحہ جس کا مدت سے انتظار تھا آخر کار آپہنچا۔ . . . ۷ اکتوبر [۱۹۵۸ء کی] . . . شام کے آٹھ بجے اسکندر مرزا نے بڑے ڈرامائی انداز میں آئین کو منسوخ کر دیا۔ سارے پاکستان میں مارشل لا کا اعلان کر دیا۔ مرکزی و صوبائی حکومتوں۔ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں کو منسوخ کر دیا۔ اور مجھے مارشل لا کا منتظم اعلیٰ مقرر کر دیا۔" (ص ۱۱۶-۱۱۷)

جنرل ایوب کے مارشل لا کا منتظم اعلیٰ مقرر ہو جانے کے بعد! ان کی راہ میں، آخری رکاوٹ خود اسکندر مرزا تھے جنھوں نے آئین کو معطل کر کے جنرل ایوب کا تقرر کیا تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد جنرل ایوب کو خبر ملی کہ اسکندر مرزا "کی بیوی ہر وقت ان سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے اور بار بار کہتی ہے کہ تم نے [ایوب] کو مارشل لا کا منتظم اعلیٰ مقرر کر کے سخت غلطی کی ہے۔ خیر وہ تو جو ہوا اب تمہیں چاہئے کہ ایوب خاں کو ختم کر دو۔ اسکندر مرزا نے انٹیلی جنس بیورو اور دوسرے ذرائع سے بعض اہم مقامات پر فوجوں کی ترتیب کا نقشہ معلوم کرنے کی کوشش کی . . ." (ص ۱۲۱)۔ ایوب خاں نے انھیں "تنبیہ کی۔ بچھئے یہ کھیل، اور چال بازی ختم کیجئے۔ ہوشیار رہئے، آپ آگ سے کھیل رہے ہیں . . ." (ص ۱۲۱)۔

"ادھر فوج کے مشیروں نے یہ رائے ظاہر کی کہ آئین منسوخ ہو چکا ہے، مارشل لا جاری ہو چکا ہے اور مارشل لا کا منتظم اعلیٰ مقرر ہو چکا ہے۔ اس لئے صدر کا عہدہ حرف فاضل ہو کر رہ گیا ہے۔ (ص ۱۲۳)۔ دوسری طرف" لوگوں میں یہ احساس بھی بڑھتا جا رہا تھا کہ جب تک سکندر مرزا موجود ہیں، یوں ہی جوڑ توڑ ہوتے رہیں گے اور کوئی تعمیری کام نہ ہو سکے گا۔" (ص ۱۲۴) خود اسکندر مرزا کو بھی صورت حال کی نزاکت کا اندازہ ہو گیا۔ اور انھوں نے آئندہ سے دست بردار ہونا منظور کر لیا۔" (ص ۱۲۵)

"مجھے یہ فیصلہ کر کے بڑا دکھ ہوا تھا" ایوب خاں لکھتے ہیں "اور میرا دل اسکندر مرزا کے لئے بھی کڑھتا تھا۔ کیسی بدقسمتی کی بات ہے کہ انھوں نے کسی کے ساتھ وفا نہیں کی۔" (ص ۱۲۶)۔

اس کے بعد پاکستان کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوا جو کم و بیش گزشتہ دس برسوں سے جاری ہے۔

خارجہ پالیسی

مندرجہ بالا عنوان کے تحت صدر ایوب نے کتاب کے ۱۱۹ صفحات میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کی وضاحت کی ہے۔ اس باب میں بھی ہر جگہ پاکستان کی ہندوستان دشمنی ہی چھائی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس کے ابتدائی حصے میں اپنی خارجہ پالیسی کے مبادیات بیان کرتے ہوئے انھوں نے اس امر کی وضاحت ضروری سمجھی کہ:۔

"ہماری مشکل یہ ہے کہ ہندوستان ہمارے وجود کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر خود کو آمادہ نہیں کر سکا . . . ہندوستانی لیڈر مسلمانوں سے گہری نفرت رکھتے ہیں . . . ہندوستان نے شروع ہی سے ہماری راہ میں مشکلیں پیدا

کرنے کی ٹھان رکھی تھی ...؟ (ص ۱۹۰)

یہ خیالی فرد جرم خاصی طویل ہے۔ اور اس احساس کمتری کی غمازی کرتی ہے جس کا پاکستان کی خارجہ پالیسی گزشتہ بیس برسوں سے شکار رہی ہے۔ ان حالات میں صدر ایوب کا اس نتیجے پر پہنچنا قطعاً حیرت ناک نہیں ہے کہ ہندستان کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس لئے ہمیں ہندستان کی کٹر دشمنی کو گوارا کرتے ہوئے جینے کا ڈھب نکالنا ہوگا۔ (۱۹۴) -

افغانستان

صدر ایوب نے دیباچے میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ "اپنے ہم سایوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں، بدقسمتی سے سوائے ہندستان کے" (ص د) لیکن خارجہ پالیسی کے باب میں انھوں نے افغانستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کی جو نوعیت بیان کی ہے، وہ ان کے دعوے کی تردید کرتی ہے، اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کم و بیش اتنے ہی خراب ہیں، جتنے ہندستان کے ہیں۔ اور ہندستان ہی کی طرح افغانستان کے ساتھ بھی پاکستان کے خوش گوار تعلقات قائم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میرا خیال ہے کہ ابھی ہمیں اسی صورت حال سے نباہ کرنا ہوگا" (ص ۲۹۲)

فرماتے ہیں:-

"جب ہندستان و پاکستان دو آزاد و خود مختار مملکتوں کی حیثیت سے وجود میں آئے تو بہت سے افغانوں کے دل میں دو غلط باتیں بیٹھی ہوئی تھیں پہلی بات جو لگاتار ہندستانی پروپیگنڈے کا نتیجہ تھی، یہ تھی کہ پاکستان ایک علیحدہ ریاست کی حیثیت سے زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکے گا۔ افغانستان کے حکمراں اسے سچ سمجھ بیٹھے اور انھوں نے پاکستان کے مسئلے سے پہلے پہلے اس کے ایک حصے پر اپنا حق جتانے کی ٹھان لی۔ چناں چہ انھوں نے ہمارے شمالی علاقوں کے کچھ حصے پر جہاں پٹھان یا پختون رہتے ہیں اپنا حق ملکیت جمانا شروع کردیا۔ اس طرح افغانستان کے حکمرانوں نے ہماری سرحدوں کے اندر پختونستان کی مفروضی ریاست کے تصور کو ایک سیاسی مسئلے کا رنگ دے دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ہم کبھی منظور نہ کرسکتے تھے۔" (ص ۲۸۸)

"دوسری غلط بات خود افغانی حکمرانوں کے اپنے طرز فکر کا نتیجہ تھی۔ اگر ان کا پہلا اندازہ غلط ثابت ہو اور پاکستان زندہ و سلامت رہے تو وہاں ضرور جمہوری حکومت قائم ہوگی جس سے قدرتی طور پر افغانستان کے حکمرانوں کی اپنی پوزیشن کو دھکا لگے گا۔" (ص ۲۸۹)



صدر ایوب کے دست راست۔ لیکن
- اب - سب سے بڑے حریف

"افغانستان نے ہماری آزادی کے روز اول ہی سے ہمارے ساتھ کھلے بندوں دشمنی کا رویہ اختیار کرلیا تو ہمیں بڑی مایوسی ہوئی تھی... بس وہ دن ہے اور آج کا دن افغانستان کے اخبارات اور افغانستان کے ریڈیو نے ہمارے خلاف الزام تراشی اور فتنہ انگیزی کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ ایک موقع پر کابل میں ہمارے سفارت خانہ کو ایک ہجوم نے تباہ کردیا، اور ہمارے آدمیوں کو افغانستان سے نکال باہر کیا گیا۔" (ص ۲۹۰)

"افغانستان کے طرز عمل کی صرف یہی تعبیر ہو سکتی ہے کہ یہ توسیع سلطنت کی ایک بالواسطہ کوشش ہے۔" (۲۹۱)

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اس صورت حال سے ابھی نباہ کرنا ہوگا۔" (ص ۲۹۲)

یہ ایک طرفہ بیان ہے۔ اس سلسلہ میں پاکستان کے خلاف افغانستان کی جو فرد جرم ہوگی، وہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ صدر ایوب کی مرتب کردہ فرد جرم کے خلاف افغانستان نے شدید احتجاج کیا تھا۔ بلکہ افغانی سفیر متعینہ پاکستان نے احتجاجاً اپنے عہدے سے استعفیٰ بھی دے دیا تھا۔ صدر ایوب کی کتاب کے بازار میں آنے کے بعد افغانستان میں شدید برہمی اور ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ میوندوال نے جو اس وقت افغانستان کے وزیر اعظم تھے جشن استقلال کے موقع پر پختونستان کے سلسلے میں افغانستان کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے پاکستانیوں کو سامراجیوں کی وراثت کا دعویدار قرار دیا تھا، کابل ٹائمز مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۶۷ء کے مطابق۔

"وزیر اعظم نے پختونستان کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے پختون بھائیوں کی مسلسل جدوجہد کو افغانستان کی حمایت بدستور حاصل ہے ... ہمارے اور پاکستان کے مابین پختونستان ہی کا بنیادی مسئلہ حایل ہے، اور دنیا کے اس حصے میں یہی مسئلہ حالات کی رفتار کو متاثر کرتا رہا ہے، اور یہ مطالبہ تاریخی، جغرافیائی، انسانی اور سیاسی حقائق پر مبنی ہے"۔ صدر ایوب کا نام لئے بغیر انھوں نے کہا کہ "پاکستان میں کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ پختونستان کا سوال صرف اس وجہ سے اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ بنیادی طور پر پاکستان کا وجود غیر فطری ہونے کی وجہ سے زیادہ دنوں چل نہ سکے گا یہی لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستان میں چوں کہ ترقی کے بہت مواقع ہیں، اس سے لوگوں کو اس سے حسد ہے، اور پختونستان کا مسئلہ پاکستان کی ترقی کی راہ میں دشواریاں پیدا کرنے ہی کے لئے اٹھایا گیا ہے اس طرز فکر میں منطقی تضاد اور دو رنگی ہے۔ اور پاکستان کے لوگ بھی اسے مصنوعی پروپگنڈے کا کرتب ہی سمجھتے ہیں....

"پاکستان کے بعض حلقے صرف خود غرضی کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ پختونستان کا مسئلہ پاکستان کے ساتھ پرخاش پر مبنی ہے۔ یہ لوگ حقیقتاً پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کو خوش اسلوبی سے نپٹانا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اس سے خود ان کی حیثیت کمزور اور متزلزل ہو جاتی ہے"۔

صدر ایوب نے افغانستان و پاکستان کے تعلقات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"دوسری غلط بات خود افغان حکمرانوں کے اپنے طرز فکر کا نتیجہ تھی۔ اگر... پاکستان زندہ و سلامت رہا تو وہاں ضرور جمہوری حکومت قائم ہوگی جس سے قدرتی طور پر افغانستان کے حکمرانوں کی اپنی پوزیشن کو دھکا لگے گا" (ص ۲۸۹)

"خیر سگالی و مفاہمت کی فضا پیدا کرنے میں وقت لگتا ہے...۔ شاہ افغانستان نے پچھلے چند برسوں میں حکومت کے نظام میں کسی حد تک ایسے افراد کو شامل کرنا شروع کر دیا ہے جو شاہی حلقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ اگر عام آدمیوں کو حکومت کے ذمہ داری کے کام سپرد کئے جاتے رہے تو افغانستان و پاکستان کے درمیان جو مصنوعی اختلافات ہیں وہ مٹ جائیں گے اور افغانوں کو ہم سے تعاون کرنے کے فواید کا احساس ہو جائے گا۔ افغانستان کو جمہوریت کے ابتدائی تجربات کرتے وقت ایک جبوری دور سے گزرنا پڑے گا۔ اور وہاں کے عوام کو اور ملکوں کے عوام کی طرح جمہوری طریق کار اور اس کی روح کو سمجھنا ہوگا۔ جوں جوں عوام کو ملکی انتظام میں دخل حاصل ہوگا میرے خیال میں اتنے ہی وہ حقائق امروز کو تسلیم کرنے پر مایل ہوں گے اور عظمت رفتہ کی یاد میں مبتلا نہ رہیں گے"۔ (ص ۲۹۲)

مندرجہ بالا اقتباس میں صدر ایوب نے پاکستان و افغانستان کے تعلقات کا جو تجزیہ کیا ہے، وہ پاکستان و ہندستان کے تعلقات پر بھی لفظ بہ لفظ صادق آتا ہے۔ ہندستان و پاکستان کی موجودہ آویزش اب یک سر نظریاتی ہے، جو حقیقتاً دو طرز حکومت کی کشمکش ہے۔ صدر ایوب کو اسی کا یقین ہے کہ ہندستان و پاکستان کے تعلقات اگر معمول پر آجاتے ہیں، اور دونوں ملکوں میں آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے اور ذہنی میل جول بڑھتا ہے، تو پاکستانی ذہن پر ان کی گرفت قطعاً کمزور پڑ جائے گی۔ مندرجہ بالا اقتباس میں افغانستان کی جگہ پر پاکستان، اور پاکستان کی جگہ پر ہندستان کے نام رکھ دیئے جائیں، تو اس عبارت کی شکل یہ ہوگی، جو موجودہ حالات پر حرف بہ حرف منطبق ہوتی ہے۔ پاکستانی حکمران طبقہ سمجھتا ہے کہ

"ہندستان زندہ سلامت رہا تو وہاں ضرور جمہوری حکومت بھی قایم رہے گی جس سے قدرتی طور پر پاکستان کے حکمرانوں کی اپنی پوزیشن کو دھکا لگے گا۔

"خیر سگالی و مفاہمت کی فضا پیدا کرنے میں وقت لگتا ہے... صدر پاکستان نے پچھلے چند برسوں میں حکومت کے نظام میں کسی حد تک ایسے افراد کو شامل کرنا شروع کر دیا ہے، جو فوجی حلقوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ اگر عام آدمیوں کو حکومت کے ذمہ داری کے کام سپرد کئے جاتے رہے تو پاکستان و ہندستان کے درمیان جو مصنوعی اختلافات ہیں وہ مٹ جائیں گے، اور پاکستانیوں کو ہم سے تعاون کرنے کے فوائد کا احساس ہو جائے گا، اور وہاں کے عوام کو اور ملکوں کے عوام کی طرح جمہوری طریق کار اور اس کی روح کو سمجھنا بھی ہوگا۔ جوں جوں عوام کو ملکی انتظام میں دخل حاصل ہوگا۔ اتنے ہی وہ حقایق امروز کو تسلیم کرنے پر مایل ہوں گے اور عظمت رفتہ کی یاد میں مبتلا نہ رہیں گے"۔

* * * * * * * * * * * *

کاروان دہلی کے آئندہ شمارے پابندیٔ وقت کے ساتھ ہر ماہ کی یکم - ۸ - ۱۶ - ۲۴ کو

منظر عام پر آیئں گے۔

* * * * * * * * * * * *

آپ کے محلے کے لئے ۲ دو اہم تجویزیں

اگر آپ ممبرِ محلہ ہیں۔ محلہ سدھار کمیٹی کے ممبر یا عہدہ دار ہیں۔ قوم کے رہنما ہیں، سوشل ورکر ہیں۔ غریبوں یا مسلمانوں کا درد دل میں رکھتے ہیں۔ تو میں آپ ہی کو مخاطب کر رہا ہوں۔

میں تقریباً ایک سال تک (بیچ ۱۹۶۵ء و ۱۹۶۶ء) اپنے محلہ کھڑکی تفضل حسین میں بحیثیت جنرل سکریٹری محلہ سدھار کمیٹی بھارت سیوک سماج نئی دہلی سے حاصل کیا ہوا ملک پاؤڈر اور اناج غریب لوگوں میں مفت تقسیم کرتا رہا ہوں۔ میرے محلے کے علاوہ دوسرے محلوں سے بھی غریب بیوائیں، مظلوم اور مفلس عورتیں اناج لینے آتی تھیں۔ جن کی بھوک اور فاقے کے حالات آپ سنیں تو آپ کا کھانا پینا حرام ہو جائے۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ تھوڑے سے اناج کے لئے بھیک مانگنے کی ذلت برداشت کرتی تھیں۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ایسی مفلس۔ لاچار۔ بے کس۔ بے سہارا غریب عورتیں اور مرد آپ کے محلے میں بھی موجود ہیں اور ہمارے محلہ میں موجود ہیں۔ اس کمر توڑ مہنگائی کے زمانہ میں کیا آپ کا اور ہم سب کا فرض نہیں ہے کہ کم سے کم اپنے محلے کے غریب اور مفلس لوگوں کو بھوک اور فاقے سے نجات دلائیں۔ کیا یہ بات آپ کو پسند ہے کہ آپ تو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوں اور آپ کے پڑوسی بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی زندگی کے دن پورے کریں۔

اگر آپ کے دل میں غریبوں کی مدد کا مقدس جذبہ موجود ہے تو آپ پہلی فرصت میں اپنے محلے کے غریب لوگوں کی ایک فہرست بنائیں۔ ان کی ضرورتیں معلوم کریں پھر اپنے محلے میں ایک غریب فنڈ قائم کریں۔ صاحب ثروت لوگوں سے ماہانہ چندہ وصول کر کے اس رقم سے غریب مرد یا عورتوں کی مدد کریں۔ یہ سب سے بڑا نیک کام ہے۔ اس خدمت سے آپ کا دونوں جہان میں بھلا ہوگا۔

دوسری خدمت یہ ہے کہ مسلمان عام طور سے جہالت کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ خدا اگر آپ کو توفیق دے تو اپنے محلے میں بالغوں کی تعلیم کا ایک مرکز کھول دیں۔ اور پڑھے لکھے لوگ گھنٹہ آدھا گھنٹہ بے پڑھے لوگوں کو اردو یا ہندی پڑھا دیا کریں اور انھیں اس قابل بنا دیں کہ وہ اخبار یا چھوٹی موٹی کتاب پڑھ لیا کریں اور اپنے رشتہ داروں یا دوستوں کو خود خط لکھا کریں۔

ان دونوں باتوں پر عمل کر کے آپ اپنے ملک اور ملت کی بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کے انجام دینے میں اگر کوئی دقت پیش آئے تو خود تشریف لا کر یا جوابی خط بھیجکر مجھ سے مشورہ کر سکتے ہیں۔

آپ کا خادم حکیم فیاض حسین جامعی

پریسیڈنٹ محلہ سدھار کمیٹی کھڑکی تفضل حسین دہلی

جناب فیاض حسین جامعی موجد تعلیمی تاش

جناب فیاض حسین جامعی نے جامعہ ملیہ علی گڑھ میں تعلیم پائی ہے۔ قومی خیالات رکھتے ہیں، سوشل ورکر ہیں اور اپنے محلے کی سدھار کمیٹی کے پریزیڈنٹ ہیں۔

۱۹۲۸ء میں جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جامعہ ملیہ کے شیخ تھے انھوں نے فیاض حسین جامعی کو جامعہ کے ایک اسکول واقع صدر بازار دہلی کا ہیڈ ماسٹر مقرر کیا۔ ڈاکٹر صاحب ان کے کام سے بہت خوش تھے۔ اسکول ایک زمانہ تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔

اپنی ہیڈ ماسٹری کے زمانہ میں فیاض حسین صاحب نے اردو ہندی۔ انگریزی وغیرہ مختلف زبانوں میں تعلیمی تاش ایجاد کئے۔ یہ تاش اپنی خوبیوں کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلبا اور تعلیم یافتہ عورتیں اور مرد سب ہی اس تاش سے کھیلتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں اس کے کھیلنے سے وقت ضائع نہیں ہوتا۔ بلکہ جس زبان میں کھیلا جاتا ہے اسی زبان کی قابلیت بڑھ جاتی ہے۔

فیاض حسین جامعی ۹ سال تک بچوں کا ایک ماہوار رسالہ "ہونہار" قرولباغ دہلی سے شائع کرتے رہے۔ یہ رسالہ طالب علموں کے لئے نہایت مفید رسالہ تھا۔ جو ہندوستان بھر کے محکمہائے تعلیمات میں منظور تھا۔ یہ رسالہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کی نذر ہو گیا۔

فیاض حسین جامعی کا تعلیمی کام مندرجہ ذیل ہے۔

ہندی میں:۔ آسان ہندی، ہندی کے تیس سبق، بیس دن میں ہندی۔ ہندی شکشا کارڈ۔ بچوں کا تاش۔ سفید منورنجن۔ ہندی کی نئی لغت۔ وغیرہ۔

اردو میں:۔ دیوان غالب کی شرح۔ اردو ٹیچر۔ ہم دن میں اردو۔ اور بچوں کی کئی کتابیں۔

انگریزی میں:۔ انگلش کیلی گرافی۔ ایجوکیشنل سپلنگ کارڈ۔

فیاض حسین جامعی کے ہندی کے کام کو دیکھ کر آل انڈیا سنسکرت پرچارک منڈل نے انھیں "دیوناگری بھوشن" کا خطاب دیا۔

ہمیں خوشی ہے کہ حکومت ہند نے بہ حیثیت ایک مصنف کے ان کی ۷۵ روپے ماہانہ پنشن مقرر کر دی ہے لیکن ایک تعلیمی موجد کی حیثیت سے یہ پنشن بہت ہی کم ہے۔ کم از کم یہ پنشن دو سو روپے ماہوار مقرر ہونی چاہئے تھی تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ تعلیمی خدمت انجام دیتے رہتے۔

نہ معلوم حکومت ایسے کام بھی رک رک کر اور تامل کے ساتھ کیوں کرتی ہے۔ فیاض حسین کے معاملہ میں فیاضی نہ کی جائے تو کم از کم انصاف تو کیا جائے۔



ہم کھیل کے میدان میں کہاں ہیں ؟ ۔
کون سی دوڑ میں ہم آگے ہیں ؟

—— اور جب عالمی سطح پر کھیل کی باتیں ہوتی ہیں، کھیلوں کے کارنامے دہرائے جاتے ہیں تو ہمارا ذکر بھی قابلِ ذکر انداز میں ہوتا ہے ؟ ۔

کیوں نہیں، کیوں نہیں !!! آپ یقیناً کہیں گے اور کچھ نہیں تو "ہاکی" لہرا کر اپنی بات منوانا چاہیں گے لیکن ذرا ٹھہر کر سوچ کر اور تمام باتوں کو سامنے رکھ کر جو بات چلے گی تو ہمیں کہتے ہی بن پڑے گا کہ "ہاکی" ہمارا چھنتا ہوا اعزاز ہے نہ ہمارے درمیان کوئی "دھیان چند" رہ گیا ہے اور نہ کوئی "روپ چند" پروان چڑھ رہا ہے۔ ہماری وہ مہارت، فنی ٹیک اور پر اعتماد کس بل جس سے ہم نے برلن سے روم تک ہر میدان اور ہر ملک میں جھنڈے لہرائے تھے اور اپنے پرستاروں کی آنکھیں خیرہ کی تھیں اب ماند ماند، کند کند، اور خستہ خستہ ہو چلی ہے روم کے میدان میں اس کی نشاندہی پاکستان نے کی تھی۔ اس وقت بہت ہی گھبرا کر ہم نے مناسب سا جواز تلاش کر لیا تھا کہ "ایک تھیلی کے دو دانے، کس کی ساخت کس سے بہتر بتایئے ؟ —— ایک ہی اکھاڑے کا دوسرا پہلوان جیت گیا تو کیا ہوا ؟ اور جب ٹوکیو میں "کھویا ہوا اعزاز" واپس ملا تو ہم نے چاروں طرف اس انداز سے نظر ڈالی "دیکھا تم نے !" لیکن یہ کافی نہیں تھا۔

—— ایماندارانہ بات تو یہ ہے کہ آج ہم وہاں نہیں ہیں جہاں بلا خوف و خطر اس میدان میں روزِ اول سے تھے " ہاکی " کے نہ ہم صرف میرِ کارواں تھے بلکہ عام مغربی ذہنوں میں جہاں ہندوستان کا تصور "ناچتی رسی" سے عبارت تھا وہاں "ہاکی کے جادوگر" کے تراشے سے مکمل ہوتا تھا لیکن آج مغرب میں برطانیہ مشرقی و مغربی جرمنی، کینیڈا اور ایشیا میں جاپان اور ادھر کینیا نے ہمیں اچھا خاصا ٹوکنا شروع کر دیا ہے۔

—— آخر ایسا کیوں ہوا ؟ —— کیوں ہو رہا ہے ؟ اس کٹار کو اٹھانے سے پہلے میری بات سمجھ لیجئے کہ نہ میں "شمع" کو سرد پھونک مار کر بجھانے کے در پے ہوں اور نہ "کرتوں" کو بند کرنے کے لئے سیاہ پردے تان رہا ہوں بلکہ مجھے اس کا احساس اور اعتراف ہے کہ "ہاکی نامہ" کا رستم ابھی اتنا ڈھیلا ڈھالا بھی نہیں ہوا ہے کہ ہر مقابل اس سے گھٹنے ٹکوا نے میری مراد تو صرف اتنی ہے کہ جہاں کہیں "سہراب" پل پل کر مقابلے کے لئے اٹھ رہے ہیں وہاں رستم کی گرفت میں وہ پہلی سی رد ابھی سختی نہیں رہ گئی ہے کہ مقابل کو جس پہلو چاہا اور جب چاہا دبا کر بے بس کر دیا۔ اور نہ قوت بازو کی وہ ضرب اور کاٹ باقی ہے کہ ہر ڈھال کو اشاروں ہی اشاروں میں "قاشیں" بنا کر رکھ دے !

—— یہ انحطاط اور تھکن لمحہ فکریہ کو جنم دینے کے لئے کیا کافی نہیں ہے کیوں اور کیسے —— اور اسباب کا بخیہ ٹانکنے سے پہلے یہ بہتر ہوگا کہ دوسرے کھیلوں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ کہ ہم کہاں ہیں ؟ —— اس کے بعد تمام کڑیاں جوڑ کر ایک ایسا حلقہ بن سکے گا جو پورا احاطہ کر سکے !

ویسے تو انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی چودھراہٹ کی مدت میں بہت سے ایسے شوشے چھوڑے جن کا بھگتان ہم آج بھی کر رہے ہیں اور شاید کرتے رہیں گے لیکن فٹ بال کی بات تو ایسی ہے جس کے لئے ان تاجروں کا شکریہ تو ادا کرنا ہی پڑے گا !۔

انگریز فوج کے نامی سرچھاؤنی میں یہ کھیل کھیلتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی —— ہم نے بھی فٹ بال کو پیروں پر اچھالنا اور ادھر ادھر پھینکنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم اس میدان میں ان نامیوں کو پیچھے چھوڑنے لگے۔ اور ہندوستان کے ہر قصبہ اور بستی میں فٹ بال ٹھوکروں میں آنے لگا۔ لیکن ہندوستان میں فٹ بال کی تاریخ میں روزِ اول سے جو پارٹ بنگال کا رہا، وہ کسی دوسرے علاقے سے ادا نہ ہو سکا۔ اس کھیل کی راجدھانی اگر کلکتہ کو کہہ دیا جائے تو بھی اختلاف نہ ہوگا —— لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس میدان میں جس آن بان اور للکار کے ساتھ داخل ہوئے تھے وہ برقرار کیوں نہ رہ سکی ؟ ۔

ہندوستانی فٹ بال کے عروج اور مقبولیت کی داستان بے حد تیکھی اور البیلی ہے۔ سنہ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۴۴ء کا درمیانی عرصہ "سنہرا دور" کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کلکتہ کی محمڈن اسپورٹنگ، موہن بگان کلب اور ایسٹ بنگال نے آئی اے ایف اور ڈیورنڈ ٹورنامنٹ میں نامی اور دوسری یورپین ٹیموں کی کمان اتار کر اپنے جھنڈے امتیازی شان سے لہرانا شروع کر دیئے تھے۔ اس دور میں کھلاڑیوں کو جتنی مقبولیت اور محبوبیت

حاصل ہوئی وہ آج کے بڑے سے بڑے اداکار یا کامیاب سے کامیاب اداکارہ کو بھی نصیب نہیں ہے۔ ملک کے ہر کونے اور قصبوں تک ریشمی رومالوں پر کھلاڑیوں کی چھپی تصویریں بے نکان بکا کرتی تھیں جن آنکھوں نے اس دور کے دیو پیکر کھلاڑیوں کو دیکھا ہے، آج بھی وہ کھیل کے میدان میں جہانگیر خاں کی جاندار ہک، تلاش کرتے ہیں جو ایک پول سے نیسر کو دوسرے پول کے سامنے جا کر ٹکتی تھی، یا حافظ رشید کی لہراتی، بچکتی، مچلتی پھسلتی اور پانی سے زیادہ سبک روانی کو یاد کرتی ہیں۔ اور جو حق و انصاف کی بات کیجئے تو آج ہمارے درمیان اس سانچے میں ڈھلا ایک بھی کھلاڑی نہیں ہے اور نہ ہی ہماری کسی ٹیم میں وہ توازن اور کامیابی کی لپک رہ گئی ہے جو اس وقت کا خاصہ تھا

آخر ایسا کیوں ہوا؟ —— ہم جو بڑی تیزی سے فٹ بال کو ٹھوکر پر رکھ کر لپکتے تھے، آج پیچھے جاتے کیوں نظر آتے ہیں؟ —

—— آپ کی نظریں آسٹریلیا کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ میرے کان بھی ادھر ہی ہیں۔ لیکن آنکھیں جھکی ہوئی ہیں:

آنکھیں کیوں نہ جھکیں؟ —— رنجی، دلیپ اور بڑے پٹوڈی نے جس میدان میں کرکٹ کے استادوں انگریزوں کو بھی پانی بھروا دیا تھا آج انہی کی مٹی کے پتلے آسٹریلیا میں اس طرح کے کرکٹ کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ بین الاقوامی حلقوں میں یہ سوال ابھرنے لگا ہے کہ آخر ہندوستان میں کرکٹ کا معیار اتنا پست ہو چکا ہے کہ اُن سے سرکاری ٹسٹ کھیلنے کے اعزاز کو کیوں نہ واپس لے لیا جائے؟

—— برطانیہ کے حالیہ دورے کے داغ کو آسٹریلیا میں دھونے اور کچھ کر دکھانے کی توقع اور عزم پاش پاش ہو چکا ہے:

ذرا پیچھے گھوم کر دیکھئے تو ہندوستانی کرکٹ میں بھی تاریخی کارناموں اور تاریخی شخصیتوں کی کمی نہیں نظر آئے گی! —— جارڈن کے ایسے خونخوار اور انتقامی کپتان جس نے آسٹریلیا کو لرزہ براندام کر رکھا تھا۔ شکست کے زہر کا پیالہ ہم ہی نے بنارس میں پلایا اگر انگلینڈ نے جیک ہابس کو پیدا کیا تو ہم نے رنجی، دلیپ اور بڑے پٹوڈی کے ترپ کے سامنے رکھے۔ اگر آسٹریلیا نے ڈان بریڈمین، ہیسٹ، لنڈوال، ملر، لوکین اور رچی بنو اور ویسٹ انڈیز نے فرینک وورل، ٹیری، راما دین اور بے شمار دیو پیکر میدان میں اتارے تو ہم نے سی کے نائیڈو، سی ایس نائیڈو، وزیر علی، امیر علی، نثار احمد، امر سنگھ، امرناتھ، وجے مرچنٹ، مشتاق علی، گل محمد، غلام احمد، ونو منکڈ، وجے ہزارے، مودی، سلیم درانی اور درجنوں دوسرے مقابلہ میں پیش کیے اور آج بھی ہمارے پاس عالمی معیار کے ایسے کھلاڑی موجود ہیں جو کسی بھی عالمی الیون میں بلا اختلاف رائے لے جا سکتے ہیں۔ نواب پٹوڈی کا پر سکون اور جری انداز، فاروق انجینئر کا طوفانی تیور، چندر شیکھر کی پر فریب

بولنگ اور سورتی کا استحکام ان کو عالمی الیون میں جگہ دلانے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بحیثیت مجموعی اور بصورت ٹیم ہمارے غیر ممالک کے دوروں کے نتائج حوصلہ شکن اور ناقابل ذکر ہوتے ہیں۔ یہ تو نہیں ہمیں کرکٹ کھیلنا نہیں آتا۔ یا "ٹیم اسپرٹ" کا فقدان ہے کیوں کہ گھریلو مقابلوں اور اپنے میدانوں میں غیر ممالک کی ٹیموں کے مقابلے میں جب ہم کھیلتے ہیں تو نمایاں طور سے جم کر کھیلتے ہیں۔ ہم نے اپنے گھر میں رہ کر رچی بنو کے ایسے ماہر آسٹریلوی کپتان اور اُن کی ٹیم کو شکست دی ہے، لیکن یہی قدم باہر نکلتے ہیں۔ تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ ہندوستانی کرکٹ ٹیم بے ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے کہ ایک مخالف جھونکا آیا اور تہہ ہو کر رہ گئی!

اسباب اور جواز؟

سُن لیجئے گا ابھی ذرا ٹھہریئے ایک نظر ٹینس، بیڈمنٹن اور دوسرے میدانوں کا بھی جائزہ لے لیجئے۔ ہماری ٹینس کی داستان غوث محمد سے عبارت ہے، اس میں دلیپ بوس اور سومنت مسرا کا بھی تذکرہ ہو سکتا ہے۔ اور آج بھی ہمارے درمیان کرشنن کے ایسا سبک اور تیکھا کھلاڑی ہے جس نے دُنیا کے صفِ اوّل کے تمام کھلاڑیوں کو کہیں نہ کہیں اور ایک وقت نہیں تو دوسرے وقت شکست فاش دی ہے۔ ہم ڈیوس کپ کے فائنل میں بھی دو دو ہاتھ کر چکے ہیں۔ اگر ویلڈن ٹرافی پر آج تک ہمارے کسی کھلاڑی کا نام نہیں لکھا جا سکا ہے تو بھی ٹینس کے معاملے میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے کچھ کیا ہے ہمارے کھلاڑیوں کا تذکرہ عالمی حلقوں میں بھی ہو ہی جاتا ہے بیڈمنٹن میں ہم نے نندو نیکر اور دِنیش کھنہ کے ایسے جی دار پیدا کیے، جنہوں نے کم سے کم ایشیائی برتری کا تاج ہمارے سروں پر رکھا یہ بات اپنے تکلیف دہ ضرور ہے، کہ بیڈمنٹن کے کھلاڑیوں کی عالمی درجہ بندی میں ہمارے کھلاڑیوں کا شمار آٹھویں اور نویں نمبر سے ہی ہوتا ہے۔ کھیل کود کے میدان میں ہم بہت پیچھے ہیں سو گز کی بات ہو یا میل دو میل کی دوری ہو —— مردوں کی جست خیزی ہو کہ عورتوں کی رسہ کشی ہو، عالمی معیار تو چھوڑیئے ہم ایشیائی مقابلوں میں بھی کہیں گنتی میں نہیں آتے ہیں۔ کشتی کے اکھاڑے میں ایک دو معمولی کامیابیاں کیا بھیم اور بھیشم کی جنم بھومی کے ویروں اور سورماؤں کی مونچھوں کو اونچا رکھنے کے لیے کافی ہو سکتی ہیں؟ —— شاید کیا بلکہ ہرگز نہیں۔

—— ہندوستان کی گود میں ارجن نے جنم لیا۔ تیر اندازی کے اس پیغمبر نے نشانے لگانے میں جو معجزے دکھائے، اب بھی وہ مہا بھارت کے پاٹھ میں زندہ ہیں اور رہیں گے۔ لیکن آج "عالمی تیر اندازی مقابلے" میں ہمارا کہیں شمار بھی نہیں —— بلکہ خود ملک کے اندر کہیں اس شغل کے رسیا نہیں ملتے۔ ہاں کبھی کبھی کوئی بھیل گونڈ ادیواسی سامنے پڑ جائے تو اس کے کاندھے پر کمان

اور ترکش اس کا پتہ دیتے ہیں کہ اس میں کبھی "ارجن" بھی ہوئے تھے !!

— اس میدان کا تذکرہ ایسا ہے جو جاری ہی رکھا جا سکتا ہے لیکن اب آیئے ذرا ہم اپنے انحطاط، تھکن اور ایک طرح کے "الٹے سفر" کے اسباب و جواز کا احاطہ کریں۔

— ہم نے ہر کھیل کے میدان اپنے بڑھتے پیروں پر خود کلہاڑی خود ہی ماری

— پہلا جرم تو یہ کہ ہم نے اپنے صحت مند شعور کو سیاست کا پھندا لگا کر اس طرح بے دم کر دیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے اور شغل میں سیاست دخیل ہو چکی ہے کھیل کے میدان میں بھی پہلے سیاست کے پینترے پھر گیند لڑھکانے کی عادت ہمیں پیہم پیچھے لڑھکا رہی ہے :

دوسرا جرم یہ ہے کہ

— کھیل کو دکی مرکزی اور ریاستی سطح پر نیم سرکاری سرپرستی نے کھیل کو ترقی دینے سے زیادہ کمیٹیوں وغیرہ میں عہدے حاصل کرنے کی الٹ پھیر کے کرتبوں کو زیادہ فروغ دیا ہے۔ اس سے اب نہ کوئی بحث رہ گئی ہے اور نہ سروکار کہ کھیل کے میدان میں کسی بھی ٹیم کا کیا بنے گا اب تو مطلب کی صرف اتنی گردان یاد رہ گئی ہے کہ کونسا عہدہ سنبھال کر غیر ملکوں کے دورے پر نکلا جا سکتا ہے۔

اور ستم تو یہ ہو گیا ہے کہ آج کے کھلاڑیوں میں کھیل کھیلنے سے زیادہ کھیل کی سیاست سمجھنے اور برتنے کی لپک پیدا ہو گئی ہے !!

کھیل میں سیاست؟

اس نکتہ کا سرا پکڑیئے گا تو پھر کو سلجھاتے سلجھاتے ایک دبیز دفتر تیار ہو جائے گا۔ اس کی نہ مہلت ہے نہ موقع ہے اس لئے سرسری طور پر بات کہنے دیجئے

یہ ایک کلیہ ہے کہ کھیل کے میدان میں ایک ہی مذہب ہوتا ہے ایک ہی عقیدہ ہوتا ہے اور ایک ہی برادری اور ملت ہوتی ہے۔ لیکن آج ہمارے کسی کھیل کے میدان میں یہ کلیہ جاں بلب دکھائی دے گا۔ مجھے بمبئی کا وہ ٹیسٹ پھر یاد آتا ہے جب پاکستان سے مقابلہ تھا۔

اور انگلینڈ میں اپنے بانکے کھیل کا جھنڈا گاڑنے والے عباس علی بیگ ہندوستانی ٹیم میں شریک تھے ایک میلے ذہن نے یہ فتنہ اٹھایا کہ عباس علی بیگ پاکستان کو چھوٹ دینے کے لئے جان بوجھ کر آوٹ ہوں گے۔ یہ بات جدا ہے کہ عباس علی بیگ کے رواں دواں کھیل نے اس میلے ذہن کے پرخچے اڑا دیئے اور دوسری بات یاد آئی کہ مدتوں بعد بھوپال سے ایک ستارہ ابھرا۔ علیگڑھ کے یونی ورسٹی میدان میں اس کے کھیل میں سیماب اور آہن کی آمیزش ہوئی اور ہاکی کے اُفق پر انعام الرحمان ایک طوفان بنکر چھایا۔ لیکن برا ہو سیاست کا کہ اُسے نظرانداز کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی گئی۔ اور جب بھی مجبور ہو کر اس کو قومی ٹیم میں لیا گیا تو اُسے کم سے کم کھیلانے اور صرف کمزور ٹیموں کے مقابلوں میں آزمانے کے کرتب کیے گئے۔ کرکٹ کا شاہی کھیل بھی فتنہ ساز سیاست کی بھینٹ چڑھے بغیر نہ رہ سکا۔ مشتاق علی نے جس تلخی اور بد دلی کے ساتھ اپنے بلے کو خیرباد کہا وہ یاد ہی ہوگا حتیٰ کہ وہ مشتاق علی جس کے سیمابی اور برقی کھیل نے "ووزڈن" کے ایسے جوہری سے داد لی۔ ہندی کرکٹ کے ان داتاؤں کے جانبدارانہ سلوک سے برگشتہ کر ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو گیا۔ اور سلیم درانی آج بھی ایک زندہ سوالیہ نشان ہے؟ —

— اس عالمی معیار کے فنکار کو ایک سرے سے نظرانداز کرنے کی داستان کو دہرانے کی ضرورت ہے؟

— تعصب کا یہ زہر اس ٹیم کے انتخاب کے وقت بھی چھلکا تھا۔ جو برطانوی طلباء سے کرکٹ ٹسٹ یہاں کھیلنے اور بعد میں برطانیہ کا دورہ کرنے کے لئے منتخب ہوئی تھی۔ مشتاق علی کے لڑکے گلریز نے علاقائی ٹیم میں کھیلتے ہوئے سیمابی سنچری بنائی اور بولنگ کے بھی جوہر دکھائے لیکن —!

فٹ بال کے میدان میں بھی یہی حال ہے۔ محمڈن اسپورٹنگ صرف اس لئے تماشائیوں کی جانبدارانہ اکثریت کی بددعائیں کماتی ہے کہ اس پر ایک فرقہ کی چھاپ ہے چلئے مان لیا کہ اس کا یہ جرم بہت ہے کہ نام ایسا ہے جس سے اکثریت کی تیوریوں پر بل آنے لگا ہے۔ مگر اس ستم کو کیا کہئے گا اور اس سے کیا کہا جا سکتا ہے کہ جن ٹیموں میں اکثریت بھی ایسے کھلاڑیوں کی ہوتی ہے جن کے نام ناگوار ہوتے ہیں تو وہ ہر ہی سطح پر معتوب ہو جاتی ہے۔ دلی کے سٹی کلب کی مثال ایسی ہے جسے جھٹلانا بہت مشکل ہے !! -

— بات اگر یہیں تک ختم ہو جائے تو بھی صبر آجائے اور شاید کھیل بھی اتنا نہ بگڑے مگر علاقائی، صوبائی اور ذاتی بغض و عناد، غیظ و تعصب، جانبداری اور پاسداری نے کھیل کے ہر میدان کو زہریلے کانٹوں سے بھر دیا ہے !!!

نتیجہ یہ ہے کہ —

کھیل کے کسی میدان میں باربط، موثر اور متوازن ٹیم اسپرٹ نہیں نظر آتی ہے یوں ہر کھیل کے میدان میں ہمارے پاس بلبیر سنگھ، جرنیل سنگھ، چنی گوسوامی، یوسف خاں، مصطفےٰ، نواب پٹوڈی، سورتی، بے سیہا، مہاراجہ کرن سنگھ، اور دوسرے اَن گنت عالمی شہرت کے مالک کھلاڑی موجود ہیں لیکن ؟— مگر پہ کی وال چناسچہ کی چٹنی چکھتے رہئے اور دل بہلایئے !!!

— اس چناں چہ چنیں کی گردان میں اسباب کے شمار کو بڑھانے کے لئے بہت سی باتیں اور بھی کی جا سکتی ہیں اور یہ ناروا بھی نہ ہوں گی !!!

ہمیں ان باریک نکتوں پر بھی بھیجہ کھپانا چاہئے کہ

(۱) کھیل کے مراکز شہروں میں مذکور ہونے کے بجائے دیہی رقبے میں کیوں نہیں بنائے جاتے ؟ —

(۲) کھیل کے وسائل پھیلنے [illegible] ہیں؟

صالحہ عابد حسین

سلطان زین العابدین

سلطان زین العابدین ہندوستان کے ان دنے گنے بادشاہوں میں سے ہے جس کا نام تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ آج سے ٹھیک ساڑھے چھ سو برس پہلے وہ کشمیر کی راج گدی پر بیٹھا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان بہت سی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور کشمیر آنے جانے کی مشکلوں کی وجہ سے یوں بھی ہندوستان سے الگ تھلگ سا تھا، اس لئے عام طور پر ادھر کے لوگ اس عظیم شخصیت سے بہت کم واقف ہیں۔ لیکن کشمیر میں وہ کسی ولی یا اوتار کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ کشیری اُسے پیار سے بڈشاہ کے نام سے یاد کرتے اور بے حد احترام کرتے ہیں۔

سلطان زین العابدین نے ۱۴۲۰ء میں کشمیر کی باگ ڈور سنبھالی اور ۱۴۷۰ء یعنی پورے پچاس سال تک حکومت کی۔ یہ کشمیری تاریخ کا سچ مچ زرّیں عہد تھا۔ اس کے طویل عہدِ حکومت میں انصاف، رواداری، بے تعصبی، علم دوستی، حب الوطنی، اور برادران وطن سے گہری محبت کی ایسی روایتیں قائم ہوئیں جن پر ملک فخر کرسکتا ہے۔ اور جو ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائیں گی۔

اس کے باپ سلطان سکندر کے زمانے میں بہت سے پنڈت وغیرہ اُس کے ظلم و سختی سے تنگ آکر کشمیر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یوں بھی ریاست کی حالت اچھی نہ تھی۔ سلطان زین العابدین نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جو لوگ کشمیر سے چلے گئے تھے، انہیں بلا کر پھر سے آباد کیا اور اُن سے خلوص و محبت کا ایسا برتاؤ کیا کہ وہ اُس کے گرویدہ ہوگئے اُس نے پنڈتوں اور ہندو و دوالوں کو اپنے دربار میں خا[illegible] دیا، بڑے بڑے عہدے دئیے۔ وہ علم کا شیدائی اور عالموں کا سرپرست تھا۔ اسی کے عہد میں نہ صرف سارے ہندوستان سے بلکہ دُور دُور کے ملکوں، شیراز، ہرات وغیرہ سے بھی عالم آکر اُس کے دربار میں جمع ہوگئے تھے، ہندو، مسلمان، بُدھ، ہر مذہب کے عالموں کا وہ قدردان تھا۔ اور اُن کے علم و کمال سے خود بھی فیض حاصل کرتا تھا۔ اور دوسروں کو بھی فیض پہنچاتا تھا۔ اُس نے جونا راج اور شری ور سے جو سلطان کے خاص دوست تھے سنسکرت میں کشمیر کی تاریخ لکھوائی۔ ایک اور درباری بودھ بھٹ جو ویدوں کا بہت بڑا عالم اور فارسی اور سنسکرت کا ماہر تھا۔ کشمیری زبان میں ایک منظوم ڈراما "جینہ پرکاش" تصنیف کیا تھا جین سے مطلب ہے زین یعنی زین العابدین اس میں اس نے سلطان کے زمانے میں کشمیر میں جو ترقی اور کام ہوئے اُن کو بیان کیا تھا۔ ایک اور شاعر بھٹ اوتار نے "جین ولاس" کے نام سے سلطان کے اقوال (کہاوتوں) کو نظم کیا تھا۔ اسی کے ایک اور درباری ملا احمد سنسکرت اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ سلطان نے ان سے مہابھارت اور راج ترنگنی کا فارسی میں ترجمہ کرایا تھا۔ وہ صرف عالموں اور ادیبوں کا سرپرست ہی نہ تھا۔ بلکہ خود بھی بہت بڑا عالم اور علم کا شیدائی تھا۔ کشمیری تو اس کی مادری زبان تھی اس کے علاوہ وہ سنسکرت، فارسی اور تبتی زبان کا بھی ماہر تھا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ اور مصنف بھی۔ کئی کتابیں اُس نے لکھی ہیں۔ پنڈتوں سے شاستر پڑھوا کر سنتا اور اس کا مطلب سمجھتا تھا۔ کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ہندوستان، ایران، عراق اور ترکستان دُور دُور تک اپنے آدمیوں کو بھیجتا اور وہاں سے ہر علم و فن کی کتابیں منگا کر جمع کرتا اور بہت سی نایاب قلمی کتابیں جن میں سنسکرت کی بھی مشہور اور انمول کتابیں تھیں۔ اس کی اعلیٰ درجہ کی لائبریری میں موجود تھیں۔

یہی نہیں اُس نے جگہ جگہ مدرسے بھی کھلوائے تاکہ عام لوگوں تک بھی علم کی روشنی پہنچے۔ نوشہرہ میں جو مدرسہ تھا اُس میں خود جاکر شریک ہوتا۔ اس کے علاوہ کئی اور مدرسے ملک کے مختلف حصوں میں کھولے جن میں بڑے بڑے عالم فاضل درس دیتے تھے۔

وہ بڑا مذہبی اور عالم ہوتے ہوئے بھی فنون لطیفہ کا قدردان تھا موسیقی کے فن سے خاص لگاؤ تھا۔ سکندر نے اپنے زمانے میں موسیقی کی بھی ممانعت کی تھی۔ مگر زین العابدین نے پھر سے موسیقی کو رواج دیا، اس کی قدر دانی کی، دُور دُور سے مشہور سنگیت کار بلائے اور اُن کو انعام اکرام سے نوازا۔ اس کا درباری بودھ بھٹ جیسے بڑا سنگیت کار تھا، اس نے اس فن پر ایک کتاب بھی لکھی ہے اس کے علاوہ خراساں سے بھی اس نے ماہر موسیقی دانوں کو بلایا تھا۔ اور اُس نے بہت سی عمارتیں بھی بنوائیں۔ سری نگر کے قریب "نوشہرہ" کے نام سے اُس نے اپنا دارالسلطنت بنایا تھا جس میں اپنے درباریوں، افسروں، عالموں فنکاروں کے رہنے کے لئے بڑے بڑے عمدہ مکانات بنوائے تھے۔ مدرسے تھے، محل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عظیم الشان بارہ منزل کا بے حد حسین

اور نرالامحل اُس نے بنوایا جو سارے کا سارا لکڑی سے بنایا گیا تھا اور جس کا گنبد سنہری اور اندر کی دیواریں شیشے کی تھیں اُس کے علاوہ اور بھی کئی شہر زین کوٹ، زین گیر وغیرہ بسائے اور خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔ مگر زمانے کے ہاتھوں ان میں سے اب کچھ بھی باقی نہیں رہا صرف سلطان زین العابدین اور اُن کی والدہ کے مقبرے کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہے۔

دست کاری اور صنعت و حرفت کو بھی اُس نے بہت ترقی دی۔ اگرچہ قدیم ہندو راجاؤں کے زمانے میں کشمیری دست کاری نے ترقی کی تھی۔ مگر ڈیڑھ دو سو سال بیں حاکموں کی بے پروائی سے قریب قریب سب فن برباد ہو چکے تھے۔ سلطان نے اُس کی طرف خاص توجہ کی، دست کاروں اور ماہرین کی ہمت افزائی کی، اُن کے لئے وسائل فراہم کئے۔ سمرقند سے ایک ماہر کو بلوا کر کاغذ سازی اور جلد سازی کے فن کشمیریوں کو سکھوائے۔ عراق، خراسان اور ترکستان سے دست کاری کے ماہروں کو بلواتا اور جب تک وہ کشمیریوں کو اپنا فن نہ سکھا دیتے انہیں ملک سے باہر نہ جانے دیتا تھا۔ اعلیٰ درجہ کا ریشمی کپڑا تیار کرنا، باریک اور خوبصورت کشیدہ کاری اور شال بافی کی صنعت نے اُس کے دور میں رواج پایا، اور پوری دُنیا میں شہرت پائی اُس کے زمانے میں کشمیری دست کاریاں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں اور یہ کہا جانے تو غلط نہ ہوگا کہ آج جس کشمیری دست کاری کی ساری دُنیا میں دھوم ہے، یہ اسی محسن وطن سلطان کی وجہ سے ہے۔

اُس نے پچاس برس کشمیر پر حکومت کی اور اپنی رعایا کی بھلائی کے اس نصف صدی میں اتنے کام کیے جن کی گنتی کرنا بھی آسان نہیں۔ خلیفہ ہارون رشید کی طرح وہ راتوں کو بھیس بدل کر شہروں میں گھومتا اور اپنی رعایا کی صحیح حالت کا اندازہ لگاتا، اُن کی تکلیفیں دُور کرتا، اُن کی شکایتیں رفع کرتا تھا۔ ظلم کرنے والے اور رشوت لینے والے اہلکاران کو عبرت ناک سزائیں دیتا تھا۔ انصاف کرنے کے معاملے میں نوشیرواں کا اُسے جانشین کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اپنے ایک عزیز مصاحب کو اُس نے موت کی سزا دی تھی، اس جرم میں کہ اس نے غصہ میں اپنی بیوی کو مار ڈالا تھا۔ وہ جو قانون اور فرمان جاری کرتا اُن کو اشوک اعظم کی طرح پتیل کی تختیوں پر کندہ کرکے گاؤں اور شہروں میں جڑوا دیتا۔ ان تختیوں پر چیزوں کی قیمتیں تک لکھی ہوتی تھیں تاکہ دکان دار چور بازاری نہ کریں اور مہنگائی نہ بڑھنے پائے کھیتی باڑی کو بھی اُس نے بہت فروغ دیا۔ نہریں کھدوائیں، درخت لگوائے اور ذرائع آمدورفت بہتر کیے۔

لیکن اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی رعایا کو دل وجان سے چاہتا اور ان سے چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان یکساں برتاؤ کرتا تھا۔ ہر مذہب والے کو اپنے اپنے ڈھنگ پر پوجاپاٹ اور عبادت کرنے کی پوری آزادی تھی اُس نے پنڈتوں اور برہمنوں کو معافیاں دیں۔ مندروں کے لئے جائیدادیں وقف کیں۔ یاتریوں کے لئے سرائیں بنوائیں۔ سب تہواروں میں چاہے وہ مسلمانوں کے ہوں، ہندوؤں کے ہوں یا بینیوں کے وہ خود شریک ہوتا اور حصہ لیتا تھا۔ ملازمتوں، عہدوں، معافیوں کسی چیز کے دینے میں اُس کے ہاں مذہبی تفریق نہ تھی۔ بودھ مذہب کا ایک عالم تلک آچاریہ اُس کا خاص مشیر تھا۔ جوتشی برہمن اس کے درباری تھے۔

غرض سلطان زین العابدین نے ساڑھے چھ سو برس پہلے کشمیر میں رواداری، انصاف، محبت اور یک جہتی کی ایک نظیر قائم کی۔ جو اُس کا نام ہمیشہ باقی رکھے گی۔ سوا سو برس بعد اکبر اعظم نے جو کام سارے ہندوستان کے لئے کیا، سلطان زین العابدین نے چھوٹے پیمانے پر ہی مگر اُس سے کم نہیں ایک لحاظ سے اس سے بڑا کام کشمیر کی ریاست میں انجام دیا۔ یہی وجہ تو ہے کہ آج تک کشمیری عوام اُس کا نام احترام سے لیتے ہیں۔ آج بھی بڈشاہ کے گیت گائے جاتے ہیں۔ کشتی والے کشتی کھیتے وقت بڈشاہ کا نام لیتے ہیں، مزدور بوجھ اٹھاتے وقت بڈشاہ کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ہر مذہب، ہر عقیدے کا ماننے والا اپنے اس بادشاہ کا دل سے احترام کرتا ہے۔

وہ نہیں مرتے کبھی جیتے ہیں جن کی نیکیاں

(۳) پرائمری اور ثانوی اسکولی سطح پر ابھرتے کھلاڑیوں کی تلاش اور ان کی دیکھ ریکھ کیوں نہیں کی جاتی؟

(۴) نگران، انتخابی، تنظیمی اور تمام پیوندی کمیٹیوں میں اپنے جانے پہچانے کھلاڑی کیوں نہیں لیے جاتے؟ ——

(۵) کھلاڑیوں کی کاشت اور نئی فصل کے لیے کھیل کے میدان ہر کونے اور ہر قصبہ میں کیوں نہیں بنائے جا رہے ہیں؟

(۶) ہر کھیل کے سازو سامان اور مواقع اتنے مہنگے کیوں ہو رہے ہیں کہ متوسط اور مزدور طبقے کے بچوں کے لئے یہ حسرت و آرزو ہی بن کر رہ گئے ہیں؟

(۷) ہر کھیل کو مقبول کرنے کے لئے دیہی ٹورنامنٹ اور ان میں اس میدان کے شہرہ آفاق کھلاڑی اور نامور ہستیوں کو حصہ لینے پر کیوں نہیں اکسایا جاتا؟

(۸) کھلاڑیوں کو صرف دلبستگی کا کھلونا کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اُن کے روزگار اور معاش کے لئے فراخدلی سے وسائل اور گنجائش کیوں نہیں تراشی جاتی۔

(۹) کھیل کا میدان — کھیل کا میدان ہے یہ کیوں سمجھا نہیں جاتا۔



پریمی رامپوری

غزل

نہ آئینہ سے نہ آئینہ گر سے ملتی ہے
جواب وناب کسی دیدہ ور سے ملتی ہے

بدل گیا ہے کچھ اس درجہ نظمِ میخانہ
یہاں شراب بھی ذاتی اثر سے ملتی ہے

اگر سرور ہے محدود زجام و مینا تک
وہ چیز کیا ہے جو تیری نظر سے ملتی ہے

مری جبیں کو ہے جس ایک در سے نسبتِ خاص
مری مراد اُسی ایک در سے ملتی ہے

مری طرح انہیں خود بھی ہے اسکا اندازہ
پتہ کی بات کہاں نامہ بر سے ملتی ہے

ادھر سے بھی کوئی مستِ خرام گذرا ہے
یہ کہکشاں تو کسی رہگذر سے ملتی ہے

سمجھ سے کام لے، عزم و عمل کے دیوانے
ہمیشہ روشنی فکر و نظر سے ملتی ہے

گلوں کے شبنمی دامن کو دیکھنے کیا ہو
یہ کیفیت تو مری چشم تر سے ملتی ہے



ایک سانیٹ

بایں شعور طلافت یہ خامشی کیسی
کہو زبانِ قلم سے کہو یہ اہل قلم
کہ ترجمانِ زبوں حامیٔ عوام ہیں ہم
کہو کہ جنگ نہیں امن چاہتے ہیں عوام
انہیں قبول نہیں یہ نظامِ خوں آشام
کہو عوام کا گھائل شعور ہے بیدار
نہیں نہیں انہیں درکار جنگ کے ہتھیار
عوام کی ہے رفاقت تو خامشی کیسی
اگر قلم میں ہے طاقت تو خامشی کیسی
قلم قلم ہے قلم کا نہیں کوئی مذہب
قلم نویدِ سحر ہے نہیں بیاستِ شب
اگر ہے دل میں صداقت تو خامشی کیسی
بُجھا سکے گا صداقت کا شعلۂ روشن
نہ فکرِ محبس و زنداں نہ خوفِ دار و رسن

بقیہ

قاہرہ کی ایک شام



"ہاں میں نے وعدہ کیا، اور تھوڑی دیر پہلے تک مصمم ارادہ بھی تھا۔"

"تو اب کیا بات ہوگئی؟"

"میرا نہ آنا ہی مناسب ہے۔" سکندرہ اور عادل کی باتیں دہرانے کے بعد میں نے کہا

"مجھے بھی عادل نے اور بعض دوسرے لوگوں نے بھی اسی قسم کی باتیں کی ہیں لیکن میں نے ان کا کوئی اثر نہیں لیا۔ بہرحال آپ کو آنا ہے۔ اور میں آپ کا انتظار کروں گی" اور اس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

پانچ بجے قیوم کے یہاں پہنچا تو دونوں میاں بیوی تیار بیٹھے تھے۔

"آپ تو خالی ہاتھ چلے آ رہے ہیں" سکندرہ نے دیکھتے ہی سوال کیا "کوئی تحفہ نہیں لیا آپ نے؟"

"اس کا انتخاب میں نے تم پر اٹھا رکھا ہے" میں نے جواب دیا "چلتے ہوئے ابھی لے لیں گے"

راستے میں ایک بڑی سی دوکان پر ٹیکسی روک کر سفید موتیوں کا ایک ہار میں نے خریدا۔ منزلِ مقصود پر پہنچا تو میزبان سفید سلک میں ملبوس مہمانوں کے استقبال کیلئے دروازے پر چشم براہ تھیں۔ بڑی گرم جوشی سے ہم سب کو انھوں نے خوش آمدید کہا۔ اپنی والدہ سے تعارف کرایا۔

"سالگرہ کا تحفہ" ہار کا پیکٹ جولیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔

"بہت شکریہ آپ کا" کہتے ہوئے جولیہ نے ہار کو ڈبے سے نکالا۔ اور بچوں کی طرح کھیلتے ہوئے کہا "کتنا خوب صورت ہے یہ۔ اسے آپ ہی میرے گلے میں ڈال دیجئے۔ اور آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ آج میں سفید اسکرٹ پہنوں گی۔"

"آپ کی خوش مذاقی سے، غیر شعوری طور پر مجھے یہی توقع تھی" ہار پہناتے ہوئے میں نے کہا "اور ہمارے یہاں ایک مثل ہے کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔"

"آپ اگر آج نہ آتے تو مجھے صرف تکلیف ہی نہیں بلکہ بڑی مایوسی ہوتی"۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ عادل بھی آ گئے۔ سالگرہ کی مبارکباد دیتے ہوئے انھوں نے جولیہ کے لباس کی سادگی کے ساتھ ساتھ اسکرٹ اور ہار کی ہم آہنگی کی خصوصیت سے تعریف کی۔

"اسکرٹ میرا انتخاب" جولیہ نے جواب دیا۔ پھر میری طرف اشارہ کیا۔ "ہار ان کا انتخاب اور سالگرہ کا تحفہ ہے۔"

"تو تم دونوں ہم مذاق بھی ہو" عادل نے معنی خیز نظروں سے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کے لئے بھی میں دونوں کو مبارک دیتا ہوں"

"مبارکباد کا شکریہ، میری اور ان کی دونوں کی طرف سے"، جولیہ نے سنجیدگی سے جواب دیا، "دوستی کی ایک ضروری شرط ہم مذاقی بھی ہے"۔ جولیہ نے جس تیور سے یہ جواب دیا تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

فاش می گویم واز گفتۂ خود دل شادم
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم

مہمانوں کی تعداد خاصی تھی۔ ترکی، بلکہ عالم اسلام کی روایات کے مطابق کھانے اور پینے کے اہتمام میں نفاست اور فراخ دلی سے کام لیا گیا تھا۔ کھانے ترکی تھے جو ذائقہ کے اعتبار سے ہندوستانی مذاق سے قریب تر تھے کباب اور دلما خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جو بے حد خوش ذائقہ تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے کی صحبت کے دوران ہم دونوں کئی بار ایک دوسرے کے قریب آئے اور تھوڑے وقفے کے لئے ایک دوسرے میں گم ہوتے رہے

"شاید سب ہی ہندوستانی دل پھینک ہوتے ہیں" ایک خاتون نے جن کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہوگی — مجھے تنہا پاکر آکر آہستہ سے کہا۔

"ہندوستانیوں کا شاید آپ کو خاصا تجربہ ہے" ان کے جملے سے لطف لیتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

"آپ کو جولیہ کے ساتھ دیکھ کر مجھے اپنے ہندوستانی دوست یاد آ گئے" خاتون نے اس حسرت کے ساتھ کہا جیسے اپنی بیتی ہوئی جوانی کی بھولی بسری یادوں کو تازہ کر کے عمر رفتہ کو آواز دے

رہا ہوں" میری طالب علمی کے زمانے میں بہت سے ہندوستانی بھی یورپ میں تھے۔ اور ان میں سے اکثر میری قریبی دوست تھے۔

"آپ مصری ہیں؟"

"نہیں جولیہ کی طرح میں بھی ترک ہوں"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر" میں نے جواب دیا "جو بات آپ نے ہندستانیوں کے بارے میں کہی ہے۔ وہ شاید ترکوں پر بھی صادق آتی ہے"

"آپ کے اس خیال میں صداقت کا شائبہ ضرور ہے" خاتون نے اعتراف کرتے ہوئے سوال کیا "ہندوستان میں آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"لکھنؤ کے قریب کا"

"تو شاید میرے دوست سجاد ظہیر سے بھی آپ واقف ہوں گے، جنھیں ہم سب بنّے کہتے تھے"

"ہاں اتفاقاً وہ میرے بھی دوست ہیں اور آج بھی بنّے ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں"

"اب بھی تو وہ کمیونسٹ ہیں؟"

"اب تو وہ کمیونسٹ لیڈر ہیں۔"

"ہمارے ایک اور دوست تھے، نواب زادہ امتیاز علی خاں، ان سے بھی آپ واقف ہیں؟"

"نہیں" میں نے دماغ پر زور دینے کے بعد جواب دیا۔

"وہ نواب کرنال کے بیٹے ہیں"

"میں انہیں نہیں جانتا"

"اچھا شوکت اللہ انصاری سے آپ واقف ہیں"

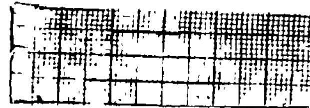
"ہاں ان سے واقف ہوں" میں نے جواب دیا۔ "اب تو وہ آل انڈیا لیڈر ہیں"

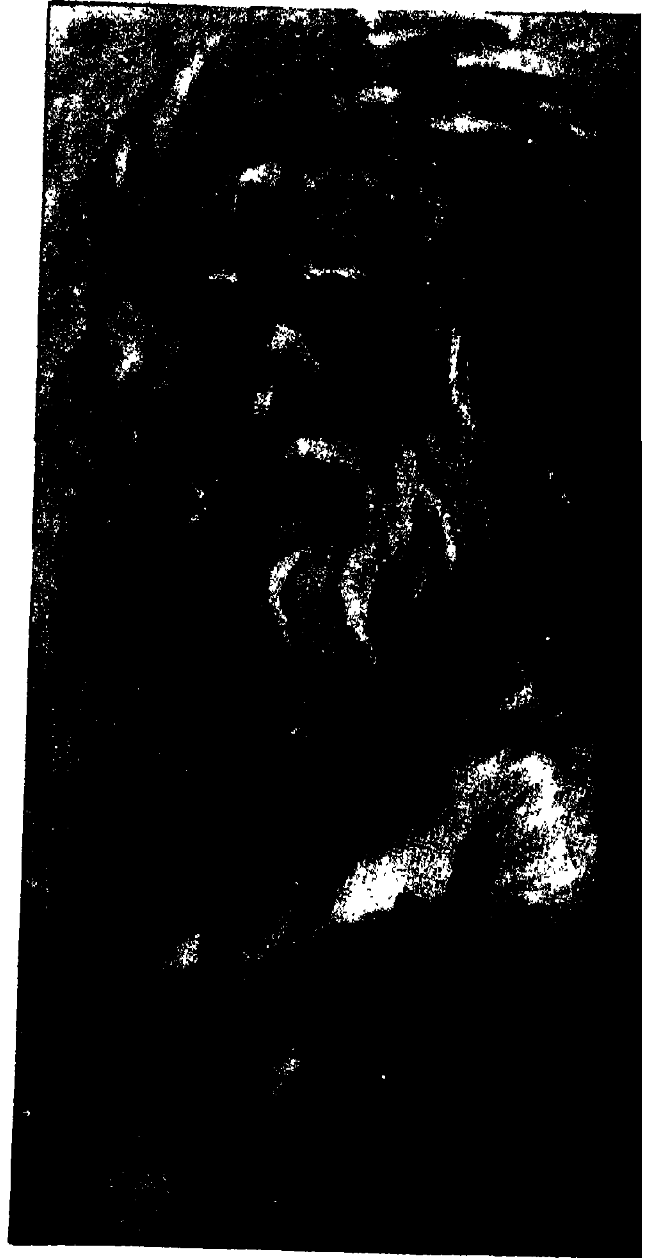
"بنّے، امتیاز اور شوکت بڑے گہرے دوست تھے"

"اور آپ کی دوستی ان میں سب سے زیادہ تھی؟"

"شوکت سے" خاتون نے جواب دیا

یہ ترک خاتون دیر تک اپنے ہندستانی دوستوں کی باتیں مزے لے لے کر کرتی رہیں۔ اور جب ہم سب رخصت ہوئے تو میرے حلقۂ احباب میں ایک دوست کا خوشگوار اضافہ ہو چکا تھا۔





پٹھان —
سرحد کا ایک —
— حرّیت پسند
— باشندہ —

KARWAN – E – WATAN DELHI.
ANNUAL AND REPUBLIC NUMBER 1968.
R. N. No. 7452/63 REGD. No. D1699.



روضہ شیرشاہ سہسرام

—— تعمیراتِ عالم میں بے مثال گنبد ——

